مُستنصر حُسین تارڑ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

''فیری میڈو اور نلتر پکھورا ٹریک''

پہلا سفر

"ہوشے سے درّہ گندوگورو کے بیس کیمپ تک اور لیلیٰ پیک"

دوسرا سفر

پہلا سفر

”مرغانِ چمن کا سرسری تعارف اور کچھ نئے پرندے“

یہ سفر اس لائق تو نہیں کہ اسے لکھا جائے۔۔
دراصل کے ٹو کہانی، نانگا پربت، پاک سرائے اور سنولیک کے بعد کوئی بھی سفر۔۔ پہاڑوں کا سفر اس لائق نہیں لگتا کہ اُسے لکھا جائے۔۔
لیکن اس سفر کے کچھ کردار ایسے ہیں جنہیں لکھا جانا چاہیے۔۔
یہ کردار ایسے ہیں کہ اگر انہیں میں نے نہ لکھا تو یہ بد روحیں بن کر میرے خوابوں میں آئیں گے۔ رات کو غسل خانے کی بتی جلانے سے پہلے وہاں موجود ہوں گے اور ”ہم آ گئے ہم آ گئے“ کے قہقہوں سے میری روح فنا کر دیں گے۔۔ پریشان کریں گے۔۔ مجھے ڈرائیں گے۔۔
تو میں ان کرداروں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔
میں ہرگز نہیں چاہتا کہ یہ میرے خوابوں میں آئیں۔۔ رات کو میرے غسل خانے میں آ دھمکیں اور میری زندگی اجیرن کر دیں۔
صرف اس لیے میں اس سفر کو بھی لکھنا چاہتا ہوں، اگرچہ یہ اس لائق نہیں کہ اسے لکھا جائے۔۔
چونکہ اس سفری داستان میں چمن اتنا اہم نہیں جتنے کہ اس میں چہکنے والے پنچھی، پرند اور پکھیرو۔۔۔ اس لیے مناسب رہے گا اگر ان طیور۔۔ ان مرغانِ چمن کا سرسری تعارف کروا دیا جائے۔ جیسا کہ ڈرامہ نگار سکرپٹ کے آغاز میں مرکزی کرداروں کی خصلتیں اور عادتیں مختصرا بیان کر دیتا ہے تا کہ پروڈیوسر کو ذہنی طور پر آسانی ہو کہ کون اداکار کس رول کے لیے موزوں رہے گا۔۔
ان میں کچھ قدیمی پنچھی ہیں جو متعدد کوہ نوردیوں میں میرا ساتھ دے چکے ہیں اور

میرے پڑھنے والے اُن سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں.. اور کچھ پرندے نئے نویلے ہیں جو پہلی بار چمن میں چہکے ہیں۔

پرانے اور کہنہ مشق پنچھیوں میں میاں فرزند علی ہیں جو پرندے کو پڑندہ اور گھڑے کو گھڑا کہتے ہیں۔ اندرون بھاٹی گیٹ کے قدیمی مکین ہیں اس لیے اُنھیں باہر کی ہوا نہیں لگی۔ چنانچہ ان کی لاہوری وضع داری اور یاروں پر قربان ہونے کی خصلت نہیں بدلی.. اسی لیے دنیاداری کے ناپ تول کے ماہر نہیں۔ نہ پتھروں اور نہ چنے والیوں کو پرکھنا جانتے ہیں.. انہی کے بارے میں اولڈ ونڈ کا دورہ گھرا گیا تھا.. معاف کیجیے گا گھرا گیا تھا..

دو نمبر پر کھیر و شاہ صاحب ہیں جو ناپ تول کے شدید ماہر ہیں۔ ہمیشہ نہیں چکرانے کے چکر میں رہتے ہیں لیکن ہم جیسے کئیوں کا کوئی کوچتی نہیں دے سکتے.. ہم لیڈر ہوں نہ ہوں ان کی ڈپٹی لیڈری پکی ہے اور یہ اعزاز انہوں نے بقلم خود اپنے آپ کو عطا کر رکھا ہے.. پورٹروں اور ہوٹل والوں سے مذاکرات کے ماہر ہیں اور ایسے تواتر سے اور تیکھے بولتے چلے جاتے ہیں کہ پورٹروں اور ہوٹل والوں کو غصہ آنے لگتی ہے اور وہ ایک ہو کے ہیں ہماری شراکت دار بن جاتے ہیں.. اکثر جہاں مجھے بات کرنی ہوتی ہے وہ مجھے دھکیل کر آگے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں "میں ڈپٹی لیڈر ہوں مجھ سے بات کریں، لیڈر کا مقام تو بہت بلند ہے اور بلندی پر زیادہ دیر قیام کرنے کے باعث انہیں زکام ہے، گلا بیٹھا ہوا ہے بات نہیں کر سکتے.. یوں بھی عمر رسیدہ ہیں اور تھوڑے سے بوکھلائے ہوئے ہیں.." مہم کے اخراجات کا حساب کتاب ہمیشہ اُن کے ذمے ہوتا ہے اور وہ یہ حساب کرتے ہوئے ہر وقت اپنے جاسوسی ہیٹ پر ہاتھ پھیرتے رہتے ہیں کہ اس کے نیچے جو سر ہے اُس پر شاید اب کچھ بال اُگ آئے ہوں، سیاہ چشمہ اتارتے چڑھاتے اخراجات کی ٹوٹ پر تادیر غور کرتے ہیں اور آخر کسی مدّ کی مہر کو یہ کہہ کر نامنظور کر لیتے ہیں کہ چوہدری صاحب آپ نے فلاں کھانے کے دوران ایک کی بجائے دو بوتلیں پی تھیں، براہ مہربانی فالتو بوتل کے پیسے فوراً ادا کر دیجیے... بجٹ خراب ہو رہا ہے..

پھر ایک نازک اندام حسن والے شخص حسن صاحب ہیں.. اپنی بیوی کے تذکرے پر فوراً کھل جاتے ہیں جب کہ ہم لوگ فوراً مرجھا جاتے ہیں.. ایک بار کرنل محمد خان نے میری حوصلہ افزائی کی خاطر.. جیسے ایک بچے کی حوصلہ افزائی کی خاطر اُسے کہہ دیا جائے کہ جب تو بڑا ہو گا تو یقیناً راج ہنس بن جائے گا ایسے کرنل ڈیئر نے لکھا کہ وہ شہر، وہ گاؤں کس کام کے جہاں کم از کم ایک

مستنصر حسین تارڑ نہ ہو... ویراں شود آں شہر کہ میخانہ ندارد.. تو میں حسن صاحب کی حوصلہ افزائی کی خاطر نہیں بلکہ تہہ دل سے اُن کی طبیعت کی سادگی اور رومانی خصلت سے متاثر ہو کر یہ کہوں گا کہ وہ وادی وہ دریا، وہ سفر کس کام کے جن میں کم از کم ایک حسن ہمراہ نہ ہو... ویراں شود آں شہر کہ یک حسن ندارد..

اس سفر میں پرنس سلیم بھی ہمارے ساتھ تھا.. یہ سچ مچ کا پرنس نہیں تھا محض نام کا فائدہ اٹھا رہا تھا.. جیسے ہمارے کوچ کی کپتان کا شہسوار چوہدری محمود اپنے نام کی وجہ سے دنیا بھر کے مقبروں کو اپنی رہائش سمجھتا تھا.. منہ شکل سے ایسا ولن لگتا ہے جو ہیرو کی صورتوں میں رنگ میں بھنگ ڈال دیتا ہے.. اگرچہ اس نے میرے ساتھ جانے کا ارادہ تو کے ٹو بانی کے زمانے میں باندھا تھا لیکن پھر چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس نے یہ بندھا ہوا ارادہ کھول دیا، اور اب اتنے برسوں بعد جب اس نے پھر سے یہ ارادہ باندھا تو ہم نے خصوصی بندوبست کیا اور اُسکے بندھے ہوئے ارادے کی گانٹھ دوستی کے پلی سے کھینچ کر ایسا پکا پیڑا کر دیا کہ وہ چاہے بھی تو اسے کھول نہ سکے.. یہ طریقہ پرانے زمانے میں دولہن کے ازار بند کی گانٹھ پر آزمایا جاتا تھا.. پرنس سلیم نے نہایت بکھری ہوئی وجاہت نوعیت کی مونچھیں پالی ہوئی ہیں اور جب مسکراتا ہے تو اپنے ناہموار دانتوں کے باعث بکری کا بچہ معلوم ہوتا ہے.. لیکن پرنس چارمنگ ایسا ہے کہ کسی بھی نوجوان کو مٹنے پر اُسے کبھی نہیں سمجھاتا کہ ان کا خیال رکھنا بلکہ اپنا فون نمبر تھما دیتا ہے کہ کر لینا.. لاہوریوں کی خاص حس مزاح کا حامل ہے اور اس کے اکثر لطیفے ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر حاملہ ہونے کا گمان ہوتا ہے..

آپ چار تحفہ ملتان شتی، گرد و گرما، گدا و گورستان سے تو واقف ہوں گے.. پہلے تو صرف گدا ہوا کرتا تھا جو ہمارا قدیمی ساتھی تھا لیکن اس بار اس کے ساتھ گرد بھی چلا آیا.. اسے ہم گرد آمیز بھی کہہ سکتے ہیں.. گرد آمیز کا تعلق ملتان کی ایک قدیم اور باوقار گرد آمیز فیملی سے ہے.. باتوں میں ملتان کے رسیلے آموں جیسی مٹھاس رکھتا ہے۔ آپ اس مٹھاس سے اتنے تنگ آ جاتے ہیں حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ تہذیب بے مثال لگاتے ہیں اور یقیناً جب وہ اپنے آم کے باغوں میں یہ حرکت کرتا ہو گا تو درختوں پر بیٹھے معصوم طوطے غش کھا کر گر جاتے ہوں گے.. شاید ان میں سے ایک آدھ جاں بحق بھی ہو جاتا ہو.. فوٹو گرافی میں یہ طولیٰ رکھتا ہے۔ گھر کے اندر ایک سٹوڈیو بنا رکھا ہے جس میں کل جہان سے درآمد کردہ آلات تصویر کشی، پس منظر کے منقش پردہ جات، روشنی جات اور چھتریاں وغیرہ پائے جاتے ہیں.. بیش قیمت کیمرہ جات کا مالک ہے اور ان کے ساتھ وہی

سلوک کرتا ہے جو مالک غلاموں کے ساتھ کرتے ہیں.. جب اپنے تھیلے میں سے کیمرہ برآمد کر کے اس کے آگے ایک لمبا سا زوم لینز فٹ کرتا ہے تو کیمرہ فی الفور خوش ہو جاتا ہے بلکہ ایک چھوٹے موٹے ایٹمی ہتھیار کا روپ اختیار کر لیتا ہے.. ایک ملتان یاترا کے دوران عمران نے اس سے ملاقات کروائی اور اس نے نہایت خوش اسلوبی سے ایک پرتکلف کھانا کھلا کر اس خواہش کا اظہار کیا کہ سائیں انہیں ساتھ لے چلیں.. گردصحت سے اور شکل سے نازو نعم میں پلا ہوا.. کچھ زیادہ پلا ہوا ایسا بچہ لگتا تھا جس نے عمر بھر گھر سے باہر قدم نہ رکھا ہو.. چنانچہ میں نے پوچھا کہ سائیں کیوں ساتھ لے جاؤں تو بولا.. سائیں ہم تیری میڈ دو شوٹ کریں گے.. اور واقعی انہوں نے تیز میڈ کو ایسا شوٹ کیا کہ وہ ابھی تک اپنے زخم چاٹتا ہے..

ان پانچ تحائف کے سوا تین ایسے تحفے بھی ہمارے ہمراہ تھے کہ ہم بے شک اس رب کا شکر ادا کر سکتے تھے جس نے ہماری گائے بنائی تھی لیکن انہیں بنانے پر ہم اس کا شکر ادا کرنے میں قدرے جھجکتے تھے.. کہ یہ بنائے ہیں!!..

تحفہ نمبر ایک.. عمران باہر.. تقریباً دو برس پیشتر کسی حوالے سے میری سٹڈی میں وارد ہوا.. نیکر پہنے اور اسے ہمہ وقت تھامے ہوئے کہ اس کے نیچے کچھ بے بسی رکھی ہیں.. عینک چڑھے اور داڑھی چھپے تھے وہ ہمہ وقت شدید جرابوں کے عذاب میں گھرا جاتا ہوا تھا.. میری سٹڈی میں آیا "سر جی میں کالج کے زمانے سے آپ کے سفرنامے پڑھتا آیا ہوں.. برباد ہو چکا ہوں.. ذرا دیکھئے.." اس نے میرے متعدد شمالی سفرنامے تاش کے پتوں کی طرح میرے سامنے پھینک دیئے.. ہر کتاب کے تقریباً ہر صفحے پر نوٹس تھے، سرخ پنسل کے نشان تھے۔ یہ میری آپ سے کمٹمنٹ کے ثبوت ہیں کہ ایک دن میں ان سفرناموں پر بھی ڈاکومنٹریاں بناؤں گا.. میں دس برس سے تیاری کر رہا ہوں.. آپ اس بار مجھے بھی اپنی ٹیم میں شامل کر لیں.. یقین کیجئے اس میں اتنا مالی فائدہ ہو گا کہ آپ بیادب وغیرہ بھول جائیں گے اور اس مختصر سے گھر سے نجات حاصل کر کے کم از کم چار پانچ ایکڑ کا ایک فارم ہاؤس بنا کر اس میں منتقل ہو جائیں گے.. یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تب آپ کے پاس ایک لینڈ کروزر بھی ہوگی اور گیٹ کے باہر، جس گیٹ کو ابھی آپ نے اپنا ازار بند اڑستے ہوئے کھولا تھا وہ نہیں بلکہ فارم ہاؤس کے گیٹ کے باہر مسلح گارڈز بھی ہوں گے.."

میری تو باچھیں کھل گئیں۔ میری نا آسودہ اور ناممکن خواہشوں کی تکمیل کرنے والا شخص آج میرے سامنے موجود تھا۔ میں کب سے ادب اور ٹیلی ویژن کو تیاگ کر ایک پانچ ایکڑ کے فارم

ہاؤس میں مسلح گارڈز کی رفاقت میں زندگی بسر کرنا چاہتا تھا.. اور یہ فرشتہ مجھے یہ سب کچھ آفر کر رہا تھا۔ اگرچہ میں فوری طور پر "قبول ہے، قبول ہے" کے نعرے لگانا چاہتا تھا لیکن پھر میں نے اپنے امیج اور ادبی شہرت کو فوری طور پر دستبردار کرنے سے گریز کیا اور اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے نہایت لاپرواہی سے کہا "مسٹر عمران باہر.. میں آپ کی آفر پر غور کر سکتا ہوں.. بہرحال میں یہ تو جانتا ہوں کہ میں شمال کا ایک سیلف میڈ ایکسپرٹ ہوں لیکن میں آپ کو، آپ کی صلاحیتوں کو نہیں جانتا چنانچہ کچھ ثابت کیجئے.."

عمران اپنی نیکر کو تھامتا چلا گیا.. اگلے روز وہ مجھے ایک ایسی ویڈیو کیسٹ دے گیا جس میں اس کے کچھ "پروجیکٹ" تھے.. ٹیلی ویژن پر چلنے والے اشتہار، میوزک ویڈیوز، فلمیں، ایک ڈاکومنٹری.. جو اس کی کیمرہ کرافٹ اور ہدایت کاری سے وجود میں آئے تھے، میں نے اس کیسٹ کو ملاحظہ کیا تو ان کی تصویر کشی اور روایت سے مکمل سرکشی کی تخلیقی صلاحیت سے اتنا متاثر.. اور پھر فوری طور پر شرمندہ ہوا کہ میں نے ایسے باکمال اور ودیعت شخص کا امتحان لیا.. اس کی صلاحیتوں پر شک کیا.. چنانچہ جب وہ... یعنی عمران باہر دو تین روز بعد ایک کھسیانی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اور نیکر تھامے.. داڑھی کھجاتے میرے پاس آیا تو اب میں اس کا مداح ہو چکا تھا اور اس سے درخواست کر رہا تھا کہ عمران پلیز میرے ساتھ چلو.. میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ پاکستانی شمال میں جو جادو ہے وہ پوری دنیا کے سر چڑھ کر بولے.. اس میں جو طلسم ہے وہ کیمرے کی آنکھ قید کرے.. اور ایسے کرے جیسے میں اسے دیکھتا ہوں.. نہ کہ ٹورسٹ یا ٹورسٹ اپیئر یا ٹورازم کا گائیڈ نہیں کہ بیان کے لیے کاروبار ہے.. ملازمتیں ہیں.. جیسے میں اس حیرت کدے کو دیکھتا ہوں ویسے کیمرہ دیکھے اور دنیا کو دکھائے.. اور تم ہی وہ شخص ہو اگرچہ نیکر پہنتے ہو.. جو یہ کام کر سکتا ہے..

چنانچہ عمران نے مجھے مائل پا کر بقول اس کے ایک زر کثیر خرچ کر کے صرف اس مہم کی خاطر ہانگ کانگ اور امریکہ سے خصوصی آلات تصویر کشی امپورٹ کئے.. ایسے.. جیپ اور انجن درآمد کئے جو بلند پہاڑوں میں کارآمد ہو سکتے تھے اور یوں میرا ساتھی بن گیا.. میں اس کی داڑھی اور نیکر میں پانچ ایکڑ کا ایک فارم ہاؤس اور چند مسلح گارڈز دیکھتا تھا..

جیسے شمر تنہا نہ تھا ایسے عمران بھی تنہا نہ تھا.. اس کے ہمراہ دو طفل بچے تھے جو اپنی قدامت کے باعث اس کی بغل میں نہ آ سکتے تھے اور پھر بھی بغل بچے تھے۔ یہ دونوں بچے اسے گرو مانتے تھے اس کی اطاعت کرتے تھے.. مرشد جانتے تھے اور ہر لمحہ اس کے حکم کے منتظر رہتے تھے۔

"بشام، برسین، بامیان اور ورائے کوٹ پُل"

ابھی کل کی بات ہے جب ہم لاہور سے چلے تھے.. سیتا اور رام کے بیٹے لو کے شہر لاہور سے چلے تھے..

رات حسب خصلت بشام میں کی تھی..

عمران نے اپنی ڈاکومنٹری کا آغاز بشام سے کیا تھا.. کیمرے کو مجھ پر آن پہلی بار کیا تھا۔

بشام ہوٹل کی بلندی سے مجھے نیچے سندھ کی مٹی چوڑی گزرگاہوں تک لے گیا تھا..

مجھے ایک پتھر پر بٹھا کر شیر دریا کو تکتے ہوئے گفتگو کی تھی" تارڑ صاحب جب آپ سندھ کے پانیوں کے سحر میں مبتلا انہیں دیکھتے چلے جاتے ہیں اور آپ کو اپنے پرانے سفر یاد آتے چلے جاتے ہیں.. آپ سے ملنا کیوں نہیں.. ہمارے سندھ میں گزشتہ زندگی کی تصویریں دکھتی ہیں.. جیسے یہ ایک البم ہو جس کے ورق خود بخود الٹتے چلے جا رہے ہوں"

سندھ کی چادر میں گزشتہ زندگی کے دھاگے بنے ہوئے تھے.. ان دھاگوں سے تصویریں بنتی تھیں..

ان میں شاہ گوریاں بھی چلی جاتی تھیں..

کرومبر جھیل کے پانی یوں شامل ہوتے تھے کہ سندھ میں سے ان کے ملاپ سے ایک مہک اٹھتی تھی کہ میرے تن بدن ورثتی اور مشک آور کرتی تھی..

سنو لیک کی تتلیاں بھی چلی جاتی تھیں..

نیری میڈو کی برفوں میں سے اٹھنے والا سٹرابیری کا پہلا سفید رنگت پھول تیرتا جاتا تھا۔

برگی لا کے سفید ابھار سندھ کے ستواں پیٹ کے اوپر ابھرتے تھے.....

روزوت گلیشیر کے لب کھلتے تھے.. اس کے خدوخال گہرے ہوتے دکھائی دیتے تھے..

یہ کیا تھا اس سندھ ماہی کی گزرگاہوں میں دکھائی دیتا تھا.. لیکن میں چپ تھا.. مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں نے بولنا نہیں.. محض خواب دیکھنے ہیں، ان کا اظہار نہیں کرنا.. شیر دریا کی موجوں کو تکتے اپنے پچھلے سفروں کو یاد کرنا ہے.. آنکھوں سے اور چہرے سے.. اور میں نے ایسا ہی کیا..

اگر رات حسب خصلت بشام میں ہوئی تو اگلی سویر ہم نے ناشتہ حسب عادت شاہراہ ریشم سے بلند ہو کر کہیں میں پاگل ہوتے.. پاگلوں کی مانند سے جھاگ تو لیتے.. ابر بشین پر معلق برسین کے ہوٹل میں کیا.. اور اس ہوٹل کی ویران ور تنہا بلندی نے ایک مرتبہ پھر مجھے اداسی اور کسک سے دوچار کیا.. اس کے کسی ایک کمرے میں کبھی نہ کبھی میری اداسی اور کسک اختتام کو پہنچ سکتی تھی.. کسی عشق خاص کی موجودگی میں فیصلہ ہو سکتا تھا کہ یہ سب دوری کی نارسائی ہے یا قربت کا ملن ہو اور اسے ملیامیٹ کر سکتا ہے.. عجیب نام تھا برسین.. ہوا کے چوروں کا مسکن ہے.. اور یہ ایک شہر کا نام بھی ہو سکتا ہے.. برزین..

بشام سے چلے ہیں تو داسو میں جا رکے ہیں مرغیاں پکڑنے کے لیے..

داسو کے پل پر جھنڈے بھی خوش نظر اور عہد رسول کے چینی شیروں کے معصوم مجسمے تھے ان میں سے بیشتر بت شکنوں کے جذبہ ایمانی کے نتیجے میں ٹوٹ چکے ہیں.. ان کے دھڑ باقی ہیں اور چہرے ایمان کی قربان گاہ پر نچھاور ہو چکے ہیں۔

یہ گویا ایک ٹریلر تھا..

ایک قل تھنچ فلم کا جو ایک برس بعد پوری دنیا کو دکھائی جانی تھی..

ہزاروں برسوں سے موجود.. دنیا کے سب سے بلند.. ایک عظیم چٹان میں سے تراشے ہوئے بامیان کے بدھ مجسمے.. جنہیں بت شکن محمود غزنوی نے بھی متروک ہو چکے عقیدے اور فدا کے طور پر ہاتھ نہیں لگایا تھا ان پر برادران طالبان نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر.. راکٹوں، اینٹی ایئر کرافٹ گنوں اور بارود کے ذخیروں سے حملہ کر دیا.. بے شک افغانستان کی نصف آبادی بھوک سے مر رہی تھی.. بچے سردی سے ٹھٹھر کر منجمد ہوتے تھے، خواتین اپنے بدن ایک روٹی کے لیے فروخت کرتی تھیں اور لاکھوں افغان، تمہ خارجی جانب سے فراہم کردہ خوراک کے حصول کے لیے بلند ہے تھے.. لیکن برادران طالبان پتھروں سے جنگ کرتے تھے..

اس جنگ کا آغاز شاید داسو برج کے شیروں کو توڑنے سے ہوا تھا..

اور پھر آخر اوقات عمران اپنی تند شرمندگی سے کچلا سا لگتا۔ "سوری تارڑ صاحب.. میری غلطی ہے.. میں آؤٹ آف فوکس ہو گیا تھا.. آپ کو زحمت تو ہوئی لیکن ذرا پھر سے نیچے اتر جائیں اور دوبارہ اسی راستے پر چڑھتے ہوئے اوپر آ جائیں۔"

میں واقعی اس روز بد دکو سکتا تھا جب میں نے اس ڈاکومنٹری میں، حماقت کی حامی بھری تھی.. بوجھل قدموں سے گرتا پڑتا پھر نیچے چلا جاتا کبھی تین منٹ نیچے جاتا ہوں اور کبھی تین منٹ اور پھر کبھی باؤلی. تند سر جھکا کر پہاڑ پر چڑھنے لگتا.. اس روز بھی کم از کم تین بار میں تقریباً فنتوری تک پہنچا.. پھر تقریباً آدھ تک پہنچا اور پھر چڑھا..

جہاں جہاں میری ٹانگوں میں جتنی بھی مچھلیاں تھیں وہ پھڑک پھڑک کر ساکت ہو گئیں..

جتنی رگیں تھیں وہ پھٹنے کو آ گئیں..

اور جتنے پٹھے تھے وہ چڑھ گئے اور اکڑ کے رہ گئے..

اور مجھ میں ارادے اور ہمت کے جو چند ایک بلب ابھی تک ٹمٹماتے تھے وہ سب فیوز ہو گئے۔

لیکن خود کو دو... صرف ہمت تھی جس نے جانا ہو گا کہ یہ پتا نہیں پایا تھا..

لیکن ایک بات نے مجھے بے حد حیران کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ عمران ادھر کا ہی اور طاہر نیشنل کالج آف آرٹس کے ڈیکور کے فارغ ہیں.. اگرچہ آرٹ گرافکس ہیں.. لیکن قدرے نسوانی ہیں، تھوڑے ابھی ابن بہت جری ہیں اور یہ پورا وقت اونگھنے میں یا اپنی انگلیوں سے تصویریں بنانے میں گزاریں گے.. لیکن جب ان دونوں نے اپنے آلات تصویر کشی بمعہ سنبھالے تو ان کی پھرتی، ہمت اور خستگی نے مجھے حیران کر ڈالا.. وہ پورے دن متحرک اور بے چین ہو گئے..

میں تو ان کے لیے ایک انسان نہ تھا بلکہ کسی جنگلی حیات کے پارک میں کسی شیر سے جان بچاتا ہوا ایک جانور تھا جسے وہ فلما رہے تھے.. اسے فلم بند کر رہے تھے.. بالآخر فنتوری کا خلاصی کا دروازہ آ گیا..

اس چوبی گیٹ پر میں نے اختیاری طور پر اپنا ہاتھ رکھا تھا اور اسے ایک ان جانی بہشت میں داخل ہونے کے لیے دھکیلا تھا.. آج وہاں پہلے میری بیٹی عینی نے اسے دھکیلا تھا اور مجھ سے یہاں تک پہنچتے پہنچتے بے دم ہو کر اس کے ساتھ ٹیک لگا کر ستانے لگی تھی..

مجھے اس پھاٹک میں سے بھی متعدد بار گزارا گیا.. واپس لایا گیا.. پھر سے گزارا گیا..

شوٹنگ کے مراحل طے ہو گئے تو ہم اس پھاٹک کے پار ہو گئے..

پار فنتوری تھی..

فنتوری ایک فینٹسی..

لیکن پار ہوئے تو وہ کچھ بھی نہ تھا..

فینٹسی تھی.. نہ

فنتوری تھی..

میں جو اس کی آتش دید میں جل کر چلا آیا تھا.. بھک سے بجھ گیا..

وہ کچھ بھی نہ تھا..

فنتوری ایک اجڑا ہوا باغ تھا..

دھول اڑتی تھی.. بکھرے اور چٹخے خاموش پڑے تھے.. خشک پڑے تھے اور ان کی ٹہنیوں اور گزرگاہوں سے دھول اٹھتی تھی.. مرے پھولوں کی ٹہنیاں ویران اور بیوہ ہو چکی تھیں.. ان کی تازگی اور رنگینی ایک قصہ پارینہ تھی..

کوئی ایک.. صرف ایک ہی.. کوئی پھول نہ تھا..

خوشبو کا ایک جھونکا نہ تھا..

سیاہ گلابوں کی جھاڑیاں پژمردہ اور کسی ایک بھی پھول سے ناآشنا.. اور سامنے بھی.. کچھ نہ تھا نانگا پربت کی برفوں کے انباروں کا ایک سفید ذرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا.. وہاں گھنے بادل تھے

وہ جنت کیسی جس میں نہریں نہ بہتی ہوں.. وہ باغ ارم کیا جس میں کوئی پھول نہ ہو اور وہ فنتوری کیا جس کے اوپر نانگا پربت کی برفیں حکمران نہ ہوں..

میں نہ صرف بجھ گیا بلکہ بے حد خجل اور شرمندہ بھی ہوا اور مجھے یقین محکم تھا کہ اس سیاہ ویرانی اجڑے ہوئے منظر کو دیکھ کر عمران اور اس کے دونوں بغل بچے مجھے مشترکہ طور پر زد و کوب کرنے لگیں گے کہ سر جی اپنے سفرناموں میں اتنی دروغ گوئی کرتے ہو.. یہ ہے کہ آپ کی فنتوری ایک فینٹسی.. ایسی ہوتی ہے فنتوری..

لیکن ہوا یوں کہ ایک عجیب ناقابل یقین واقعہ ظہور پذیر ہوا.. یعنی جونہی ہم پھاٹک پار کر کے فنتوری کے اس اجڑے ہوئے میں داخل ہوئے تو اسے اپنے سامنے پا کر عمران

اوپر کہیں.. فیری میڈو کی بلند ترین ڈھلوان پر.. ننگا پربت کے سو چہروں کے سامنے..

اگرچہ پہلی مرتبہ وہیں منزل تھی میں نے اپنا خیمہ نصب کیا تھا.. اب مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں وہاں جا کر اپنا خیمہ لگاتا..

اس لیے میں بھی کہیں نہ ٹھہرا.. آرام طلب آسائش پسند ہر سیاح کی مانند رحمت نبی کی کیمپنگ سائٹ میں ہی ٹھہرا..

رائے کوٹ گلیشیئر کے عین اوپر.. ننگا پربت کا سامنا کرتے ہوئے جو گھاس کا میدان تھا وہاں خیموں کے طرح طرح کے رنگ تھے.. خوش رنگ پرندے جیسے بیٹھے تھے.. ایک جانب ڈھلوان کی اوٹ میں ایک فیری میڈو سے حاصل کردہ مردہ لکڑی سے تعمیر شدہ ایک دیدہ زیب ڈائننگ ہال تھا اور خیمہ گاہ پر جھانکتی ڈھلوان پر دو تین خوش نظر کیبن تھے..

ان میں ایک کیبن ابھی تک ان چھوا تھا..

اس میں ابھی تک کسی نے قیام نہیں کیا تھا..

اس لیے کہ رحمت نبی نے وہ کیبن میرے لیے سنبھال رکھا تھا کہ تارڑ آئے گا تو وہ اس میں پہلا شخص ہوگا جو رات گزارے گا اور تب اس کیبن کی پیشانی پر "تارڑ کیبن" کی تختی آویزاں کر دی جائے گی.. یہ میرے لیے شمال کی محبت کا ایک اظہار تھا.. کیبن کے اندر تازہ دیار کی مہک تھی.. ابھی ابھی رندے سے تراشی ہوئی لکڑی کی قدرتی خوشبو تھی..

آسائش کتنی آسانی سے انسان کو گمراہ کر دیتی ہے.. سادہ اور قدرتی زندگی کے عقیدے کو کیسے پاش پاش کر دیتی ہے اس کا احساس مجھے اس کیبن کے اندر داخل ہو کر.. اس کے وسیع بیڈ پر لیٹ کر ہوا.. میں فوری طور پر خیمے کے اندر تنگی میں شب بسر کرنے کے رومان کو بھول گیا.. اب اگر مجھے پیشکش بھی ہوتی کہ تم اٹھارہ برس پیشتر کے اس بلند مقام پر ننگا پربت کے روبرو خیمہ نصب کر سکتے ہو.. تو میں نہ کرتا..

اس کیبن کی آسائش نے مجھے گمراہ کر دیا تھا..

کیبن سے خیمہ گاہ دیکھی جا سکتی تھی.. اس کے برآمدے میں ایک آرام کرسی پر براجمان ہو کر نیچے پھیلے خیموں اور ان میں سے ظاہر ہوتی اور گم ہوتی مخلوق پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جا سکتی تھی.. لیکن یہ نظر زیادہ دیر خیمہ گاہ پر نہیں رکتی تھی کہ اسے بھٹکانے کے لیے سامنے ننگا پربت کا سفید محل تھا..

میں نے دیکھا کہ گرد آلود میری کیمپنگ سائٹ کے کنارے پر.. رائے کوٹ گلیشیئر کے اوپر.. اپنے بیش قیمت کیمرے کو سٹینڈ پر جمائے اس کے ویو فائنڈر میں اپنی داڑھی سمیت گھسا تصویریں اتارنے میں مگن تھا اور گرد اس کے لیے چائے کی ایک پیالی تھامے ایک خادم کی طرح کھڑا تھا..

خان حلیم اپنے خیمے میں سے سر نکالے اپنی بے دریغ مونچھیں سنوار رہا تھا.. شاید اپنی محبوبہ ورجاؤں کی یاد میں ایک آدھ آہ بھر کر ننگا پربت کو تکتا تھا..

میاں فرزند رات کے کھانے کی تیاریوں میں مشغول تھا..

اور شاہد چوہدری یا فرانسیسی سیاحوں پر اپنی انگریزی آزما رہا تھا اور وہ آزردہ نظر آتے تھے..

حسن کے چہرے پر ننگا پربت کو دیکھتے ہوئے ایک معصوم مسکراہٹ کھیلتی تھی اور اس میں اس کی بیگم بھی تھی..

عمران اینڈ کمپنی فیری میڈو کے جنگل میں پوشیدہ ہو کر شاید کچھ جوان ہو رہے تھے اس لیے وہ تھکاوٹ اور پژمردگی سے بے پروا آ نکلے تھے.. اور قلم بندی میں جتے ہوئے تھے..

لیکن یہاں ایک اور کردار بھی تھا جس نے رائے کوٹ پل پر ہمیں جا لیا تھا.. لاہور سے ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا اگرچہ چلا ہوا تھا اور یہ ندیم تھا..

جو پچھلی شب تاتو کی پارٹی میں بجتے ساز چھپاتا تھا..

یہ ندیم کیا تھا؟.. ہم سب کا دیرینہ دوست اور کوہ نوردی کا ساتھی.. جو شمال کی الفت میں اسیر لاہور دہنیے شہر بے مثال کو ترک کر کے.. یہاں تک کہ اپنے بال بچوں کو ترک کر کے پچھلے تین برسوں سے گلگت میں مقیم تھا.. بلکہ گلگت میں پوسٹنگ کروا چکا تھا اور ہمیں ملنے کو.. ہم میں شامل ہونے کی خاطر رائے کوٹ پل پر آ ملا تھا..

یہ ندیم.. حسب معمول ایک گمشدہ اونٹ کی مانند ادھر ادھر منہ اٹھائے پھرتا تھا اور اس اونٹ کی کوئی بھی کل سیدھی نہ تھی.. سوائے دوستی اور معصومیت کی کل کے.. جو بالکل سیدھی تھی..

وہ حسب عادت اپنے سامان کی پوٹلی ایک بڑھیا کی طرح سر پر اٹھائے ہوئے میری کیبن میں آ گیا تھا.. "سر جی.. چیئر میں فرش پر سو جاؤں گا.. آپ جانتے ہیں کہ خیمے کے اندر میرا دم گھٹتا ہے.." "ک سرائے" کے سفر کے دوران میں نے بچن ٹینٹ میں بسیرا کیا کہ وہ کھلا اور ہوادار تھا اور کے ٹو کہانی سے میں اسی لیے نارتھ ہو گیا تو گلگت سے واپس چلا گیا تھا.. تو اجازت ہے.. چیئر میں فرش پر سو جاؤں گا.."

حد بلندیوں، جو تجھ دونوں اور شبوں کو دیکھو اور ان کے پار نانگا پربت کی بے بس اداسی دیکھو..

جو منظر میں نے دیکھا تھا وہ شاید ہستی سے مٹ چکا تھا..

جہاں ہم بے دریغ چلتے تھے وہاں اب ذاتی چراگاہ کی حد بندیاں تھیں جو کبھی کی مٹی کو کاٹ تھیں اور جہیں گھاس بھری ڈھلوانوں کے بیچ میں ایستادہ نظر آتی تھیں.. آپ بیال کیمپ کے خوش نظر گھاس بھرے پیالے میں ندیوں کو ناچتے صرف نانگا پربت کو نظر میں رکھتے ہوئے اب نہیں چل سکتے تھے.. بلکہ ان حد بندیوں سے پرے ہو کر دو قدموں کے ساتھ ساتھ چل کر آگے جاتے تھے..

وہاں پریوں کی جھونپڑے کے پر کٹ چکے تھے.. یہاں دیوؤں کے بدن کے ٹکڑے ہو چکے تھے..

اگرچہ یہ سچ ہے کہ جو کوہ نورد آج کے فیئری میڈو اور بیال کیمپ کو دیکھتے ہیں اور وہ تصور نہیں کر سکتے کہ کتنا حسن رخصت ہو چکا ہے.. وہ جب آج سے اٹھارہ برس بعد یہاں آئیں گے تو وہ بھی رنجیدہ ہوں گے کہ جب ہم پہلی بار یہاں آئے تھے تو یہاں محض چند کیبن تھے.. کچھ خیمے تھے اور آج میکڈانلڈ اور کے ایف سی کھل چکے ہیں..

ہر نسل کے مقدر میں ہے کہ وہ آج کے دیکھے ہوئے منظروں کا کل ماتم کرے.. کم از کم پاکستانی نسل کے مقدر میں یہی ہے کیونکہ یورپ میں تو ایسے منظر ہزاروں برسوں تک جوں کے توں رکھے جاتے ہیں.. ایک ہم ہی ہیں جو اپنی صورت کو بگاڑ دیتے ہیں..

کچھ سنوار نہیں سکتے محض بگاڑ سکتے ہیں..

کچھ تخلیق نہیں کرتے ہاں تباہ کر سکتے ہیں..

ایک بار جب ان زمانوں کے صدر پاکستان فاروق لغاری وادی اشکومن سے شروع ہونے والی ازبکستان روڈ کے بارے میں کچھ معلومات چاہتے تھے کہ میں انہی دنوں واخان کی قربت میں "یک سرائے" کے قریب سے واپس آیا تھا تو میں نے ان کی خدمت میں ایک ہی درخواست پیش کی تھی کہ عوام کی خوشی کے لیے اگر پورے پاکستان پر قبضہ کیا جا سکتا ہے تو براہ کرم حکومت صرف فیئری میڈو کے علاقے کو اپنی تحویل میں لے لے.. اس پر قبضہ کر کے اسے جوں کا توں محفوظ کر لے.. لیکن ان دنوں لغاری صاحب اور بی بی بے نظیر کے درمیان ٹرول شروع ہو چکا تھا جس کے سامنے ایک جنگل.. کچھ گھاس اور ایک برف پوش پہاڑ کی کچھ حیثیت نہ تھی.. ویسے مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ایسا ہوگا.. اقتدار کے ایوانوں میں کوئی نہ کوئی آئے گا

جو فیئری میڈو اور بیال کیمپ کو ان کا اصل روپ لوٹا دے گا..

میرے ساتھی کب کے بیال کیمپ پہنچ چکے تھے..

ہوٹل اور کیمپنگ کے کچن میں سے چائے پی چکے تھے.. بسکٹ کھا چکے تھے اور ایک بیالی گروپ جو یقیناً اسی پامال سے تعلق رکھتا تھا اس کی منت سماجت کر کے اُن سے دو آم حاصل کر کے انہیں نوش کر چکے تھے اور اب گھاس پر استراحت فرماتے میرا انتظار کر رہے تھے..

ان میں میاں فرزند اور شاہد کے چہرے مغموم تھے اور بجھے ہوئے تھے کہ وہ بھی گمشدہ بیال کیمپ کے سوگ میں تھے.. رنجیدہ اور چپ تھے.. وہ بھی میری طرح سن نوے میں گزر چکے بیال کیمپ کو یاد کرتے تھے..

احمد کو دا میز پُر مسرت تھا اور اپنی سرخ پی کیپ اوڑھے یہاں سے نظر آتی بچی کچی نانگا پربت کی سب تصاویر ماشاءاللہ ویڈیو میں بند کر رہا تھا... اور کمال انہماک کر رہا تھا کہیں سامنے کے کیمرے کے آگے سے کوئی گزر نہ جائے..

ندیم ابھی تک آس پاس ایک پکنک کے تصور میں ہونٹ چاٹ رہا تھا جو اس کے ذہن میں آئی تھی..

حسن اس منظر سے خوش تھا لیکن معصومیت سے شکایت کرتا تھا کہ سرتی اگر یہاں ہوٹل کھل سکتا تھا تو ایک پی سی او کیوں نہیں کھل سکتا تھا.. کم از کم میں اپنی بیگم سے بات کر لیتا..

عمران اینڈ کمپنی بھی مستعد تھے اور نانگا پربت کو کیمرے کی قید میں لانے کے لیے زاویے بدلتے تھے..

اس سے آگے جانا ممکن نہ تھا.. شام ہونے کو تھی..

آگے ایک چٹان کی اوٹ میں ابھی تک ان چولہوں کی راکھ تھی.. پتھروں پر دھوئیں کی سیاہی تھی جہاں برسوں پہلے جرمن ہوٹل کا بیس کیمپ قائم ہوا تھا اور اس نے نانگا پربت کو پہلی بار تسخیر کیا تھا.. اور اس چٹان سے آگے وہ بڑا پتھر تھا جہاں سے رائے کوٹ گلیشیر کے اوپر معلق ایک راستہ شروع ہوتا تھا جس راستے سے میں اور تھامس اور مشا گزرے تھے.. پھر سلجوق اور سمیر کے ہمراہ اس راستے پر چند ماہ قبل لوٹ آئے تھے اور برچ کے جنگلوں میں گزر کر بیس کیمپ تک گئے تھے..

شام ہونے کو تھی..

میں ایک بار نہیں دو بار ان حیرت بھرے منظروں کو دیکھ چکا تھا لیکن انہیں سہ بار

کچھ موسیقی کا، کچھ گیت سنگیت کا..

ذرا فاصلے پر ایک ڈچ اور فرانسیسی گروپ کے خیمے تاریکی میں روپوش تھے اور ان میں روپوش سیاح سونے کی سعی کرتے تھے اور کبھی کبھار ان میں سے کوئی ایک خیمے کے پردے میں سے منہ نکال کر اپنی زبان میں احتجاج کرتا تھا کہ ہم سونا چاہتے ہیں.. یہ ہلا گلا موقوف کیا جائے..

یہ سیاح بہت دور سے آئے تھے.. ایک زرکثیر خرچ کر کے آئے تھے اور اب ایک فائیو سٹار ہوٹل کی آسائش اور سکون کے متمنی تھے.. جو انہیں نہیں مل رہا تھا..

باہر اودھم مچا تھا..

مقامی لوگ نہایت تہذیب یافتہ تھے اور شور مچا رہے تھے..

ایک الاؤ کے گرد ناچتے تھے..

پھر وہ فیری میڈو کیا جہاں راتوں میں ہر طرف ایک الاؤ روشن نہ ہوتا ہو..

یہ وہ سیاح نہیں جانتے تھے.. صرف میں جانتا تھا جس نے اٹھارہ برس پیشتر یہاں ایک الاؤ روشن کیا تھا..

یہاں نہیں.. وہاں اس پتھر سے اوپر جہاں "تارڑ.... 92" نقش تھا اور جسے مقامی لوگ تارڑ پتھر کے نام سے پکارتے تھے.. اس سے اوپر بلندی پر کبھی میرا خیمہ تھا.. اور وہیں میں نے اور گیراڈ نے اپنی آخری شب میں.. اس خیمہ بردار وسعت کی گود میں جب یہاں اور کوئی نہ تھا ایک الاؤ روشن کیا تھا.. اور کیا یہ حیرت در حیرت نہیں ہے کہ آج سویرے جب میں اوپر اس بلندی تک گیا تھا جہاں میں نے ان زمانوں میں اپنا خیمہ نصب کیا تھا تو وہاں جو گھاس تھی وہ اب تک دبی ہوئی تھی.. یقیناً ایسا ممکن تو نہیں.. لیکن ایسا لگتا تھا.. کہ ہی ایک بار چاہت سے دب جانے کو برس ہا برس گزرنے کے بعد بھی اسی بوجھ سے دبی ہوئی تھی ہے.. لیکن اصل حیرت اس حقیقت میں تھی کہ اس مقام کی قربت میں جہاں ایک تختے کی اوٹ میں ہم نے الاؤ روشن کیا تھا.. اس کے آثار.. جلی ہوئی لکڑیاں اور ایک نیم سوختہ تختے کی صورت میں ابھی تک موجود تھے.. یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے بعد بھی اسی جگہ پر آوارہ گردوں نے الاؤ جلائے ہوں اور یہ ان کے آثار ہوں.. لیکن میں اس نیم سوختہ تختے کو پہچانتا تھا.. یہ وہی تھا.. جس کے بجھنے سے فیری میڈو کے آسمان پر ٹمٹماتے تارے ہم پر اترے تھے..

یہ کل تھا..

اور آج..

درجنوں خیمے تھے.. کچن اور ڈائننگ روم اور باتھ روم تھے.. اور فیری میڈو کا نصف حصہ چرواہوں کے اگرچہ بے ترتیب مگر ٹل ہوتے مکانوں سے ڈھک چکا تھا.. تو آج یہاں اگر جگہ بھی چاہتا تو ستارے کہاں اترتے..

ان کے اترنے کے لیے جگہ کم ہو چکی تھی..

آج سویرے سویرے عمران نے مجھے گہری نیند سے بیدار کر دیا تھا اور بیزار کر دیا تھا

"سر، ہم سب آج تارڑ جھیل کو شوٹ کرتا ہے.. ندی کے اوپر جو لکڑیوں کا کوٹیج ہے جس کی چھت پر آپ کہتے ہیں کہ ان زمانوں میں پھول اگے ہوتے تھے اور اب اسے گھاس ڈھکتی ہے تو اسے بھی شوٹ کرتا ہے.. پلیز آ جائیے"

جھیل میں پانی بہت کم تھا.. اس کے کنارے اونچے ہو گئے تھے اور پانی پیچھے ہٹ گئے تھے.. بارش کم ہوئی تھی.. برف کم پڑی تھی.. اسی لیے فیئری کی ندیاں اور جھرنے خشک اور خاموش تھے.. جنگل میں گھرا ایک ندی پر براجمان وہ شیلے نما لکڑی کا کاٹیج جو میرا پسندیدہ تھا اپنی چھت مخمل گھاس سے ڈھکتا تھا اور اس گھاس کی ہریالی میں کسی ایک پھول کی بغاوت بھی رنگ نہ دکھاتی تھی.

آج فیری میڈو میں جشن کی شب تھی.. رحمت نبی نے ہم سب کے لیے ایک خصوصی ڈنر کا اہتمام کر رکھا تھا.. ہماری خاطر ایک بکرا ذبح کیا گیا تھا.

عزیز.. رحمت نبی کا بھائی.. اس کیمپنگ کا نگران ہے.. وہ گائیڈ کے سوا اس میں چالاکی کا عنصر بھی ہے.. وہ طرز اتیز رکھتا ہے.. وہ بچے گلے کی مالائیں اور دل کے چھکا تا جو اس نے یقیناً غیر ملکی خواتین کو مسحور کرنے کے لیے زیب تن کر رکھے تھے ہمارے پاس آیا.. "تارڑ صاحب.. ایک فرنچ گروپ ابھی ابھی نانگا سے اوپر پہنچا ہے.. اگر تو آپ ابھی فوری طور پر ڈنر کرنا پسند کریں تو ہم سرو کر دیتے ہیں.. اور اگر آپ کچھ دیر الاؤ کے گرد بیٹھنا پسند کرنا چاہتے ہیں تو ہم فرنچ گروپ کو کھانا کھلا دیتے ہیں.. آپ بعد میں اطمینان سے کھائیے گا.. جیسے آپ کی مرضی۔"

"بعد میں اے برادر عزیز.."

اور عزیز سر ہلاتے چھکاتا چلا گیا..

الاؤ کب تک روشن رہتا.. بالآخر بجھ گیا.. کوئی ایک ستارہ بھی نہ اترا..

اس مختصر اور آسان ٹریک کا چناؤ کیا تھا۔

چنانچہ جب وادی نلتر تک لے جانے کے لیے جیپوں کے حصول، وہاں سے پورٹروں کو ہائر کرنے، خوراک خریدنے، راستے میں برف باری کے امکانات اور دیگر جزئیات کے بارے میں جیون چٹک کی چوکڑی تھی گدا نے اپنے بھرے گال پر ہاتھ رکھ کر گروآ میز کی معصوم موجودگی میں شکایت کی ایک عدا بندی کی "سائیں اس مرتبہ منیجمنٹ ٹھیک نہیں ہے۔" اور منیجمنٹ کو اس نے سے نے ج منٹ کہا۔

"کس چیز کی منیجمنٹ گدا بھائی؟" شہد اپنے حساب کتاب اور پورٹروں اور اخراجات کے تخمینے پر جھکا یہ سن کر چونک اٹھا اور سیدھا ہو گیا۔

"سائیں خوراک کا بندوبست ٹھیک نہیں۔"

"تو کیسے ٹھیک نہیں، کیا گڑبڑ ہے اس میں۔" میاں فرزند نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھیں نا جی سائیں گروآ میز کو رات گیارہ بجے کے بعد کھانا ملا، اور انہیں اتنی دیر سے کھانے کی عادت نہیں۔ تو یہ کیا ہے سے نے ج منٹ ہے؟"

"یار گدا!" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تم جانتے ہو کہ بارش شروع ہو گئی تھی ہم سب تھکے ہوئے تھے اور اس کے باوجود میاں فرزند اور ندیم باہر برستی بارش میں ہمارے لیے دیسی مرغیاں بنا رہے تھے تو یہاں کی مہربانی نہیں ہے کیونکہ باقی پوری ٹیم تو خیموں میں دبکی ہوئی تھی"

"کھانا تو رات گیارہ بجے ہی نصیب ہوا نا۔" گدا کو اتنا سنجیدہ ہم نے پہلی بار دیکھا تھا یہاں تک کہ اس کی مونچھیں بھی ساکت تھیں۔

"اور پھر اس کے بعد جب ہم لوگ یہاں کیمپ گئے ہیں تو تارڑ صاحب تو اپنی فلم کے کام میں ہم سب کو بھول گئے۔ تو وہاں بھی ہم بھوکے رہے۔" گروآ میز نے مسکراتے ہوئے شکایت کی "ہم آپ کے ساتھ بھوک سے مرنے کے لیے نہیں آئے سائیں۔"

"لیکن گروآ میز صاحب آپ کو یا کسی بھی ممبر کو خوراک مہیا کرنا تو میری ڈیوٹی نہیں۔ فیری میڈو کی کیمپنگ میں خوراک کے جو تین چار کارٹن تھے آپ ان میں سے اپنی مرضی سے جو جی میں آتا تھا نکال لیتے اور یہاں کیمپ لے جاتے، وہ مشترکہ خوراک تھی"

گروآ میز بدستور تبسم فرما رہا "سائیں ہم نے ان کارٹنوں کا بھی معائنہ کیا تھا، جن میں خوراکیں تھیں وہ دالیں تھیں اور وہ بھی کچی۔"

"تو وہاں کون سا کوئی ڈھابا لگا ہوا تھا۔" میاں تلملایا۔

"بندوبست ناقص ہے سائیں۔" گدا سر ہلاتا گیا۔ "اور پھر آخری رات بھی ہمیں کھانا رات گیارہ بجے کے بعد ملا، سائیں گروآ میز تب تک سو چکے تھے۔ یہ کیا ہے سے نے ج منٹ ہے؟"

یہ تند و تیز اور شگفتہ شکایتیں ہم سب کی سمجھ میں نہ آ رہی تھیں۔ گدا ایک مدت سے ہماری کوہ نوردیوں میں شریک تھا۔ ابھی رفاقت ثابت ہوتا تھا۔ ٹریک کے اصولوں اور قوانین سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ ٹریک کی ہر ذمہ داری، خوراک، قیام، پورٹروں کا حصول وغیرہ ایک مشترکہ ذمہ داری تھی تو وہ کیسے شکایت کر سکتا تھا۔

"گدا!" میں نے خود کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے اسے سمجھانے کی سعی کی "تم جانتے ہو کہ آخری رات رحمت نبی اور عزیز نے ہم سب کے اعزاز میں ایک بکرا ذبح کیا اور میرے کہنے پر انہوں نے فرنچ گروپ کو پیش کیا کیونکہ یہاں کا کاروبار ہے۔ انہوں نے تو ہم پر مہربانی کی"

"بے شک مہربانی کی ہو گی لیکن سائیں گروآ میز تو بھوکے سو گئے نا۔"

سائیں گروآ میز نے ایک مرتبہ پھر ہمیں ایک مسکراہٹ سے نوازا جو کہتی تھی کہ اسے عام انسان نہ سمجھا جاوے کہ ہم اپنا ہر کھانا وقت پر تناول فرماتے ہیں اور بھوکے سونے کے عادی نہیں۔

"اور رحمت نبی نے تین دنوں کے قیام کے لیے نہ ہم سے کیمپنگ کرنے کی کوئی رقم چارج کی اور نہ متعدد ناشتوں کا کوئی حساب کیا۔"

"یہ تو آپ پر احسان ہو گا سائیں، ہم تو بھوکے مر گئے سائیں۔"

"تو جی گدا صاحب۔" میاں فرزند کچھ زیادہ ہی تلملا گئے "میں نے پوری شام لگا کر فیری میڈو میں آپ کے لیے حلوہ نہیں بنایا تھا۔"

"حلوہ؟" گروآ میز مسکراہٹ ترک کر کے ایک دم جی سے تضحیک آمیز قہقہے میں جتا ہوا "وہ کیا حلوہ تھا سائیں۔ ایسا حلوہ تو کسی قبرستان میں نذر نیاز کے لیے بھی قبول نہیں ہوتا۔ بیٹھا گڑ تھا اور سوجی بھونی ہوئی نہیں تھی۔ کچا حلوہ تھا سائیں۔ سائیں ہم ٹیم کے اخراجات میں حصے دار ہیں کوئی مفت میں تو آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔"

ہم سب کے منہ حیرت اور دکھ سے کھلے تھے۔ یہ ہماری کوہ نوردی کی زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا۔

"دیکھیں گروآ میز۔" میں نے دل پر معقولات کرتے ہوئے کہا "مجھے بے حد افسوس

"میں علاقوں میں پھرتا ہوں اور عوام کے حقوق کی نگہداشت کرتا ہوں۔"

"کیا آپ مجھے جانتے ہیں!"

"شاید۔"

"شاید نہیں... اگر نہیں جانتے تو میں اپنا تعارف کروا سکتا ہوں۔"

"آپ تارڑ صاحب ہیں۔"

"تو پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ مجھے آپ کے علاقے سے بہت محبت ہے... میں ہر برس اس علاقے میں دھکے کھانے کے لیے آ جاتا ہوں اور پھر واپس جا کر کتابیں لکھتا ہوں جنہیں پڑھ کر بہت سے لوگ ادھر کا رخ کرتے ہیں اور یوں آپ کے روزی روزگار میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے... یہ جانتے ہیں؟"

"ہاں صاحب۔"

"اور اس کے باوجود... اس علاقے میں میری محبت کے باوجود... آپ میری ٹیم کے لیے مشکلات کھڑی کر رہے ہیں... معاون ثابت ہونے کی بجائے ہمیں ذلیل کر رہے ہیں... دیکھئے لیڈر صاحب... سکردو میں، گلگت میں، سوات اور کاغان میں ایسے بہت سارے مہربان ہیں جو مجھے اپنے علاقوں میں خوش آمدید کہنے کے خواہش مند ہیں تاکہ میں ان کے بارے میں بھی کچھ تحریر کروں... اب اگر میں نے آپ کی وادی کو چنا ہے تو آپ مجھے اس کی سزا دینا چاہتے ہیں؟"

"نہیں صاحب... میں تو صرف عوام کے حقوق کی بات کر رہا ہوں"

"ٹھیک ہے اگر آپ دوست دشمن میں تمیز نہیں کر سکتے اور ان معصوم لوگوں کو ان کی جائز روزی سے محروم کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی... ہم جن جیپوں پر یہاں آئے تھے وہ ابھی تک گلگت واپس نہیں گئیں... ہم انہی پر سوار ہو کر گلگت چلے جاتے ہیں۔"

لیڈر نے کچھ نہ کہا۔

"چلیں میاں صاحب... سامان جیپوں میں لاد کروا دیں" میرے ذہن میں مکمل منصوبہ تھا مختصر ترکیب ترک کیا جاتا ہے... آج رات گلگت میں جا ٹھہریں گے اور کل صبح اگر امریکہ کی معاونت سے ہم جو ڈور گلیشیئر کے قریب پہنچ جائیں گے...

میرے ساتھیوں نے سامان اٹھانا شروع کر دیا۔

پورٹر جو ابھی ابھی اس لیڈر کو نہایت اشتیاق بھری نظروں سے تک رہے تھے اس

کی روانی دیکھ کر اس کے گرد ہو گئے اور ہاتھ ہلا ہلا کر سوال جواب کرنے لگے... وہ جان گئے تھے کہ ہم گلگت واپس چلے جانے کے بارے میں سو فیصد سنجیدہ ہیں... اور ہم تھے... قدرے توقف کے بعد لیڈر میرے پاس آ گیا۔ "سر ہم آپ کی بہت قدر کرتے ہیں... شمال میں اگر ہم باہر کے کسی شخص کی عزت کرتے ہیں تو وہ... صرف آپ ہیں"

"آپ نے کیا خوب عزت کی ہے میری... ٹھیک ہے"

"دراصل آپ کے ہمراہ جو ڈورا کا جو شخص ہے اسے دیکھ کر مجھے غلطی ہوئی تھی کہ یہ کمپنی کا ٹور ہے... یقین جانئے یہ لوگ ہمارے مزدوروں کو بہت کم رقم دیتے ہیں اور سیاحوں سے ہماری مزدوری کے حساب میں تین چار گنا زیادہ پیسے وصول کرتے ہیں"... ہم لوگ سارا سال گرمیوں کے ان دو تین مہینوں میں روزی کمانے کی آس میں گزارتے ہیں... آپ سے تو ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔"

"آپ کو میری بات کا یقین کیوں نہیں آیا تھا کہ یہ ایک تجارتی ٹور نہیں ہے۔"

"صرف اس شخص کی وجہ سے جو آپ کے ساتھ ہے۔"

"تو پھر چلے جائیں گلگت؟"

"نہیں جائیے سر..." وہ مسکرانے لگا... اور اس کی مسکراہٹ میں معذرت تھی۔ "آپ کے ساتھ تو پورٹر مفت بھی جانے کو تیار ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

لیڈر اب نہایت بے لوث ہو کر پورٹروں کو تلقین کر رہا تھا کہ صاحب اور اس کی ٹیم کا خیال رکھنا... انہیں تنگ نہ کرنا...

"روانہ ہو جائیں سر... یہ میری ڈیوٹی ہے" اس نے نہایت خوشدلی سے کہا۔

پھر سے گہما گہمی شروع ہو گئی... پورٹر سامان اٹھانے اور باندھنے لگے... گدھے پھر سے لوڈ ہونے لگے...

شمال کے بیشتر باسی دل کے کھرے ہیں... وقتی ابال آتا ہے اور پھر پرسکون ہو جاتے ہیں... اور یہ ابال بھی کسی حد تک جائز ہے کہ ان کی محرومیاں اور مایوسیاں بہت ہیں... زندگی کٹھن اور پتھروں سے بھری ہوئی ہے... نامہربان موسموں اور دشوار زندگی کے ستائے ہوئے یہ لوگ پورا سال ان دنوں کے منتظر رہتے ہیں جب یہاں سیاح اور کوہ نورد اترتے ہیں اور ان کو روزی روزگار کی صورت نظر آتی ہے تو وہ بے چین ہو کر ذرا جوشیلے اور بے احتیاط ہو جاتے ہیں۔

"ٹریک کا پہلا قدم.. بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے آزاد ہو کر مصر سے نکلتے ہیں"

طغرو ہوٹل سے قافلہ نکلا..

جب اس کے دو کمروں کے سامنے والی گھاس پر سے تمام بوجھ اٹھ گئے.. پورٹر اور گائیڈ سے نکل گئے تو ہم سب باری باری اپنے ٹریک کے پہلے قدم اٹھاتے اس راستے پر گامزن ہوئے جو وادیٔ ہنزہ کے پہلوؤں سے سفر کرتا آج شب کی منزل.. ہنزہ جھیلوں کو جاتا تھا..

ایک پہاڑی سفر کے آغاز کا.. ایک ٹریک.. ایک کوہ نوردی کا سب سے ہیجان خیز اور مسرت سے لبالب لمحہ یہی ہوتا ہے.. جب پورے برس کی منصوبہ بندیوں کے بعد.. ایک خواب کی تکمیل کا پہلا لمحہ.. مشوروں اور تجربہ کار کوہ نوردوں سے ہم کلامیوں کے بعد.. خوراک.. تمام اخراجات کے تخمینے اور دیگر ضروریات کے حصول کے بعد.. اور سب سے اہم.. پورٹروں کے ساتھ معاملات طے کرنے کے بعد جب آپ اس ٹریک پر روانہ ہونے کے لیے پہلا قدم اٹھاتے ہیں.. تو جیسے بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے آزاد ہو کر مصر سے نکلتے ہیں.. اس شوق اور خوشی سے.. ایک نئی زندگی کی خواہش میں.. تو تقریباً اسی سرخوشی میں ڈوبے ہوئے.. ایک آوارہ گرد ایک کوہ نورد کسی بلند پہاڑوں کی جانب جانے کے لیے.. پہلا قدم اٹھاتا ہے..

وہ بھی ایک برس تک معاشرے اور خاندانی بندھنوں کے فرعون کی غلامی کرنے کے بعد اس سرزمین کی جانب جاتا ہے جس کا اس کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا..

آبادیاں اور تہذیب کے کاروبار اور ترک اس کی جان کے درپے ہوتے ہیں اور وہاں

سے ہجرت کر جاتا ہے..

تو یہ پہلا قدم ہمارا کتھارسس اور نشاط کی حد میں ہوتا ہے..

جیسے ایک عشق ناشاد برسوں کی جدائی پہلی نظر میں ہوتا ہے..

یوں میں نے پہلا قدم رکھا..

میرے ساتھی کوہ نوردوں کے احساسات بھی مجھ سے جدا نہ تھے..

گرد آمیز کی مسرت دیکھنے کے لائق تھی..... وہ ایک روئی پوئی نیلی بیئر کی طرح ابھر ابھر اٹھتا اپنے متعدد کیمرے سنبھالتا ہر اس شے کی تصویر اتارتا تھا جو اس لائق نہ تھی کہ اس کی تصویر اتاری جائے.. اور اس میں حسن بھی شامل تھا.. گویا کہ بس نہیں چلتا تھا کہ وہ گرد آمیز کو اپنی ہتھیلیوں پر چلانا چاہتا تھا.. سائیں ذرا دیکھ کر چلیں.. ابھر پڑی ہے.. ابھر ہی ابھر ہے سائیں.. ٹھنڈا کھلا پانی حاضر کروں سائیں.. سائیں بلندی ہے آہستہ چلیں سانس پھول جائے گا.. گویا ہمارے وجود سے یکسر غافل ہو چکا تھا بلکہ ہم میں سے کوئی ایک جب گرد آمیز سے آگے نکلتا تو وہ خفا ہو جاتا تھا کہ سائیں کو آگے آنے دیں آپ ابھر پیچھے ہو جاؤ..

حسن اپنی بیوی کے عشق میں فنا ہو... ہر منظر کے سامنے آنے پر اس کی یاد میں ایک ہوکا بھرتا تھا اور مسکراتا تھا..

شاہد نہایت متانت سے قدم بقدم ناصر میاں صاحب سے چہلیں کرتا چلتا تھا..

صرف ایک فرق تھا کہ ہمارے دونوں جانب پتھریلی دیواریں تھیں جو وادی ہنزہ کو ہم سے جدا کرتی تھیں..

پیچھے سے.. ہنزہ کی جانب سے ایک نوجوان بھاگتا ہوا آیا اور زرد رنگ کی خوبانیوں کی ایک پوٹلی ہمیں پیش کر دی..

یہ خوبانیاں لیفٹ نے خاص طور پر ہمارے لیے بھجوائی تھیں..

میں اور خان سلیم بالائی میں چلتے تھے.. اور بیوقوف مگر آزاد پنچھیوں کی طرح چہچہاتے ہوئے چلتے تھے..

"تارڑ صاحب.. یہ عشق کیا چیز ہے؟" سلیم نے بہ کم سوال کیا..

"یار ٹریک کے پہلے دن.. پہلے قدموں پر اتنا مشکل سوال نہیں پوچھا کرتے.."

"میں اتفاق کرتا ہوں.." اس نے اپنے تیر کو اس وقت ترکش کیا "ابھی پوچھ

روز کا پہاڑی سفر باقی ہے"

میاں اور شاہد ایک ایسا جوڑا تھے جو اگرچہ مدتوں سے شادی شدہ تھا لیکن ابھی تک وہ ایک دوسرے کو فن دے رہے تھے.. اور فل ریٹ میں شاہد ایک ایکسپرٹ تھا..

محسن کے چہرے پر وہی معصوم مسکراہٹ تھی جو ایک بچے کے چہرے پر پہلی بار آئس کریم چکھنے پر جھلکتی ہے..

ندیم نے ہم سے بے وفائی کی تھی.. فیری میڈوز میں ساتھ دینے کے بعد گلگت میں رہ گیا تھا کہ اس کا بنک اس کی طویل غیر موجودگی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا.. اور ہم سب اس کی کمی کو محسوس کر رہے تھے..

عمران اور اس کے بغل بچے.. ہماری نسبت بوجھ اٹھانے والے گدھوں کو زیادہ اہمیت دے رہے تھے اور ان کی خوشنودیوں اور دیگر اعضاء کو شوٹ کر رہے تھے..

مجھے وہی الجھن ہو رہی تھی..

ہم ابھی تک مکمل طور پر آزاد نہیں ہوئے تھے..

ہمارے دونوں جانب پتھریلی دیواریں تھیں.. ذاتی جائیداد کی حرص نے وادی کو اور اس کے منظر کو کاٹ کر رکھ دیا تھا..

میں اس سے پیشتر صرف ایک بار ہنزہ آیا تھا.. اپنے خاندان کے ہمراہ.. اور التر ہوٹل سے آگے نالے کے پار ایک قباحت پوش وی آئی پی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا جس کی بکنگ مجھے اتفاقاً مل گئی تھی.. میں اس زمانے میں جہاں اس وادی کی گھنی سرسبز ٹھنڈک اور بھید بھرے سیاہ جنگلوں میں سائیں سائیں کرتی شفاف ہواؤں سے متاثر ہوا تھا وہاں اس کے مکمل سناٹوں نے مجھ میں ہول بھر دیا تھا.... یہاں اتنی تنہائی تھی کہ دکھ دیتی تھی.. اتنی خاموشی تھی کہ ڈراتا تھا.. صرف اکے غیروں کی موجودگی اور کبھی لفٹ اس ویران گھر دل پر بلندی اور ٹھنڈک کے ہاتھوں تھکے والی وادی کو کچھ رونق بخشتے تھے..

لیکن اب.. جو کچھ کل جہاں تک ہو رہا تھا... وہ یہاں بھی ہو رہا تھا.. ہنزہ بہت پھیل چکا تھا.. بڑا ہو چکا تھا.. یہاں اب میدانوں سے آنے والوں نے ذاتی گھر تعمیر کر لیے تھے.. اس رونق نے سناٹوں کو ختم کر دیا اور ان کے ساتھ کچھ خوبصورتی بھی رخصت ہو گئی.. لیکن کیا کیجیے.. یہاں بھی وہی کچھ ہو رہا تھا جو کل جہاں تک ہو رہا تھا..

اب کچھ دور گئے تو دائیں جانب مقامی آبادی اور کھیت کچھ کم ہوئے اور ایک شاندار ہوٹل کی عمارت دکھائی دی جو تعمیر تو ہو چکی تھی لیکن تکمیل تک نہیں پہنچی تھی.. اس کے نگران جو صاحب تھے وہ شاید بیکار بیٹھے تھے چند دو واردوں کو گزرتے دیکھ کر برآمدے میں سے اٹھے اور ہمارے پاس آ گئے.. "صاحب ہوٹل کے تین کمرے بالکل تیار ہیں.. رات ادھر گزار دیجئے" یہاں کر خوشی سے بھر دینے والی پیشکش تھی کہ یہ ہوٹل آرام دہ لگتا تھا.. قدرتی منظر کا حصہ تھا اور اس کی کھڑکیوں میں کچھ نہیں چاہئیں، دو آبشاریں، بہت سی برفیں نہ صرف دکھائی دیتی تھیں بلکہ اندر آتی تھیں.. ہم تھکے ہوئے بھی تھے.. ہم اپنے آپ پر جبر کر کے آگے بڑھ گئے.. کیونکہ ٹریک میں حساب کتاب بہت ہوتا ہے.. منزلوں، پڑاؤں اور آپ کو ملی ہوئی ون وصول کرنے والی مختصر چھٹیوں کی تاریخوں کا حساب اور آپ اپنے من کی موج میں جہاں جی چاہے ٹھہر نہیں سکتے.. شیڈیول کی پابندی کرنی پڑتی ہے.. اس راستے میں مویشی ہانکتے، بھیڑیں چراتے، گدھے آگے لگاتے، گھروں کو لوٹتے کسان اور مقامی لوگ ملے وہ سب سادہ مزاج اور خوش اخلاق تھے..

ایک کسان مجھ سے آگے اپنی گائے کو ہانکتا چل رہا تھا.. میں اس کے برابر میں جا پہنچا "التیلیں کتنی دور ہیں؟"

"پاس ہیں.." اس نے اطلاع دی..

گوکہ یہ ہمیں پہلی بھی اطلاع تھی.. ہنزہ ہوٹل میں بھی یہی بتایا گیا تھا کہ ہم وہاں آسانی سے تین چار گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے.. لیکن جب اس کسان بھائی نے یہ کہا کہ "پاس ہیں" تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ شمال میں جب کوئی مقامی شخص کسی بھی مقام کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ.. پاس ہے.. تو جان لیجئے کہ وہ ہرگز پاس نہیں بہت دور ہے.. اور اس پاس تک پہنچتے پہنچتے آپ بالکل ہلکان ہو جائیں گے..

ہم بہت بلند کناروں پر تھے اور نیچے دریا کا پھیلاؤ تھا جس کے پار ٹیلی چوٹیاں بہت بلندی تک جاتی تھیں برفیں ٹھہری ہوئی تھیں اور ان میں سے دو آبشاریں گرتی تھیں..

راستے میں ناڑوں کے نشان ثبت تھے اور ہم دھیرے دھیرے کچھ پچھتائے کہ گلیشیئروں تک جانے کے لیے جیپوں کا سہارا کیوں نہ لیا..

اگرچہ اس راستے پر جیپیں بھی آسانی سے نہیں چلتی ہوں گی..

آبادی کم ہو گئی.. اور آس پاس بھی تھکے پتھر سایہ کرنے لگے.. راستہ نیچے دریا تک آیا اور

کنکریاں عریاں تھے نیچے ان کے اوپر پانی نہیں صرف خلا ہے.. میں آپ کو اس طلسم میں یوں شامل کرتا ہوں کہ ذرا میرے ساتھ دیکھئے.. سطح آب پر سورج کی اُس روشنی میں ایک خزاں رسیدہ تابے کے رنگ کا پتہ ہے جو ہوا کے زور سے ہولے ہولے حرکت کرتا ہے کہ پانی تو سکوت میں ہے.. اب سطح آب سے نیچے جھیل کی تہہ کو دیکھئے.. اس پتے کے عین نیچے جھیل کی تہہ میں اس کا سایہ اسی ہم رفتار سے ہولے ہولے آگے بڑھتا ہے.

اسے ایک باقاعدہ جھیل نہیں کہا جا سکتا تھا..

اس کا کوئی باقاعدہ حدود اربعہ نہیں تھا..

یہ خاصی بے ترتیب تھی..

محض پانیوں کا ایک ساکن ذخیرہ تھی..

چند نشیب تھے جن کے اندر یہ پانی بھرے ہوئے تھے.. اس کے دوسرے کنارے پر کچھ جھنڈ تھا.. برچ کے گروہ سے.. کچھ زندہ کچھ خشک.. برچ کے سفید درخت جھکے ہوئے تھے.. کچھ اس کے پانیوں میں گرے ہوئے تھے.. ان کی سفید شاخیں تہہ میں ڈوبی مدھم ہو رہی تھیں.. میں قطعی طور پر پچھلی شب اس جھیل کو جوہڑ خیال کرنے پر شرمندہ تھا.. شرمندگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے..

ایسے شفاف پانی.. کائی کے سبزے اور بھورے.. اور نیلے اور گدلے رنگ میں نے آج تک کسی بھی جھیل میں نہیں دیکھے تھے..

جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ یہ ایک باقاعدہ جھیل نہیں تھی.. یہ ایک جھیل کے تصور پر پوری نہیں اترتی تھی.. یہ ایک شعبدہ تھا.. شیشہ گری اور حیرت گری کے رنگوں کی ایسی نگری تھی جو صرف جادوئی داستانوں اور قصوں میں ہی جنم لیتی ہے..

یہ کہیں دکھائی نہیں دیتی.. صرف اس کا تخیل پرواز کرتا ہوا اسے کوہ قاف تک لے جاتا ہے اور پھر بھی اسے سچ مچ اپنے سامنے پا کر وہ تخیل بھی حیرت زدہ رہ جاتا ہے..

میں ابھی تک اس سحر کے منتر میں آیا ہوا اسی خزاں رسیدہ پتے کو تکتا تھا جو سطح آب پر ہوا کی نامعلوم زد میں آ کر ہولے ہولے سرکتا تھا اور اس کے عین نیچے کئی فٹ نیچے اس کا سایہ جھیل کی تہہ میں حرکت کرتا تھا.

اگرچہ ان آسمانوں سے اتری ہوئی شیشہ نگری میں اپنا ٹوتھ برش ڈبو کر دانت مانجنا اور پھر صفائی ریزہ اس کے پانیوں میں تر کر کے شیو بنانا اور کلیاں کرنا توہین جھیل تھی لیکن احترام کی

کوئی سزا نہیں تھی، کوئی فتویٰ نہ تھا اس لیے میں نے مجبوراً ایسا کیا..

میں برش کو جھیل میں اتارتا تو وہ پانی کے آر پار دکھائی دیتا رہتا.. اگر میں اپنا ہاتھ ڈبوتا تو وہ بھی ایک ایک انگلی انگوٹھے تک تراشیدہ تختی مانند پوری تفصیل سے دکھائی دیتا رہتا..

دھوپ کے قدرے تیز ہونے سے.. یہ پانی تو بالکل ہی شیشہ ہو کر نظر سے اوجھل ہو رہے تھے اور تہہ کے ڈوبے اور کائی رنگ کنارے آپ کے جوں تک آتے تھے.. یہ اگرچہ شفاف پانی تھے لیکن ان پر جھکنے سے چہرہ کہیں نہیں دیتا تھا تہہ میں جو جہان رنگ دیکھتا وہ نظر آنے لگتا تھا..

ایسا ہوا اور اکثر ہوا کہ میں نے کسی موڑ پر.. کوہ نوردیوں کے کسی موڑ پر.. کوئی بدن میں سنسنی اور تشکر بھر دینے والا منظر یکدم دیکھا تو میں نے آوارگی جو دیوانگی عطا کرتی ہے اس سے مغلوب ہو کر کبھی "یا ہو" قسم کا بے ہودہ نعرہ بلند کیا اور کبھی اس منظر کو ہاتھ ہلا کر "ہیلو" کہا.. یا انگلیوں کو لبوں پر رکھ کر "آئی لو یو" کی سرگوشی کی.. اور کبھی "سبحان اللہ" کہا.. اور اکثر چپ بھی ہوا.. یہاں بھی چپ نہیں رہنا چاہتا تھا.. کچھ نہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ نہ کہا کیونکہ کچھ بھی کہنے سے منظر ٹوٹتا تھا..

یہاں سے پار کا منظر دکھائی دیتا تھا اور وہ پار بھی کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔۔

یہ جھیل آپ کے بس میں تھی۔۔ آپ کی پاکٹ میں تھی۔۔ یہ اتنی مختصر اور منی اچھی تھی۔۔

یہاں۔۔ دوسرے کنارے پر تو یہ جھیل سامری ہو گی۔۔ اس کے سحر کا کوئی حساب نہ تھا۔۔ یہ ابھی ابھی سونے کا بچھڑا جنم دے سکتی تھی۔۔

پانی کی قربت میں ہو کر۔۔ پار کے منظر کو اپنے اندر اتارنے اور جمع کرنے کی خاطر میں اس کے دلدلی کنارے پر بیٹھ گیا۔۔

"سر جی۔۔ آپ ذرا اپنے خیالوں میں گم جھیل کے پانیوں پر ایک کنکر پھینکنے میں اس کو فالو کروں گا۔"

میں نے ایک کنکر پھینکا۔۔

وہ کنکر سطح آب پر۔۔ اس شیشۂ آب پر گرا۔۔ چھپاک سے گرا۔۔ اور پانیوں میں میری نظروں کے سامنے اترتا گیا۔۔ ایک بھنوری کی چٹنگ کی۔ تیرتا ہوا جھیل کی تہہ تک گیا اور وہاں بیٹھ گیا۔۔ اور میں حیرت سے اُسے دیکھتا گیا۔۔ ۔

"ایک اور پتھر پھینکیے سر۔۔ میں آؤٹ آف فوکس ہو گیا تھا۔۔"

میں نے ایک اور کنکر تلاش کر کے آہستہ سے جھیل پر پھینکا۔۔ اور وہ بھی سطح آب سے نیچے ہوا۔۔ میری نظروں کے سامنے ڈولتا ہوا تہہ کے اس حصے میں جا بیٹھا جہاں سے ایک چشمہ پھوٹ رہا تھا۔۔ اس پتھر کے اردگرد بلبلے پھوٹ رہے تھے اور مجھے یہ لگ رہا تھا کہ میں ایک گھریلو ایکویریم سے ناک چپکائے اس کی تہہ میں سے پھوٹنے والے آرٹی فیشل بلبلوں اور زیبائشی پتھروں کو دیکھ رہا ہوں۔۔ یہ پانی اتنے شفاف تھے۔۔

میں کیمرے سے غافل تو تھا اب اور غافل ہو گیا۔۔

یہ ایک کھیل تھا۔۔

میں نے ایک اور کنکر پہلے کی نسبت بڑے حجم کا کنارے سے کچھ فاصلے پر پانیوں پر پھینکا۔۔ اب اس کی آبی تصویر کچھ اور تھی۔۔ پتھر جھیل کی سطح پر گرا تو فوراً پانیوں پر دائرے در دائرے پھیلنے لگے اور میں حیرت زدہ تھا کہ یہ دائرے بلکہ ان کا سایہ جھیل کی تہہ میں بھی اسی طور پھیلنے لگا۔۔ اور ہاں اس عمل کے دوران ایک درمیانی منظر بھی تھا جب وہ پتھر سطح آب سے نیچے اترتا تھا تو اوپر بنتے ہوئے دائروں کی تہہ میں تخلیق ہوتے سایوں کے درمیان میں وہ پتھر جا بیٹھتا تھا۔۔ یہیں

اسی مقام پر گھاس پھونس اور جھیل میں گرے پتوں اور برچ کی سفید شاخوں کے درمیان میں جب میں نے غور سے دیکھا تو کنارے کے پانیوں میں ایک چھوٹی سی مچھلی تیرتی تھی۔۔ اور وہ بھی ایک گھریلو ایکویریم میں قید مچھلی کی مانند دکھائی دیتی تھی۔۔ ہریاول۔۔ گھاس اور بوسیدہ پتوں کے درمیان تیرتی ایک چھوٹی سی رنگین مچھلی۔۔ تیرتی اور جب کوئی گھاس یا کائی کی رکاوٹ آتی تو پھرکی اس سے بچ کر نکلتی اور پھر تیرتی۔۔

عام جھیلیں ایک مناسب فاصلے سے شاندار اور پرشکوہ دکھائی دیتی ہیں۔۔ پس منظر کے برف پوش سلسلے۔۔ گھاٹیاں اور آسمان اس کے سحر میں اضافہ کرتے ہیں۔۔ لیکن یہاں سے الگ ایک اور جھیل تھی۔ فقط یہ جھیل تھی جسے فاصلہ بے شناخت کر رہا تھا اور اسے قربت حسن دیتی تھی۔۔ اسے اس کے پانیوں پر آنکھیں بچھا کر ہی دیکھا جا سکتا تھا کہ جو کچھ تھا اس کے باطن میں تھا۔۔ اس کی تہہ اور شفافی میں تھا۔۔

یہ وہ قربت تھی جس میں چہرے اور بدن معدوم ہو جاتے ہیں اور صرف وصل کی آنچ باقی رہ جاتی ہے۔۔

جھیل کے پانی رنگ بدلتے تھے۔۔

کہیں تہہ میں کائی جو سرسرائی تھی زندہ ہی تھی۔۔ کہیں سبز اور بھورے خزاں رسیدہ بھورے رنگ کی کائی۔۔ زندہ تھی تھی۔۔ اور جہاں چشمے پھوٹتے تھے وہاں جھیل کی تہہ گہرے نیلے رنگ کی تھی۔۔ کہیں پتوں اور تنوں کے گلنے سے ایک میلی دلدل نظر آتی تھی۔۔ چنانچہ دور سے اس کے پانی رنگوں میں بٹے ہوئے لگتے تھے۔۔ جیسے کسی نادان رنگ ریز نے چنری کو ایک رنگ میں رنگنے کی بجائے مختلف رنگوں میں رنگ دیا ہو۔۔ یا پانی سے بھرے ایک ٹب میں کسی بچے نے کئی رنگوں کی پچکاریاں چلا دی ہوں۔۔ یہ بہاولپور کی وہ دھنک تھی جسے صحراؤں کی باقی نار۔۔ گرمی سے رنگیلی ہوتی ذرا دیر کو دیکھیں ہوا کے چلتی ہے۔۔

جھیل خبر کا پس منظر اور محل وقوع بھی نہایت معمولی تھا۔۔ اور نہ ہی اس کا کوئی واضح حدود اربعہ تھا۔۔ یہ بے ترتیبی سے ادھر ادھر پھیلے ہوئے پانیوں کا ایک مجموعہ تھی جس کے کنارے بھی اس لیے واضح نہ تھے کہ کہیں کچھ پتھر تھے اور کہیں اس میں درخت گرے ہوئے تھے۔۔

یہ جھیل کی کسی بھی تعریف پر پوری نہیں اترتی تھی اور پھر بھی یہ ایسی تھی کہ اس کی تعریف کے لیے لفظ کم پڑتے تھے۔۔

"یہ میں تمہیں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک زبردست زندگی میں صرف ایک بار سامنے آنے والا شاٹ آفر کر رہا ہوں اور تم بحث کر رہے ہو"

"اور کیا آپ تہہ تک اترتے سانس روکے رکھ سکتے ہیں؟"

"ہاں بالکل.. وہاں زیادہ سے زیادہ گہرائی چھ سات فٹ ہو سکتی ہے.. اور یہ زیادہ نہیں"

"اور کیا آپ کے پاس اتنا وقت ہے کہ بعد میں آپ اپنے کپڑے بدل سکیں.. تیسے جوگر اور جرابیں اتار کر بچھو دیں سکیں کیونکہ تم لوگ تیار ہے.. صرف ہمارا انتظار ہے.. ابھی ابھی ہیلم دوسرے کنارے پر خیمے میں ہاتھ ہلاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا.."

"اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں بے ایمان ہو چکا ہوں"

"کیسے؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ آج یہیں ٹھہر جائیں.. اس جھیل کو دن کے مختلف رنگوں اور روشنیوں میں دیکھیں.. میں لیڈر ہوں اور کہہ سکتا ہوں کہ سامان کھول دو ہم آگے نہیں جا رہے"

"ہاتھ ملائیں سر" عمران کی داڑھی میں سے بھی مسرت ٹپکنے لگی۔ "میں بھی بے ایمان ہو چکا ہوں.. یہاں دھوپ کے زاویے بدلیں گے تو پانی بدلیں گے.. رنگوں کے فریب ہوں گے.. منظر ان کے دھوکے ہوں گے اور میں انہیں شوٹ کروں گا.. میں آپ کے ساتھ ہوں.. ہاتھ ملائیں سر.."

"تو پھر تم اپنے کیمرے کو نم میں کرو.. میں جھیل میں کودنے کو تیار ہوں"

کاشی اور خاور اس مکالمے میں حصہ دار تھے وہ گونگے خادموں کی طرح عمران کے دائیں بائیں منتظر کھڑے ہوتے تھے اور اپنے اپنے آلات تھامے اس کے حکم کے منتظر تھے..

دوسرے کنارے پر.. اور اس کنارے کے عقب میں خیمہ گاہ تھی اور ہم چلتے چلتے اس کنارے پر آ چکے تھے.. تو دوسرے کنارے پر کوئی شخص ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں بلا رہا تھا.. اور یہ شخص ابراہیم تھا جو ہمیں متوجہ کرنے کی کوشش میں تھا اور "ناشتہ.. بریک فاسٹ سر" چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا..

"ابھی صاحب ادھر جھیل میں چھلانگ لگائے گا پھر آئے گا" عمران نے بھی جواباً چیخ کر اسے مطلع کیا..

ابراہیم یہ جواب سن کر وہاں کھڑا نہیں رہا.. ایک غزال کی مانند قدیں بھرتا جھیل کا چکر لگا کر چھلانگ لگاتا چند لمحوں میں ہمارے پاس پہنچ گیا "کیا کہتے ہو صاحب.."

"ابھی تارڑ صاحب.. ادھر پانی میں کودے گا تو ہم فلم بنائے گا.. پندرہ بیس منٹ کا کام ہے.. تم چلو ہم ابھی آتا ہے اور پھر ناشتہ کرتا ہے.."

"نہ صاحب.." اس نے سر ہلایا..

"کیا.. نہ صاحب؟" میں نے پوچھا

"ادھر جھیل میں بالکل نہیں اترو.. اس کی تہہ میں بہت دلدل ہے.. نیچے چلا جائے گا تو اوپر نہیں آئے گا.. دلدل میں پھنس جائے گا.. ادھر ایک میم صاحب بھی کپڑے اتار کر اندر گیا تھا تو نیچے پھنس گیا تھا بڑی مشکل سے نکلا تھا.. بعد میں ادھر کنارے بیٹھ کر روتا تھا.. نہیں اترو بہت خطرہ ہے.."

ہم کچھ دیر اس دھیان میں رہے کہ میم صاحب ادھر کنارے بیٹھ کر جب روتا تھا تو کیسا لگتا تھا پھر میں نے پوچھا "یار.. کتنا دلدل ہوگا.."

"اتنا" ابراہیم نے اپنی شلوار کے پائنچے سمیٹ کر اوپر کئے اور کنارے سے دو تین قدم پانی کے اندر گیا.. اور وہ جس مقام پر کھڑا ہوا تو واقعی آہستہ آہستہ نیچے ہونے لگا اور پھر جلدی سے پاؤں اکھاڑتا باہر آ گیا "صاحب ادھر اتنا دلدل ہے تو آگے آپ اندازہ کرو"

"اندازہ کر لیا" میں نے جھیل میں کودنے کا ارادہ فی الفور ملتوی کر دیا..

"صاحب بہت زمانوں سے اس جھیل میں پتے، درخت اور گھاس وغیرہ گرتا ہے تو نیچے اس کا دلدل بنتا جاتا ہے.. بس جدھر سے چشمہ نکلتا ہے تو بس وہاں پانی کے زور سے کچھ نہیں ٹھہرتا اور تہہ صاف رہتا ہے لیکن ادھر مت اترو.."

"تو پھر ادھر اتر جائیں جہاں چشمے پھوٹتے ہیں.. وہاں تو دلدل نہیں.."

"نہیں سر" عمران بولا "وہ جگہ سامنے میں ہے اور آپ تہہ تک جاتے ہوئے دکھائی نہیں دیں گے اور وہاں پانی بھی گہرا لگتا ہے.."

اگر اس لمحے ابراہیم نمودار ہو کر مجھے خبردار نہ کر دیتا تو کیا ہوتا.. وہی ہوتا جو تقریباً چالیس برس پیشتر چیرس کے دریائے سین میں ایک حالت بے خودی میں چھلانگ لگا دینے سے ہوتا ہوتا بچا تھا..

"ناشتہ ٹھنڈا ہوتا ہے سر.. دیسی انڈہ کا آملیٹ بنایا ہے.. ٹھنڈا ہوتا ہے تو ربڑ کا ہوتا ہے سر.. آ جاؤ.. آپ کا ٹیم بھی انتظار کرتا ہے"

ہم آ گئے.. بادل نخواستہ آ گئے.. ٹرک سیک بھی پیک ہو چکے تھے.. گدھے بھی تیار تھے.. اور ہمارے ساتھی بیزار ہو رہے تھے.. خیمہ گاہ میں آئے تو جھیل پتھروں کی اوٹ میں چھپ گئی اور اس کی

جائیں میں نہیں جانے کا۔۔میں نے آج اس جھیل کو اپنے کیمرے کے لینز میں سے دیکھا ہے تو احساس ہوا ہے کہ میں نے آج تک اس لینز کے راستے جو کچھ دیکھا ہے۔۔آپ کا اس ماڈل کے ناپ کا اس بدن دیکھے ہیں۔۔اور حیران کن منظر اور لوگ دیکھے ہیں تو میں آج تک جھک مارتا رہا ہوں۔۔۔۔میں لیڈر کی نافرمانی کا مرتکب تو نہیں ہو سکتا کہ آپ ہی تو مجھے یہاں تک لائے ہیں لیکن صرف یہ گزارش کرتا ہوں کہ آپ چلیں۔۔روانہ ہو جائیں۔۔میں کچھ دیر اور ٹھہرنا چاہتا ہوں۔۔جھیل کو دن کی مختلف روشنیوں اور سایوں میں شوٹ کرنا چاہتا ہوں۔صرف دو گھنٹے عنایت کریں۔۔آپ چلیں میں آپ سے آملوں گا"

"کیسے آملو گے تم راستے سے واقف نہیں ہو۔۔۔بیٹھ ہو کہ بھٹک جاؤ"

"آملیں گے سر جی۔" کاظمی بولا۔۔اور اس نے آج دوسری مرتبہ اپنا منہ کھولا۔۔اپنے دانت دکھائے جو ایک دوسرے سے الگ الگ، اجنبی اور فاصلے پر تھے "شوٹنگ سے فارغ ہو کر ہم تینوں کچھ مست الست جوان اپنے اندر اتریں گے اور پھر پہاڑ۔۔دریا اور ندی نالے پھلانگتے آپ کو جا ملیں گے بلکہ آپ سے بھی آگے نکل جائیں گے۔۔آپ چلیں سر جی۔۔"

"ہائی لیڈر، دیر ہو رہی ہے۔۔بسم اللہ کریں" شاہد نے درخواست کی۔۔

"اگر آپ لوگ اجازت دیں" میں نے چلنے کو تیار، بے چینی سے پاؤں بدلتے اپنے ساتھیوں سے گزارش کی "میں اپنے دانتوں کو برش کر لوں؟"

"دوبارہ برش کریں گے جناب عالی؟" میاں صاحب حیران ہو گئے۔۔

"آہو۔۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔۔

"ہائی لیڈر آپ کے دانت پہلے ہی کمزور ہیں۔۔دوبارہ برش کریں گے تو شاید ان میں سے ایک آدھ گر پڑے۔۔کیوں رسک لیتے ہیں۔۔بہرحال آپ لیڈر ہیں۔۔جو کچھ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔۔"

وہ سب مجھے دوبارہ برش پر پیسٹ لگاتے ہوئے نہایت غور سے دیکھتے رہے کہ یہ شخص چاہتا کیا ہے۔ اور یہ شخص کسی نہ کسی بہانے ایک مرتبہ پھر جھیل کی طرف جانا چاہتا تھا۔۔

بڑے پتھر کے پاس میں اسی مقام پر پانی کی قربت میں ہو بیٹھا جہاں آج سویرے بیٹھا تھا اور پھر جھک کر اپنے ٹوتھ برش کو پانی میں ڈبویا۔۔ڈبویا تو پانی کی سطح چند لمحوں کے لیے کرچی کرچی ہوئی شیشے کی شفافی ٹوٹی اور بکھر گئی۔۔لیکن میری انگلیاں، ان میں تھاما ہوا پیسٹ اور برش پر لگی ہوئی

نیلا ٹوتھ پیسٹ جھیل نظر کے پانیوں میں یوں نمایاں ہو رہی تھی جیسے وہ پانی میں نہ ہو میری نظر کے سامنے ہو۔۔۔وہ ایسی شفاف تصویر تھی۔۔

اور کیسے کیسے رنگ اس کے پانیوں کے تھے۔۔

ازلی رنگ ریز نے اس جھیل کی چنریا کو کیسے رنگا تھا کہ رنگ تو رنگ ڈھنگ ہی نے تھے۔۔

اور میں اس چنریا کو چند لمحوں کے لیے دیکھ پایا تھا اور نہ دیکھ سکا تھا۔۔رنگ ریز کا نے پانیوں کو کیسی سندرتا دی تھی۔ لیکن وہ دوبارہ کی مانند تھی۔۔نصیبوں جلی تھی۔۔ندامت اوڑھ گئی اور سندرتا کو لجا گئی۔۔

"نیلاہٹ کے دو جزیرے دکھائی دیتے ہیں.. اور یہ عشق کیا چیز ہے"

یہ پہلی جھیل تھی جس سے جدا ہوتے ہوئے میں نے اُسے مڑ کر ایک بار بھی نہ دیکھا..

خیمہ گاہ کے پتھروں کے پہاڑوں میں سے آتی بلندی پر سانس تھامے آہستہ آہستہ چلتا گیا.. اوپر چنار درختوں کا ایک مختصر ذخیرہ تھا جس میں سے ایک راستہ سیدھا جا رہا تھا لیکن ہم اسے چھوڑ کر ایک پتھر کے دامن میں سے نیچے اترتے ایک پرشور نالے کے قریب آ گئے.. نالے پر چند لکڑیوں کا ایک نہایت مخدوش سا پل تھا جسے ہم نے باری باری سنبھل سنبھل کر پار کیا.. پار ہوئے تو ایک خدشے نے سر اٹھایا کہ پورٹر تو آگے جا چکے ہیں تو وہ کون سے راستے پر گئے ہیں.. جنگل میں سے نکلنے والے سیدھے راستے پر یا پھر اس نالے کے پار ہو کر کہیں آگے جا چکے ہیں.. پھر بہت دور ایک بلند راستے پر ایک پورٹر ہاتھ ہلاتا ہوا نظر آیا.. یہی راستہ تھا..

پل کے دوسری جانب ایک ڈھلوان تھی جس کے درمیان میں ایک پگڈنڈی چلی جا رہی تھی اور نیچے پیچھے دریا سے لحظہ بہ لحظہ اونچی ہوتی چلی جاتی تھی.. ہم اس نسبتاً آسان راستے پر بلند ہوتے ڈھلوان کی چوٹی پر پہنچ گئے.. دوسری جانب ایک بے حد وسیع منظر کھلتا تھا ایک بہت چوڑی وادی نظر آ رہی تھی.. ایک دل کو خوش کر دینے والی کشادگی تھی.. اس کشادگی کے درمیان خیابانِ رنگ کا منظر ہو یا.. یا ایک خاموشی سے لپٹا ہوا تھا اور اس کے وسیع گندمی پتھروں کے سلسلے تھے اور گیلی ریت تھی جس میں چھوٹی چھوٹی ندیاں نالے سے جدا ہو کر گھومتی جاتی تھیں.. کہیں گھاس کے میدان تھے جن میں وحشی ساکت نظر آتے تھے.. اور پھر دو بلند اور برف پوش پہاڑ تھے جو اس وادی

کے پہرے دار تھے.. اس کی سرحد تھے..

یہ منظر تو سامنے کا تھا..

اور جو کچھ ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے یا پیچھے چھوڑ آئے تھے وہ بھی ایک کمال کی تصویر تھی.. وہ پل تھے ہم ابھی ابھی پار کر کے آئے تھے یہاں سے ایک کھلونا پل لگ رہا تھا.. نالے کا شور سکوت میں جا چکا تھا اور اس کی تندی تیزی ہو گئی تھی.. اس کے پیچھے جو پہاڑی سلسلے تھے ان میں دو جھیلیں چمکتی دکھائی دے رہی تھیں.. میں اور میرے ساتھی شدید حیرت سے دوچار ہوئے کہ ہم ان کی موجودگی سے آگاہ نہیں تھے.. ہمیں ان کے وجود کی خبر تک نہ تھی..

ان میں سے ایک جھیل کے کنارے واضح نہ تھے.. صرف پتھریلی چٹانوں میں گھرے ہوئے شدید سبز رنگ کے پانی تھے اور پاکستانی پرچم ہوتے جاتے تھے..

اس سے اوپر دوسرا بلند سطح پر ایک اور جھیل نظر آ رہی تھی... وہ پتھروں کی سیاہی جنت کی قید میں شدید نیلاہٹ کا ایک دل فریب جزیرہ تھی..

میں بہت دیر تک ان کو دیکھتا رہا.. مجھے خبر نہیں تھی کہ شتر جھیل کی خیمہ گاہ سے بلند درختوں کے ذخیرے میں سے جو راستہ سیدھا چلا جاتا ہے وہ ان جھیلوں تک جاتا ہے.. بہت بعد میں ایک وادی اور کوہ نوردی کے جنون میں مبتلا شخص نے بتایا کہ جھیل شتر سے پہلی جھیل صرف دو گھنٹے کی مسافت پر ہے اور وہاں بہت کم لوگ جاتے ہیں اور دوسری جھیل قدرے بلندی پر ہے اور زبردست نظاروں والی ہے.. لیکن اب کیا ہو سکتا تھا اب تو وہاں ہم جھیلیں چھپ گئی تھیں..

میں نے ایک آخری نگاہ ان انجانی جھیلوں پر ڈالی... اور غرناطہ کے آخری تاجدار ابوعبداللہ کی مانند ایک آخری آہ بھری.. اس نے غرناطہ کو آخری بار دیکھ کر بھری اور میں نے ان جھیلوں کو بھی اپنا غرناطہ جان لیا.. اس لئے دوسری آخری آہ بھالی.. لیکن یہ ماننے کی آہ تھی اور ہرگز آخری نہیں تھی کہ کوہ نوردی میں ایسے مقامات دوبارہ آتے ہی رہتے ہیں..

اس اونچائی کے دوسری جانب ہم اس عظیم وسعت والی وادی میں اترنے.. اترتے تو جھیل شتر کا نام ڈھلوان کے عقب میں روپوش ہو گیا.. ہم نیچے اترتے گئے..

ایک نالہ عبور کیا جو بہت ہی معصوم سا تھا..

ڈھلوانوں پر گھاس کی تہیں تھیں..

اور کہیں بڑے بڑے پتھروں میں سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا.. بالآخر ہم دریا کی جوڑے پھیلاؤ

والی وسعت کے کناروں پر اترے.. جہاں پہاڑ اتر کر ختم ہوتے تھے وہاں اترے.. بھربھری ریت اور کنکروں کے درمیان دریا کی ایک شاخ مزید شاخوں میں بٹ رہی تھی.. ان کے پانی ٹھنڈے ٹھار تھے یہ نہیں ہمارے جوگرز نے بتایا کیونکہ انہیں بچاتے ہوئے وہ بھیگ چکے تھے.. ان شاخوں کے آگے ہم کچھ دیر ریت پر چلے اور پھر چھوٹے چھوٹے پتھروں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا..

ہم انہی پتھروں پر چلتے گئے..

دریا ہم سے بہت دور جانے کہاں تھا.. تھا بھی یا نہیں.. یہاں سے نہ وہ دکھائی دیتا تھا اور نہ وہ سنائی دیتا تھا..

آج بھی تین فرقے تھے..

گلہ اور گرد آبیزیک فرقہ ہو گئیں کنارے میں سے جان کر ہم سے بالکل الگ چلتا تھا اور چہلیں کرتا چلتا تھا.. نہایت الگ انداز میں..

عمران اور اس کے اہل بیچے ہوا بھی تک جھیل خنجر کے کناروں پر تھے اور مجھے ان کے بارے میں تشویش ہو رہی تھی کہ کہیں وہ راستے میں بھٹک نہ جائیں اور قدیمی فرقہ.. جس کے معتقدین میں شاہد میاں فرزند سلیم اور یہ فقیر شامل تھا..

لیکن آج میں اور سلیم ساتھ تھے..

بلکہ آج تو میں گھوڑا ہو چکا تھا..

ڈاکٹر عمر کی تحقیق کے مطابق پہاڑوں میں پہلے دن انسان بمشکل خپ خپ چلتا ہے اور اس کا وہ سب کچھ سوج جاتا ہے جو نہیں سوجنا چاہیے.. اگلے دن اس کا پورا بدن دکھتا ہے لیکن وہ چلتا جاتا ہے اور تیسرے دن... وہ گھوڑا ہو جاتا ہے..

اب میرا کمال ملاحظہ کیجیے کہ میں دوسرے دن ہی گھوڑا ہو گیا.. ان لمحے میں یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ میرے گھوڑا پن کا پہلا اور آخری دن ہے.. آج کے بعد مجھے خچر ہو جانا تھا.. اور سلیم.. وہ اطمینان سے بے تکان چلتا تھا..

"ہاں جی اب تو بتائیں.. دور دور تک نہ کوئی بندہ نہ پرندہ.. اب تو بتائیں کہ یہ عشق کیا ہوتا ہے.."

"یہ تم بار بار ایک ہی سوال کیوں پوچھتے ہو؟" میں نے تنگ آ کر کہا..

"کیونکہ ایک ہی سوال ہے.."

"اور مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"سر یہ بڑی مصیبت.. بڑی اُلجھن ہے، بڑا پرابلم ہے سمجھ میں نہیں آتی.. آپ سمجھائیں نا.. آپ پر بہت کچھ بیتا ہے.. اپنی بزرگی سے.. اپنے تجربے سے بتائیں نا کہ یہ کیا ہے."

"میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ اگر آپ کی محبوبہ کالا شاہ کاکو میں رہتی ہے اور آپ نیلا پارک چلے جاتے ہیں تو وہاں نیلا پارک میں ہر چہرے کو اس آس میں دیکھتے ہیں کہ شاید وہ یہاں ہو.. یہ عشق ہے."

"سوری سر.. یہ تو نہایت بیہودہ قسم کی تشبیہ ہے.. کچھ دانشورانہ قسم کی توجیہ.."

"تو پھر جیسا کہ میرے ایک تکڑے رب کا ایک تخیل اور بجارت کہتا ہے جسے سلجھانے کی کوشش میں بندہ کافر ہو جاتا ہے.. تو عشق بھی ایک ایسی ہی بجارت ہے.."

"نہ سر." اس نے اپنے غیر متوازن دانت نمائش کے لیے پیش کر دیے" یہ تو محسن تخیر ہاں میں.. مجھے تو سیدھا سادا جواب چاہیے.. تخیل بغیر.."

"تو پھر اسے فریب کے میرا عشق وہی تو ہے میرا روحی تو ہے.. میں تلاش کروں."

"لو.. میں اب تحقیق شروع کر دوں.. دوز صاحب وہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا" میں ایک ملی جھنگل میں انگریزی کارروں.. بڑے بڑے بین الاقوامی گوروں کی آنکھوں میں دھول ڈالتا ہوں مجھ سے ہیرا پھیری نہ کریں.."

"یار سیدھا سادا کالا شاہ کاکو والی محبت کا جواب دیتا ہوں تو کہتے ہو کہ بیہودہ تشبیہ ہے.. دانش ور بننے کی کوشش کرتا ہوں تو پھر اعتراض کرتے ہو.."

"سوری سر.."

"دیکھو میرے لیے یہ شاہ گوری ہے.. جھیل کرومبر ہے.. جھیل خنجر میں آج سویرے جتنے رنگ تھے وہ اس کے بدن کے رنگ تھے.. بس اسی کا وجود اس کے پانیوں میں رنگ بھرتا تھا.. یہ میرے لیے تھا.. دوسروں کے لیے.. عثمان فقیر کے لیے یہ یار دا ہندی عشق آتش لائی ہے.. یہ وحدت الوجود بھی ہے اور عشق بھی.."

"میری تسلی نہیں ہوئی.." اس نے سر ہلایا..

"تو پھر تم بھاڑ میں جاؤ.. میرا سانس پھول رہا ہے.. یہ پتھر لمبے کمرے ختم ہونے میں نہیں آتے.. میرے جوگرز کے اندر لگ رہا ہے کہ پاؤں خون آلود ہو چکے ہیں اور تمہاری تسلی ہی

نہیں ہوں بھی... مجھے بہرحال معلوم نہیں ہو کیوں پوچھتے ہو..." اگر معلوم ہوتا تو یوں کیوں بلند پہاڑوں میں بھٹکتا پھرتا"

"یہ تو نرے بہانے ہیں بلند پہاڑوں میں بھٹکنے کے.. آپ کی سرشت میں ہی گوندھا گیا ہے کہ ہمیشہ دربدر ہوں.. آپ کے شوق دشت نوردی میں کسی لیلیٰ کا دخل نہیں.. عشق تو محض ایک بہانہ ہے"

"نہیں سلیم.. عشق ہے... وہ حقیقی ہے یا مجازی یہ میں نہیں جانتا.. لیکن آج سے تیس برس پیشتر میں اس کی تلاش میں نکلا تھا.. اسے پالیا ہوتا تو میری تلاش اختتام کو پہنچ جاتی.. میں عمر کے اس حصے میں ہوں جب دامن میں دو کے ایک ہونے سے جو پیڑ سے کی ارزد ہوتی ہے لیکن میں ابھی تک اسی کو میں بھٹکتا پھرتا ہوں اس لیے کہ شہر آرزو کے دروازے مجھ پر بند ہیں.. میرے ناول "راکھ" کی فوزان، شاہ علی سے پوچھتی ہے کہ شاہ جی یہ عشق کیا چیز ہے اور وہ کہتا ہے.. عشق چیز ہے.."

"اور عشق کے بغیر تو سنو لیک بھی ممکن نہیں.." سلیم ہنسنے لگا..

"ہرگز ممکن نہیں" میں بھی کوہ نوردی کے اس چسکے اور بلندیوں کی سرد ہواؤں میں سانس لیتا خوش ہو گیا.. میں ذرا اداس ہو رہا تھا اگرچہ میرے جوگرز میں میرے پاؤں خون آلود ہو گئے تھے..

"ایک گوجر بستی.. اور پہاڑوں کے سرکس کے بازی گر.."

پتھریلی ڈھلوان اختتام کو پہنچی.. دریا آہستہ آہستہ ہمارے قریب ہوتا گیا تھا اور ہم خشک کی ایسی ڈھلوان میں اس کی قربت سے بے خبر رہے تھے.. اب وہ شور مچاتا ہمارے قدموں میں پھواریں چھڑکتا تھا.. وسیع وادی تنگ ہو گئی تھی اور اب صرف دریا تھا اور اس کے بھربھرے اور خطرناک کنارے تھے جہاں ہم پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے.. گفتگو موقوف ہو چکی کہ شور بہت تھا..

یہ کنارے ایک شہتیروں سے بنے ہوئے پل تک اترتے تھے.. اور اس کے پار ہم گئے.. کیوں گئے؟ اسی کنارے پر کیوں نہ چلتے گئے.. کیونکہ آگے ایک پل تھا اور پل کے پار ہی جایا جاتا ہے.. پار اترنے اور چڑھائی کے معاملات تھے لیکن پرخطر نہ تھے محض سانس کے لیے ایک امتحان تھے.. پتھروں کے درمیان گھاس تھی اور پتھر بڑے بڑے تھے.. ہم ان میں سے راستہ تلاش کرتے اوپر چلے گئے اور اوپر گوجروں کی ایک بستی ایک پڑاؤ کے آثار تھے..

ہم اس بستی کے باہر درختوں کی چھاؤں میں.. چٹانوں پر جو ایک بڑا اور سفید اژدھا گلیشیئر تھا اس کی پھونک سرد ہوا کو اپنے بدنوں پر محسوس کرتے بیٹھ گئے اور سستانے لگے..

گلیشیئر میں سے چھوٹی چھوٹی برفانی ندیوں کی ڈالیاں پگھلتی اترتی تھیں..

ہمارے بدنوں میں چلنے کی مشقت سے جو حدت پیدا ہوتی تھی وہ سرد ہونے لگی..

پسینہ خشک ہو کر سرد ہونے لگا..

گوجروں کے جھونپڑوں میں بے شمار چھوٹے چھوٹے بچے گڑیوں کی مانند پھوٹنے لگے.. اگرچہ بہ احتیاط نکلیں تھیں اور وہ دوڑتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے..

سلیم نے انہیں خوش آمدید کہا اور نہایت فراخدلی سے ہر ایک ننھی کچی ہتھیلی پر ایک ایک چاکلیٹ سویٹ رکھ دی۔۔

"لسی ہے لسی؟" میں نے پوچھا۔۔

اور وہ تمام کے تمام بچے ان اس جادوئی لفظ کی ادائیگی پر فوراً ہاؤٹ ترن ہوئے اور بھاگ گئے اپنے جھونپڑوں میں گم ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ان میں سے برآمد ہوتے ہیں تو ہر ایک کسی رنگ آلود کنستر۔۔ پلاسٹک کے لوٹے یا ڈبے سے لیس تھا اور ان میں سفید لسی لبریز ہوئی تھی۔۔

یہ ان کے لیے لسی تھی۔۔ ہمارے لیے دہی تھا۔۔

یہ دہی بھی آغاز سے اخیر برس پیشتر نیئری میڈوز کی پہلی یاترا کے دوران تتو کے گاؤں میں مولوی عبدالرحمن کے گھی کے گندے کنستر میں پیش کردہ دہی کی مانند قدرے نمکین خاصا فدوش تھا۔۔ اس میں زیادہ سے زیادہ کچھ بھی ہو سکتا تھا اور کم سے کم چند مکھیاں۔۔ اور بچوں کی بہتی ناکوں کا کوئی بکا سا ذائقہ۔۔ ہو سکتا تھا۔۔ لیکن جناب صفائی اور ستھرائی کے سب نخرے صرف آبادیوں اور بستیوں میں ہوتے ہیں۔ کہیں بلند پہاڑوں میں نہیں۔۔ یہاں آپ کو بہت ساری ایسی منافقتیں کرنی پڑتی ہیں جو آپ اپنے گھر میں کریں تو اگلے لمحے بستر پر لوٹ پوٹ ہو کر فوت ہو جائیں۔ لیکن یہاں ان بلند پہاڑوں میں۔۔ کنوار پن سے جنسی سرفنٹا، روزانہ کم از کم آٹھ گھنٹے کی پرمشقت سیر، بے فکری، خوشی اور آزادی آپ کی صحت کی ضامن بن جاتی ہیں۔ محض چند مردہ مکھیاں اور کچھ نمکین ذائقہ آپ کی صحت پر چنداں اثر انداز نہیں ہوتا۔۔ چنانچہ ہم اس دہی کو پی گئے۔ عمیرا کے پی گئے اور لیرا کے پی گئے۔۔ اور یقین کیجیے کہ ہم نے فرانس اور جرمنی میں جراثیم سے پاک حفظان صحت کے اصولوں کے تحت پیک کیا ہوا جو دہی نوش کیا تھا اس میں یہ نشہ اور یہ فرحت نہ تھی۔۔

سلیم نے خوش ہو کر ان بچوں کو مزید ٹافیوں اور کچھ رقوم سے نوازا۔ اتنی دیر میں ان کے لواحقین بھی برآمد ہونے لگے۔۔ باریش۔۔ جوان بھی اور سفید داڑھیوں والے بھی بظاہر کھردرے گوجر۔۔ جو موسم گرما میں اپنے مال مویشی ہانکتے ان بلند اور گھاس بھری چراگاہوں میں آ جاتے ہیں اپنے بال بچوں سمیت اور ان عارضی جھونپڑوں میں گرمیاں گزار کر موسم سرما کی پہلی برفباری سے پہلے پہلے نیچے چلے جاتے ہیں۔۔ نیچے سے مراد وادی نلتر ہے یا پھر ان کے نزدیک نہایت ہی میدانی علاقہ بے ہمت۔۔ وہاں چلے جاتے ہیں۔۔

یہ اُن کے عارضی پڑاؤ تھے۔۔

وادی سوختہ آباد کے داخلے پر بھی ایسے ہی خانہ بدوش گوجروں سے ملاقات ہوئی تھی۔۔ ہم نے ان کی پتھریلی مسجد میں نماز پڑھی تھی۔ ایک اوپن ایئر تالاب میں نہائے تھے اور آگے بڑھ گئے تھے۔۔ نلتر جھیل ٹریک کے دوران میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ گوجر قبیلے کے یہ افراد نہایت ہمدرد اور وحشی دار ہوتے ہیں۔۔ آپ کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں نہ ناراض بلکہ لاتعلق انداز میں ملتے ہیں جیسے آپ بھی انہی کی طرح ایک مویشی چرانے بلند چراگاہوں کی جانب جا رہے ہیں۔۔

گوجر مجھے بھرپور ستے کے لوگ لگے۔۔ اور میں نے انہیں کوڑوں سے پیسے ہتھیانے کے لالچ میں مبتلا نہیں پایا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ دیگر پہاڑی لوگوں کی نسبت کھاتے پیتے بلکہ دودھ دہی اور مکھن کھاتے پیتے لوگ ہوتے ہیں۔۔

ویسے ہم نے تھوڑی دیر انتظار کیا۔ کہ اس کچی لسی بھرے دہی کا نوش کرنے کے بعد اگر پیٹ میں کوئی انقلاب برپا ہوتا ہے تو کہیں ہو جائے۔۔ کچھ روپوش مقام بھی ہیں اور پانی بھی میسر ہے لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ دہی نے ہمیں ہی چین رکھا۔۔ بلکہ ہم پہلے سے کہیں زیادہ فرحت آمیز ہو گئے۔۔

گوجروں کی یہ بستی دریا سے اوپر ایک بلند ڈھلوان پر آباد تھی۔۔ ایک بڑے گلیشیئر کی چھاؤں میں تھی۔۔ ہم اس بستی سے اٹھے اور پھر سے نیچے اترنے لگے اور دوبارہ دریا کے کنارے پر آ گئے۔۔۔ ہم اس شہتیروں والے پل کو پار کر کے اتنی مشقت سے اوپر گوجروں کے جھونپڑوں تک جانے اور پھر سے نیچے اترنے کی بجائے وہیں سے دریا کے کنارے کنارے آگے کیوں نہ چلے گئے۔ صرف اس لیے کہ پورٹر حضرات اس راستے سے اوپر گئے تھے۔۔

دریا کے پار جانے کے لیے۔۔ دوبارہ پار جانے کے لیے جو ایک پل تھا وہ بھی کمال کا پل تھا۔۔ دو شہتیر اور چند ٹہنیاں۔ اور ان پر چلنے کے لیے محض ایک ماہر بازی گر ہونا درکار تھا۔۔

اور ہم تو سب کے سب بازی گر تھے۔۔ کرتب دکھانے والے تھے۔۔ صرف ہمیں دیکھنے والے کوئی تماشائی نہ تھے کہ ہم بلند پہاڑوں کے سرکس میں کرتب دکھاتے تھے۔۔ کوئی ہمیں نہ دیکھتا تھا ہم ایک دوسرے کو دیکھتے تھے کہ واہ میاں صاحب کیا چھلانگ لگائی ہے۔ کیا بات ہے شاہد میاں واخانی ڈالے پر سے کیسے ایسے گزر رہے ہیں جیسے کوئی تنے ہوئے رسے پر چلتا ہے۔ اور تارڑ صاحب آپ کا تو جواب نہیں۔۔ آپ تو پہاڑوں کے سرکس کے جوکر ہیں۔۔ چلتے ہیں تو دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔۔

"تین سیاہ پوش نالے اور پھر.. یاکوں کے غول..
ڈھلوان پر.. ہمارے اوپر گرتے آ رہے ہیں"

اس پل کے پار دریا جو گوجروں کی بستی کے احترام میں ذرا کناروں کے اندر سمٹ گیا تھا پھر سے ایک خوش نظر چراگاہ کے بیچ اطمینان سے بہنے لگا.. اور ہم نے دیکھا کہ اس گھاس بھرے میدانی خطے میں پانیوں کی نزدیکی میں ہمارے ٹینٹ کے شوخ رنگ بکھرے ہوئے ہیں اور پورٹر استراحت فرماتے ہیں اور ابراہیم کے پورٹ سے دھواں اٹھ رہا ہے..

یہ لنچ ہو کیمپ تھی..

ہم ان کے قریب ہوئے تو ابراہیم کو نہایت متحرک پایا.. اس نے ہمارے گھاس پر ڈھیر ہونے سے پہلے ہی اس جگہ کی زرد زرد کر دینے والی ٹھنڈک پوش کی اور پھر ٹھنڈا ناشتہ.. کر کر.. پنیر اور ان کے ساتھ ایسے گرم گرم اور خستہ فرنچ فرائز سرو کیے کہ کیا کسی سیکنڈ ونڈ یا کے ایف سی میں ہوں گے.. اور ظاہر ہے خوشبودار سی کی شکست میں.. اور ان پر مستزاد بھاپ دیتی لپٹیں گرما دینے والی گرم کافی.. اب کسی بھی انسان کو دنیا جہان سے الگ تھلگ ایک بلند وادی میں اور کیا چاہیے تھا.. اس شاہانہ طعام کے بعد ہم ایک برفانی ندی کے کنارے گھاس پر لیٹ گئے بلکہ لم لیٹ گئے اور اونگھنے لگے... کہیں بلند پہاڑوں میں یہ اونگھ بھی کمال کی چیز ہوتی ہے.. آپ نے اپنے جوگرز اتار دیے ہیں اور آپ کے تھکے ہوئے ننگے پاؤں برفانی ندی کی قربت میں کہ ان پر کچھ چھینٹے بھی برستے جا رہے ہیں.. ٹھنڈک سے گدگدائے جا رہے ہیں اور آپ کھانے کی مستی میں مسکرائے جا رہے ہیں اور اونگھے جا رہے ہیں.. آپ کی پنڈلیوں کے پٹھے تھکاوٹ سے پھڑ رہے ہیں اور ان کی اکڑی ہوئی

رگیں درد بھی کرتی ہیں اور استراحت کے خمار میں لطف بھی لیتی ہیں..

اسی پر لطف لنچ سپاٹ میں عمران اور اس کے مغل بچوں نے ہمیں جوائن کر لیا.. وہ ہم سے بات نہ کرتے تھے.. ہم کہتے تھے کہ اچھا تو جھیل پر جب دھوپ چمکی تو وہ کیسی لگی تھی اور وہ کہتے تھے "چھوڑو جی.." ہم جو کچھ پوچھتے وہ ناراض ہو کر کہتے "چھوڑو جی.."

"کیوں چھوڑو جی.." میں نے ذرا تنگ آ کر کہا..

"آپ کو کیا بتائیں کہ آپ نے وہاں نہ پہنچ کر اپنے آپ پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے.. کیا کچھ مس کیا ہے.. اس لیے.. چھوڑو جی" عمران ایک اپنی ہی ترنگ میں تھا.. اس دوپہر کے بعد میں بھی واپس اپنی ترنگ میں چلا گیا..

جب پورٹر پھر سے سامان کو اپنے کندھوں پر بوجھ کرنے لگے.. ابراہیم کو باورچی خانہ سمیٹنا ہے.. اگلا پڑاؤ رفتار کا تھا..

دوبارہ چڑھائی اور جوگر پہننا بہت برا لگا..

ننگے پاؤں جو سرد اور خشک ہوا میں دھن کر رہے تھے پھر سے ڈھکے گئے.. وہ ان کی شب ہم نے پورشانی کی بلند چراگاہ میں پہنچنا تھا..

"ابراہیم.." میں نے مغل اعظم کی مشہور زمانہ "مخلوق" کے انداز میں پکارا..

"جی سر.." وہ اپنے فرائی پان اور دیگچیاں چھوڑ کر حاضر ہو گیا..

"پورشانی کہاں ہے؟"

"وہ سامنے ہے صاحب.." اس نے دریائے شتر کی اس وادی کے بہاؤ کو بالآخر روک دینے والی عظیم چٹانوں اور برفوں کی طرف اشارہ کیا.. "اور وہ ابھی بہت دور نہیں" وہ جہاں ایک سرمئی رنگ کی چٹان ہے اور اس کے دامن میں جو چھوٹا پہاڑ ہے وہ سرخ رنگ کا ہے.. نظر آتا ہے صاحب.. تو اس کے دامن میں ذرا اوپر پورشانی کی گھاس ہے.."

بے شک وہ سرخ رنگ کا پہاڑ یہاں سے نظر آ رہا تھا لیکن محض نظر آنا اس بات کی دلیل نہ تھی کہ ہم شام سے پہلے وہاں پہنچ بھی سکتے ہیں.. پہاڑوں کے فاصلے فریب کے جال ہوتے ہیں..

"چلو چلو ابراہیم شاہ جی چلو.." میاں نے اعلان کیا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر اپنی ٹوپی درست کی "ہونے دو گدلا اور گرد آلود کہاں ہیں؟"

"میاں صاحب وہ تو پیار کے پنچھی ہیں بھٹکتے ہوئے نکل گئے ہیں" نسیم ہنسا..

"تو یہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟"

"میاں صاحب پیار کے پنچھی تو ہمیشہ تنہائی کے تمنائی ہوتے ہیں.."

"اچھا؟" میاں قدرے فکرمند ہو گیا "اوئے پتہ کرو کہیں ان کا ڈیرہ خیمہ ہی الگ نہ ہو.."

ہم چلنے لگے..

دروازے ظفر کا یہ گھاس بھرا میدان اور سپاٹ میدان جلدی ہی ختم ہو گیا اور کنارے اونچے ہو گئے.. ہم بھی ذرا پھسلتے اور کچھ خوفزدہ ہوتے ان کناروں کے ساتھ اونچے ہوتے گئے.. چڑھائی ختم ہوئی تو ایک اور وسیع چراگاہ نظروں کے سامنے پھیلتی گئی جس کے آخر میں مکمل طور پر سلیٹی رنگ کا ایک ویران اور سنسان پہاڑ تھا اور اس کی آغوش میں جو گلیشیئر تھا وہ بھی سرمئی تھا.. گدلی ریت اور کنکروں سے ڈھکا ہوا اور اس میں سے جو گدلا نالہ نکل کر نیچے جا رہا تھا اس کے پانی بھی نیم سیاہ تھے..

پہاڑ.. گلیشیئر اور نالے کے پانی کے رنگ اتنے یکساں تھے کہ وہ مشکل سے الگ الگ دکھائی دیتے تھے.. پانیوں کا بہاؤ بھی سرمئی تھا.. اس منظر کی تصویر میں بس یہی ایک رنگ تھا اور وہ دل میں ایک عجیب بے چینی بھرتا تھا.. اس نالے کو پار کرنے کے لیے ہم چراگاہ سے اوپر اس مقام تک گئے جہاں سلیٹی برف زار میں سے وہ اس رنگ میں رنگا برآمد ہو رہا تھا.. جوں جوں وہ نیچے جا رہا تھا بے لگام اور ناقابلِ عبور ہو رہا تھا.. نالے کے پانی تو سیاہ رنگ کے تھے ہی لیکن اس میں جو پتھر تھے وہ بھی اس کی سیاہی میں ڈوب کر کالک زدہ ہو گئے تھے.. ان پانیوں کو دیکھ کر بدن میں ٹھنڈک کی بجائے ایک سیاہی اترتی تھی..

نالے کے پار جا کر ہم پھر سے نیچے اترنے لگے.. ایک ٹوٹ کر جہاز کی مانند بلندی کم کرنے لگے.. ہم بہت نیچے تک چلے گئے.. آسانی سے نہیں.. ذرا گرتے پڑتے.. اپنے ٹخنے زخمی کرتے نیچے گئے..

اب ہم پر وہ وقت آ چکا تھا جب پہاڑوں میں مسلسل چلنے کی تھکاوٹ اور ایک خوف ہر کوہ نورد کو الگ الگ کر دیتا ہے.. تنہا اور خود غرض کر دیتا ہے.. گفتگو اور دوستی یاری موقوف ہو جاتی ہے اور غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ باقی لوگ تو جائیں بھاڑ میں.. کم از کم میں تو اس بھربھری بلندی سے لڑھکے بنا نیچے اتر جاؤں.. یہ بھی اونچے اور خباثت دیوار نما کنارے تھے جن سے چپک چپک کر ہم

نیچے گئے.. نیچے اترے ہیں.. تو اپنے سامنے اس سیاہ منظر کو دیکھا جسے ہم نے چراگاہ سے دیکھ تو لیا تھا لیکن ایک کبوتر کے مصداق آنکھیں بند کر لی تھیں کہ نہیں.. یہ جو سیاہ پتھروں اور بجری میں بچھے کالے نالے ہیں اور سیاہ آفت متعدد نالے ہیں تو یہ محض ایک منظر ہیں ان کے پار تو ہم نے نہیں جانا.... کسی اور سمت جانا ہو گا ہم نے تو نہیں جانا.. اور اگر جانا بھی ہے تو ان کے آس پاس یقیناً کوئی آسان سا راستہ ہو گا..

نیچے اترے ہیں ان سیاہ آفت نالوں کے شور سے کان بہرے ہوتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ کوئی اور راستہ نہیں ہے..

سامنے ایک بحر اسود ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور تصویر مرگ میں مزید سیاہ رنگ بھرنے کے لیے شام بھی ہو رہی ہے..

اب صورت حال یہ ہے کہ سب حضرات ذاتی طور پر بھیگے ہوئے سلیٹی پتھروں اور بجری پر پھسلتے کرتے ادھر ادھر اس کاوش میں بھٹک رہے ہیں کہ کہیں نہ کہیں تو یہ نالہ مختصر ہو گا.. اس میں چند پتھر ہوں گے جن پر قدم رکھتے ہوئے ہم اسے ناپ جائیں گے.. لیکن آفرین ہے اس نالے پر کہ اس نے اس قسم کی کوئی سہولت نہیں بہم پہنچائی.. جہاں وہ ذرا مختصر ہوتا تھا وہاں اسی حساب سے وہ تیز اور گہرا بھی ہو جاتا تھا.. اور جو پتھر کہیں کہیں تھے وہ اس کی مانند سیاہ تھے اور الگ سے دکھائی نہ دیتے تھے.. چنانچہ ہم نے یہ دلیرانہ فیصلہ کیا کہ اس ناہنجار کو پورٹروں کی مدد سے پار کیا جائے..

یہ نالہ مجھے یاد نہیں کہ کس کس نے کیسے پار کیا.. البتہ میں نے تین چار پورٹروں کے بازوؤں سے جھولتے اور لٹکتے ہوئے پار کیا..

اس کے بعد ایک اور نالہ تھا..

یہ پہلے نالے کے بڑے بھائی لگتے تھے اور غصے میں لگتے تھے.. میں ان کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا.. اسے ہم نے.. یا کم از کم میں نے گدا اللہ ابراہیم کے کندھوں پر سوار ہو کر پار کیا..

میں اس شام کی نالہ کراسنگ کو بہ طریقِ احسن بیان نہیں کر پایا.. بس یوں سمجھ لیجیے کہ ہر جانب ہاہاکار مچی ہوئی تھی.. قیامت کا شور تھا اور شام تھی.. ماں بچے کو تو سنبھالتی تھی صرف گدا.. گروآمیز کو سنبھالتا تھا کہ سائیں کے چہرے پر بھی ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا اور وہ اپنے کیمروں کو بھی بھول چکا تھا..

اب جو تیسری اور آخری آفت سامنے آئی ہے تو وہ قدرے دھیمے مزاج کی تھی اور میں

جو ابراہیم کے کندھوں پر سواری کرنے کے بعد اپنی عزت نفس اور مردانگی کو بُری طرح مجروح کر چکا تھا اسے کچھ بحال کرنے کے لیے بہ نفس نفیس ان کے درمیان ابھرے پتھروں پر اپنے آپ کو بھگوتا.. پھسلاتا اسے عبور کرنے لگا.. مسئلہ یہی تھا کہ پانیوں میں جو پتھر تھے وہ بھی اسی رنگ کے تھے چنانچہ کبھی تو آپ ایک بیچ بیچ کے پتھر پر پاؤں جماتے تھے اور کبھی پانیوں کے کسی ابھار کو پتھر سمجھ لیتے تھے اور گھٹنوں تک پانیوں میں بہے جاتے تھے..

میں نے ایک مرتبہ چترال گائیڈ بکس کو کوسا.. ان حضرات کے خاندانی شجرہ نسب میں کیڑے نکالے جنہوں نے مجھے اطلاع کیا تھا کہ شتر کچھوا ٹریک تو بے حد آسان ہے.. ان تین نالوں کے پار کچھ پتھر تھے.. بڑے بڑے.. ان کے آس پاس بھی پانی بہتا تھا.. ہم نالوں کے شور سے دور ہونے لگے.. شکر کرنے لگے کہ دور ہوتے ہیں اور وہ سرخ ڈھلوان جس کے دامن میں اوزشاہی تھا قریب آنے لگی..

چڑھائی پھر سے شروع ہو گئی..

بائیں جانب یکدم کچھ برف سے ڈھکی چٹانیں اور گلیشیئر قریب آنے لگے اور یہاں ان سیاہ آفت پانیوں کے کناروں پر.. انہیں عبور کرنے کی جان لیوا کوششوں میں جب ہم تھے تو کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو نہ ان سے ڈرے نہ جھجکے نہ ذرہ بھر خوفزدہ ہوئے بلکہ وہ تو قہقہے لگاتے جشن مناتے تھے اور یہ عمران تھا اور اس کے اتل بچے تھے جو کیمرے کاندھے پر لادے.. بیگز یوں کا بوجھ اٹھائے.. نعرے بچاتے.. ایک کو منہ کھولے ان سیاہ عفریتوں کو بے خوفی سے پھلانگتے بندروں کی طرح ان پر سے کودتے.. اُلٹ حجروں کی مانند پانیوں کی قربت میں اچھلتے.. ہم سب کی بے بسی اور خوف کو قلم بند کرنے میں مشغول رہے.. یہ لوگ گنجے چاٹنے والوں میں بھی شمار ہوں گے..

شام میں ڈھلتی شام ہوتی سرمئی ندیوں کی وادی نیچے رہنے لگی اور ہم ہانپتے ہوئے بلند ہونے لگے.. سرخ مٹی کی پہاڑی قریب آ رہی تھی..

اوزشاہی کی چراگاہ کی بس جھلک نظر آنے لگی اور وہاں جو ابھی کچھ دیر پہلے دھبے سے تھے وہ ہولے ہولے حرکت کرنے لگے کہ یہ وہ مویشی تھے جو اس چراگاہ میں عیش کرنے کے لیے آئے تھے.. باہر یہ جشن کرنے کہ یہ گھاس دوبارہ دست.. اور شاید اس لئے وہ بھی سیاہ پانیوں اور سرمئی چٹانوں کی وادی میں سے بلند ہو کر ایک مختصر پگڈنڈی پر ہانپتے ہوئے حرکت کرتے ہوئے دیکھتے تھے اور انہیں حیرت ہوتی ہو گی کہ یہ کیسے مویشی ہیں جو گھاس نہیں چرتے بس کرتے پڑتے

ہماری جانب آتے چلے جاتے ہیں..

کہیں بلند پہاڑوں میں شام بھی یکلخت اترتی ہے.. بلکہ ٹوٹ پڑتی ہے.. ابھی وہ گری نہیں تھی.. اتر رہی تھی.. ہم سب تھکاوٹ کے بوجھ میں خاموش.. کوہ نوردی کے جرم کی سزا بھگتتے ہوئے اس پگڈنڈی پر چلتے جا رہے تھے جب اس شام کے سکوت میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی.. ہمارے پاؤں تلے جو زمین تھی اس میں ایک کپکپاہٹ تھرانے لگی.. جیسے ایک سانپ جان جاتا ہے کہ اس کے نیچے جو زمین ہے اس میں ایک دھمک ہے اور کوئی دشمن آس پاس ہے ایسے ہمارے پاؤں تلے جو زمین تھی وہ کچھ خبر کرتی تھی.. پھر جیسے ایک نومولود زلزلے کے آثار لرزنے لگے.. کچھ پتھر گرے.. جھاڑیوں کے پتے ہلنے لگے اور ہم تھم گئے..

ابراہیم بھی رُک گیا اور ہاتھ آگے کر کے کہنے لگا "صاحب احتیاط کرو.. اوپر سے یاک آ رہا ہے.."

ہم جو احتیاط کے مارے پگڈنڈی سے نظریں نہیں ہٹاتے تھے.. ہم نے نظریں ہٹا کر اوپر بلندی کی جانب اٹھائیں تو اس خوفزدہ ہو نے دیکھا کہ وہاں سے دھول اڑاتے ڈھلوانیں چھوڑتے.. ہماری موجودگی سے بے پرواہ متعدد زلزلے نیچے آ رہے ہیں.. ان میں کوئی تو بھورے رنگ کا تھا.. تو کوئی چتکبرا.. کوئی بالکل سیاہ تو کوئی سراسر سفید.. آپس میں بھڑتے.. درجنوں یاک پھنکارتے بلندی سے نیچے آ رہے تھے اور ہم سب ان کے راستے میں تھے.. یاکوں کا ریوڑ براہ راست ہمیں روندنے کے لیے دھول اڑاتا.. دھوئیں کا تا نیچے آ رہا تھا..

سیدھا ہماری جانب اترتا آ رہا تھا..

اور وہ سرپھرے تھے..

ان کے سموں کی دھمک سیاہ ندیوں کے شور سے کہیں بڑھ کر دہلا دینے والی تھی..

اس لمحے مجھے خیال آیا کہ یہ تو بہت زیادتی ہو گی کہ میں دو گھنٹے کے سفید اور سیاہ پار کر جاؤں.. سیاہ تو پیسر کے آتش گلیشیئر عبور کر جاؤں.. شاہ گوری کو ہاتھ لگا آؤں اور مجھے کچھ نہ ہو اور پھر یہاں اوزشاہی کے قریب ہنستی ندیوں سے بے تکو اترتے ہوئے یاکوں کے نیچے آ کر کچلا جاؤں.. یہ تو بہت زیادتی ہو گی.. سنو لیک کی کسی دراڑ میں گر کر ہلاک ہو جاتا.. کسی حد تک رومینٹک ہوتا لیکن یاکوں تلے آ کر ہلاک ہو جانا تو بہت نامناسب اختتام ہے..

چونکہ فرار کا کوئی راستہ نہ تھا اس لیے ہم سب گم صم کھڑے تھے.. بہت سہے دم بخود

"ہمہ یاراں، ایسی بلندی.. ایسی برفیں.. اور ایسی چراگاہ.. لوئر شاہنی.. سبحان اللہ"

ابر شاہنی ہماری آمد سے آباد ہو گیا تھا۔

یہاں جینے کا سامان تھا..

جہاں ایک ڈھلوان اترتے اترتے ہموار ہوئی تھی.. چند پتھر تھے گھاس میں دھنسے ہوئے.. ایک مختصر چراگاہ تھی.. اور پھر ایک کنارہ بلند ہوتا تھا جس کے عین نیچے ایک گلیشیئر کا وجود اپنی سفید شان اور تمکنت میں ٹھہرا ہوا تھا اور اس گلیشیئر کے پار اس برف کے تنے ہوئے دریا کے دوسری جانب برفوں سے ڈھکے چپ کھڑے.. نہایت مرعوب کرتے پہاڑ تھے جو بے حد ویران تھے..

ہمیں بلند پہاڑوں میں پوشیدہ ایک آشنا مقام مل گیا لگتا تھا..

ہمارے خیمے لگ گئے تھے..

الاؤ روشن ہو رہا تھا..

چولہے میں آگ جل چکی تھی اور اس کی لو میں ابراہیم کا سفید چہرہ دمکتا تھا.. اور سردی تھی.. اور بہت تھی..

چراگاہ میں جب ہم وارد ہوئے.. ابھی ابھی یاکوں کی دہشت میں لرزتے بدن کے ساتھ تو وہاں دو تین آوارہ قسم کی گائیں پھرتی تھیں جنہیں ہم نے شو شو کر کے بھگا دیا تھا کہ تم کہیں اور چلی جاؤ.. تم تو یہاں آتی ہی رہتی ہو.. ہم ادھر کبھی کبھار آتے ہیں.. مسافر ہیں آج ایک شب گزار کر کل چلے جائیں گے.. اور وہ ایسی شریف گائیں تھیں کہ پہلی شو پر انہوں نے ادھر کا رخ

کر لیا جدھر پچھلے دنوں یاک اترے تھے..

میں اپنے خیمے میں جا کر لیٹا ہی تھا.. گو ابھی مکمل طور پر سیدھی نہیں ہوئی تھی اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ گرم پانی میں ڈیٹول کے چند قطرے ڈال کر اپنی رانوں پر آئی ہوئی خراشوں کو اس سے دھولوں.. اور آنکل کی نسبت میں کم زخمی ہوا تھا.. تو ابھی اسی قسم کے ناآسودہ سے حالات تھے جب ابراہیم نے خیمے کے پردے میں سے جھانک کر قدرے ہچکچاہٹ سے کہا "صاحب آپ تھک گیا ہے.. ہم آپ کو دباتا ہے"

"نہیں.."

"نہیں صاحب.. مہمان تھک جائے تو ہم اسے دباتا ہے.. ہمارا فرض ہے.."

"یاک سرائے" کے سفر کے دوران تیمر خان نے بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا تھا.. یہ ایک زمانے میں آداب میزبانی میں شامل تھا کہ اگر ایک مہمان پہاڑوں میں سفر کرتا برفوں کے کناروں پر سے آپ کے جھونپڑے تک پہنچتا ہے تو ظاہر ہے اس کا بدن ٹوٹ رہا ہوگا تو پہلے اسے دبایا جاتا ہے اور پھر خوراک پیش کرنی ہے.. اور یہ دستور اب تک چلا آتا ہے..

پنجاب کے دیہات میں بدن دبانا.. "مٹھی چاپی" کرنا روزمرہ کے معمولات میں شامل تھا.. گھروں میں مہمان آتا تھا تو سب سے پہلے کسی ملازم یا کمی کو اس کی تھکاوٹ اتارنے کے لیے بدن دابنے پر مامور کر دیا جاتا تھا.. بزرگ صاحب کے کندھے دابنے کے لیے کوئی نہ کوئی شخص ہمہ وقت ڈیوٹی پر رہتا تھا.. عمر چوہدری صاحب کے بھی یہی معمولات تھے کہ کوئی ملازم ان کے گوڈے اور کندھے دابنے میں مشغول ہے.. لاہور شہر میں بھی کچھ عرصہ پہلے تک یہ تاریخی روایت تھی کہ پرانی فصیل کے گرد جو باغات ہوا کرتے تھے وہاں ہر شام معززین لنگوٹ باندھ کر اپنے آپ کو دبواتے تھے اور مالش کرواتے تھے.. میری بیگم جو بنیادی طور پر ایک شہری تھی جب شادی کے فوراً بعد میرے گاؤں گئی تو اسے شدید وحشت ہوئی کہ وہاں آتے ہی خواتین ملنے کے لیے آتی تھیں سر پر پیار دے کر مجھے دبانے لگتی تھیں کہ وہ بہت تھک گئی ہوگی اور مجھے تو بڑی شرم آئی تھی.. میرے ابا جی کا بھی ذاتی پالتو نائی تھا کہ گھر دوپہر سے واپس آتے اپنا تحریری پیس سوٹ اتارا.. بنیان اور تہمد زیب تن کر کے پلنگ پر لیٹ گئے اور ہم سارے بہن بھائی جن کا کل وزن ان کی نسبت آدھا بھی نہ تھا ان پر چڑھ کر انہیں دبانے لگے.. اور وہ خوش ہو کر دعائیں دیا کرتے تھے..

اب ہم تمدن یافتہ ہو گئے ہیں اور کسی کو اپنا بدن چھونے تک نہیں دیتے البتہ مساج

کرواتے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے اور فزیوتھراپی کے لیے زرِ کثیر خرچتے ہیں.. تو جب ابراہیم نے
مجھے دبانے کی پیشکش کی تو میں نے ایک دو "نہیں" کے بعد قبول کر لی کیونکہ میرا بدن تو ایسا
تھکا ہوا تھا کہ اسے اگر ٹنی میں بھی دبایا جاتا تو میں اعتراض نہ کرتا..

ابراہیم کی ایکسپرٹ مٹھی چاپی نے مجھے بحال کر دیا.. اگرچہ اس نے پہلے میرے ہاتھوں
کی انگلیوں کو ایک ایک کر کے گرفت میں لیا اور ان میں پٹاخے نکالے پھر پاؤں کو دوہرا کر کے اس
کے کڑاکے نکالے اور پھر کمر پر متعدد گھونسے رسید کر کے مجھے ادھ موا کر دیا لیکن بحال کر دیا.. اب
میں اسے بار بار کہتا ہوں کہ بس ابراہیم کافی ہے اور خواہش یہی ہے کہ یہ بس نہ کرے کہ اس عمل
سے جو راحت حاصل ہو رہی تھی اور جو تھکاوٹ اتر رہی تھی اس کا بیان ممکن نہیں..

"بس ابراہیم.. تھینک یو" میں نے بالآخر دل پر جبر کر کے اسے روک دیا..

"آپ مہمان ہیں صاحب.." وہ کہہ کر خیمے سے نکل گیا..

منتر جمیل کی خیمہ گاہ بڑی نہ تھی بلکہ خاصی خوش نظر تھی لیکن اس نے مجھے یاد دلا دیا تھا کہ وہ
پتھروں اور درختوں میں دم روکے ہوئے تھی.. وہ کچھ چھپی تھی لیکن ہنزہ شاخ کی ان بلندیوں کے تخت
پر براجمان محل برفوں اور آسمان کی قربت میں سانس لیتی آماجگاہ نے مجھے مسحور کر دیا تھا..

بس یہی زندگی تھی..

یا وہی زندگی ہے..

سرد ہوائیں اگرچہ بہت مدھم بے آواز.. لیکن ایسی کہ ان میں ہنزہ شاخ کے پیچھے لیٹے
گلیشیئر کی برف کی کرچیاں گویا ہم تک آتی تھیں اور رخساروں کو چھوتی تھیں.. برف بوسے ہم سے
پیار کرتے تھے.. آوارہ گردی کا خمار تھکے بدن میں کھرا ہوتا تھا.. چڑھتا تھا.. بدنی زوال اور عمر معدوم ہوتی
تھی.. اور.. آپ کو ایک انوکھے راز میں شریک کرتا ہوں جو دراصل میری اول کیمپنگ میں میرے اولین
خیمے میں رچی ہوئی جو مہک تھی.. اور کتنے برس پیشتر؟.. شاید چالیس برس ہونے کو آئے.. تو وہی مہک
آج بھی کتنے زمانوں کے بعد میرے خیمے میں تھی.. اگرچہ رچی ہوئی نہ تھی..

شاہ گوری کی تھی جس کے گورے برف بدن پر تل تھے..

جھیل کرومبر کے پانیوں کی نمی کی تھی..

اس بوٹے کی تھی جو میں نے پچھوا لیکن جڑیں پکڑنے سے پہلے بہہ گیا.. میں اب
اس انوکھے راز کی طرف آتا ہوں.. میں اپنے پڑھنے والوں کے ساتھ ایک غیر معمولی حسی تجربہ شیئر

کرنا چاہتا ہوں.. جیسے ایک طوائف اور ایک شریف زادی کے تجربوں میں فرق ہوتا ہے.. ایک
درویش اور ایک دنیا دار کی حسیات الگ الگ ہوتی ہیں.. جو کچھ ایک بدن ایک ذہن پر بیتتی ہے وہ
کسی دوسرے بدن دوسری روح کے نزدیک نامحسن کی فہرست میں درج ہوتی ہے.. یونہی اسی طرح
ایک آوارہ گرد کے حسی تجربے غیر معمول کے اس حسن میں آتے ہیں جنہیں ایک معمول کی زندگی
گزارنے والا دیوانگی میں شمار کرتا ہے.. مجھ پر ایک ایسا وقت تھا کہ میں جناح باغ لاہور میں ایک
باقاعدہ زندگی ہو یا خیر بارش ہو.. طوفان ہو دھند ہو کر جڑوں سے اکھاڑ رہا ہو.. پھر بھی ایک باقاعدہ
اور خشک قسم کا سیر یا ہوا کرتا تھا.. صبح کی اس روزانہ سیر کے دوران ایک وکیل صاحب سے ملاقات
ہوا کرتی تھی جو یوگا پر دسترس رکھتے تھے.. چلتے پھرتے بالکل نہیں تھے ایک ہی مقام پر الٹے سیدھے
ہو کر سر کے بل کھڑے ہو کر اور آسن جما کر فارغ ہو جاتے تھے.. اور بے حد فٹ تھے.. میں بچہ
نہیں بلکہ میں ان کا شریف ہوں لیکن میرے بدن میں اور دماغ میں وہ تمامیت اور چپ چپاتا ہو گئی جو
یوگا کا خاصا ہے پھر بھی کچھ پانچ کم سیکھ لیں.. ایک دو آسن سیکھ لیے.. کچھ گر وصل کر لیے.. ان میں
سے صرف ایک نے میرا ساتھ دیا.. وہ یہ کہ سیر کے بعد جب آپ کا بدن تھکا ہوا ہوتا تھا.. اگرچہ
ایک پھول کی مانند تازگی میں چہلاتا بھی تھا تو آپ گھاس پر پاؤں رکھ کر اپنا سانس اندر کو کھینچتے
ہوئے اپنے سر کو آہستہ آہستہ جہاں تک ہو سکے پیچھے لے جاتے ہیں اور پھر دم روکے وہیں ٹھہر
جاتے ہیں جب تک آسانی سے اس حالت میں رہ سکتے ہیں رہتے ہیں اور جب چہرہ سرخ ہونے لگ
آتا ہے.. سانس سہارا نہیں جا سکتا تو آپ دھیرے دھیرے اس سانس کو خارج کرتے ہوئے
سیدھے ہو جاتے ہیں.. سیدھے ہونے پر ایک تو آپ بری طرح لڑکھڑا جاتے ہیں جیسے نشے میں
بے اختیار ہوں اور اسی لیے یہ ورزش کسی پیچ یا پتھریلی سطح کے قریب نہیں کریں تاکہ گر جانے کی
صورت میں زخمی نہ ہوں.. تو جونہی آپ لڑکھڑا کر سیدھے ہوتے اپنے آپ کو سنبھالتے ہیں تو ایک
تبدیلی ظہور پذیر ہوتی ہے آپ کے دماغ کی کئی الجھی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں جو مدت سے بند پڑی
زنگ آلود ہو چکی تھیں.. حیرت انگیز طور پر آپ کی بینائی بڑھ جاتی ہے.. نظر تیز ہو جاتی ہے اور وہ
اشیا وہ آوازیں آف فوکس تھیں فوکس میں آجاتی ہیں.. گھاس کا ہر تنکا.. ہر مہک.. اور اس پر اوس
کی ہر بوند ایک ہیرے کی مانند ٹکی اور اس ہیرے میں جو ننھی کرنیں ہیں وہ بھی الگ الگ..
اگر اس لمحے کوئی پرندہ نظر کے سامنے سے گزرتا ہے تو وہ اتنے سلو موشن میں گزرتا ہے کہ اس کے پر
بھی گنے جا سکتے ہیں.. ایک عجیب سی سنسنی بدن میں تیر جاتی ہے.. لیکن یہ سب کچھ پل دو پل کا

تکمیل ہوتا ہے.. ایک دوبارہ آنکھیں جھپکنے کی دیر ہے کہ زائل ہو جاتا ہے.. وکیل صاحب کو ہدایت تھی کہ ان چند لمحوں میں آپ جو کچھ بھی اپنے خیال میں لے آئیں مکمل توجہ کے ساتھ.. جس چہرے یا جس منظر کو ذہن میں لائیں تو وہ مجسم ہو کر آپ کے حواس پر اثر انداز ہونے لگے گا.. تو ان دنوں ایک بار جب میں اس یوگا ورزش کے بعد سانس کو آہستہ آہستہ خارج کرتے سیدھا کھڑا ہوا.. قدرے چکرایا تو یکدم جیسے میچیل کیمپنگ سے نیچے آتے ہوئے دریائے رودون کے اوپر جو راستہ تھا جس کے کناروں پر درختوں کی ٹہنیوں کی ایک خاردار باڑ تھی اور اس باڑ سے لگ کر.. میری جانب چہرہ کئے رتھ کھڑی ہوئی تھی اور میں اسے دریا کے سرد پس منظر میں دیکھ پاتا تھا تو وہ ایک لمحہ یوں زندہ ہوا کہ ان چند ساعتوں میں نہ صرف میں دریائے رودون کا شور سن رہا تھا بلکہ رتھ کے گلے میں جو لاکٹ تھا اور جیسے وہ اس کے بدنی ابھار پر ادھر ادھر ہوتا تھا اس کے سانس لینے سے اسے دیکھتا تھا اور حیرت در حیرت کہ اس روز.. پچیس برس پیشتر اس کے بدن پر جو سینٹ لگا تھا اس کی مہک بھی واضح طور پر میرے نتھنوں میں آ گئی تھی.. اب میں نہیں جانتا کہ یہ محض میرے تصور کا کرشمہ تھا.. کوئی شعبدہ بازی تھی یا کیا تھا لیکن ایسا ہوا.. اگر یہ صرف تصور کی شعبدہ بازی تھی تو یہ بھی جنم لیتی تھی جب میں یوگا کی وہ ورزش کرتا تھا.. میں اب بھی سیر کے بعد یہی عمل کرتا ہوں..

میرے سیر کے ساتھی مجھے ہر صبح شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جب میں سانس خارج کرتے ہوئے سیدھا ہوتا ہوں اور مسکرانے لگتا ہوں اور آمد آفتاب سے پہلے کے سرخ ہوتے آسمان میں سے گزرتے کسی پرندے کو دیکھتا ہوں اور نہ صرف ماضی کو یاد کرتا ہوں بلکہ اپنے لیے.. اپنے بچوں کے لیے اور اپنے پیاروں کے لیے ہاتھ جوڑ کر دعائیں بھی کرتا ہوں اور جب میرے دوست پوچھتے ہیں کہ چوہدری صاحب یہ آپ سورج دیوتا کی پرستش کر رہے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ ہاں چند لمحوں کے لیے ہر شخص وقتی طور پر ایک اہم ہو جاتا ہے.. تو اس شب.. اور شادی کی نامعلوم بلند برفانی چراگاہوں میں.. اپنے خیمے میں.. واضح طور پر شہد گوری کے بدن کی مہک میرے نتھنوں کو بہکا رہی تھی.. اور وہ کبھی میری انگلیوں کی پوروں میں سے چھوتی تھی اور میں انہیں ناک سے لگا کر اس کی موجودگی محسوس کرتا تھا.. اور کبھی ایسا لگتا تھا کہ شہد گوری کا وجود میرے بدن کی گرمی سے پگھلنے میں چلا ہے.. اور وہ سرد نہیں بلکہ نیم گرم اور مہک زدہ ہو کر میرے سر سے پاؤں تک ٹپک ٹپک کر گرتے ہیں..

یہ سب کچھ اور شادی میں.. کہیں بلند برفوں کے دامن میں میرے خیمے میں ہو رہا تھا.

برفوں پہلے جو ہوتے میرے وجود پر اترے تھے وہ میرے بدن کی نمی کو پگھلا کر بہتے تھے اور سوکھی پیاسی مٹی پر برسنے والی بارش کی پہلی بوند کی مانند مجھے مہکا رہے تھے.. اور اس لمحے ایک زبردست دستک کا احساس ہوا..

سلیم والٹ تھا.. بے دریغ اور بے تکلف مجھ سے اجازت طلب کئے بغیر میرے خیمے میں داخل ہو آیا..

اور میں اپنے ہی وہم اور اپنے ہی خیالوں میں تھا تو میں نے نہایت ناگواری سے کہا "جی فرمائیے"

"فرمائیے کیا؟" وہ ٹھٹک گیا.

"آپ کس سلسلے میں بغیر دستک دیے ہوئے میرے خیمے میں چلے آ رہے ہیں؟"

"چلا جاتا ہوں" اس نے فطری طور پر برا مانے بغیر جواب دیا اور جانے کو ہوا..

"سوری.." میں نے معذرت کی.. "لیکن خیریت ہے؟ کس سلسلے میں آئے تھے؟"

"ایسے میں تو اسی سلسلے میں آیا تھا کہ یہ خیمہ میرا ہے.. آپ کہتے ہیں تو چلا جاتا ہوں.. نو پرابلم"

اور میں فوری طور پر وہم و گمان کی وادیوں میں سے نکل آیا اور نہایت خجل اور شرمندہ ہوا.. دراصل اس ٹریک کے لیے میں اپنا "پاک میراث" خیمہ جو کہ نیا خرید لایا تو تھا لیکن اس کی ایستادگی میں جو پیچیدگیاں تھیں اور پھر اس میں الٹے پاؤں اپنی پشت کی مالش کرتے ہوئے اس میں داخل ہونے کی جو شرمندگیاں تھیں انہیں مدنظر رکھتے ہوئے میں نے سلیم سے درخواست کی تھی کہ وہ اس ٹریک کے دوران مجھے اپنے قدرے کشادہ اور گھر جیسے خیمے میں فروکش کر لیا کرے.

خیمہ اسی کا تھا اور میں پوچھ رہا تھا کہ تم کس سلسلے میں یہاں آئے ہو..

"سوری پلیز.. میں ذرا تھکاوٹ سے نڈھال تھا اور خواب و خیال کی وادیوں میں بھٹک رہا تھا.. تمہارا اپنا خیمہ ہے.. چلے آؤ.."

"سر مجھے شرمندہ تو نہ کریں" وہ حقیقتاً شرمندہ ہونے لگا "میں چلا جاتا ہوں.."

"بیٹھ جاؤ.."

"بیٹھ گیا سر.." وہ مسکراتا ہوا.. میری ذرا سی خفگی کو سمجھتا ہوا.. مسکراتا ہوا بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی نہایت سنجیدہ ہو گیا اور پوچھا "عشق کیا ہے سر؟"

"میں ابھی وہیں تھا جہاں عشق ہے۔"

"اور اب کہاں ہے؟"

"اب وہاں نہیں ہے جہاں تھا۔ تمہاری آمد سے اس کی لُٹیا ڈوب گئی ہے۔"

"اگر میرے جانے سے عشق کی لُٹیا تیر سکتی ہے تو میں چلا جاتا ہوں"

"بیٹھے رہو۔" میں اس کے لاڈ پر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ "کیا خبریں ہیں؟"

"خیریت ہے کہ مجھ تک یہ اطلاع پہنچی ہے کہ ندیوں اور جھیلوں کا پانی آپ کو موافق نہیں آیا۔ آپ کے پیٹ میں گڑگڑ ہوتی ہے۔ معدہ اسے قبول نہیں کرتا تو میں اپنے ساتھ اسلام آباد سے منرل واٹر کی چند بوتلیں لے کر آیا ہوں۔ میں وہ پیش کر سکتا ہوں۔ کیا آپ پسند فرمائیں گے؟"

"مجھے منرل واٹر بصد شوق سے پسند ہے۔ خاص طور پر کسی بلند پہاڑوں میں پیش کیا جائے"

سلیم نے پیش کر دیا۔

اس شام سے منرل واٹر کی تاثیر بھی الگ تھی۔ اس پانی نے اپنی میدانی خصلت ترک کر دی تھی اور بلندی کی وجہ سے یہاں آ کر کچھ کچھ پہاڑی ہو گیا تھا۔

جیسے بلندی پر پی جانے والی لسی۔ ریک سرائے کے راستے میں... شفری میدو کے راستے میں... پھیکی سی ہوتی ہے اور جب اسے میدانوں میں لاہور کے راول پارک کے بھاری پہلوان کی دکان کے باہر کھڑے ہو کر پیا جاتا ہے تو اس میں مزا آ جاتا ہے۔

"میں نے کہا پہلوان جی... یہاں کیا گڑبڑ ہو رہی ہے" میاں صاحب بھی وارد ہو گئے اور ہم سے اجازت لیے بغیر ایک کونے میں فروکش ہو گئے۔

ان کی غیر متوقع آمد سے خیمے میں شاہد گوری کی جتنی بھی جھجک باقی تھی وہ بھی فی الفور کافور ہو گئی۔

میاں صاحب بھی ایک ہی پرشتکی تھے کہ یا تو وہ روٹھے تھے اور یا شاد ہو گئے... وہ صرف فروکش ہو گئے بلکہ بولنے بھی لگے "تارڑ صاحب... جناب کیا چیز جنگ کھچنگ ساتھ ہے۔ آپ نے تو کچھ دیکھی نہیں۔ آتے ہی خیمے میں گھس گئے ہیں اور تب سے اپنی رضائی کو نیچے سے پکڑ رہے ہیں اور خراشوں پر پٹرول لگا رہے ہیں۔ یا اوپر سے کسی چاپلی کر رہے ہیں۔ باہر آ کر دیکھیں تو سہی کیا نظارے ہیں۔"

"کیا نظارے ہیں۔ آپ بیان کر دیں۔ رنگ میں بھنگ ڈالنے میں آپ کا جواب نہیں

تو آپ بتا دیں کہ باہر کیا نظارے ہیں۔"

"جناب عالی... یوں سمجھیں کہ ہم ایک بلند برف بھرے اور پھولوں بھرے تخت پر براجمان ہیں۔ ذرا اوپر دیکھو تو برفیں ہی برفیں... اور اس خیمے سے باہر آ کر دیکھو تو پیچھے یہ نانگا پربت گھمبیر ہے۔ ایسا گھمبیر ہے کہ اسے دیکھتے ہوئے ڈر سے روح آتش ہوتی ہے... اور اس کے پیچھے جو پہاڑ ہیں تو گویا برف کے انبار ہیں۔ ویسے یہاں آپ اور شمیم کیا گڑبڑ کر رہے ہیں۔ کیا کھا پی رہے ہیں؟"

"ہم منرل واٹر پی رہے ہیں۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

اتنی دیر میں شاہد کا سفید چہرہ مسکراہٹ بھی زہرہ تی خیمے کے اندر داخل ہو گیا... وہ خود تو داخل نہ ہوا صرف ایک ہیٹ اور سیاہ چشمہ اندر آیا۔ "اجازت ہے؟"

"تشریف لے آئیے"

"ویسے میں آپ حضرات کو ڈسٹرب تو نہیں کر رہا۔"

"کر بھی رہے ہوں تو کون پرواہ کرتا ہے۔ آپ آ جائیے"

"ویسے اگر کوئی پرائیویٹ کا مسودا ہے تو میں چلا جاتا ہوں"

"نہیں نہیں شاہد بھائی آپ تشریف لے آئیں۔" سلیم نے بھی درخواست کی۔

"نہیں اگر آپ کہتے ہیں تو... میں تو آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔" اس کا سفید ہیٹ اور سیاہ چشمہ وہیں معلق رہا۔

"اوئے شاہد... تو سیدھی طرح اندر آتا ہے کہ میں تجھے ایک گھسن پھیروں..." میاں صاحب کی طاقت برداشت جواب دے گئی۔

"میاں صاحب تشدد کرنے کی کیا ضرورت ہے میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ بندہ اجازت ہے۔"

شاہد بھی ایک کونے میں سمٹ گیا۔

کچھ دیر ہم چپ بیٹھے رہے۔ گفتگو کا تانا بانا بکھر گیا تھا۔ اس خاموشی کے دوران خیمے کے باہر سے ایک شرمیلی سی سہمی ہوئی آواز آئی "سر جی میں بھی اندر آ جاؤں... یہاں اکیلا ہو گیا ہوں۔" یہ حسن صاحب تھے۔

کورم پورا ہو گیا۔

اونچی سپٹنکل پیک نہیں کا فقط چوٹی دکھائی دے رہی تھی بلکہ ہمارے سامنے 5887 میٹر بلند شاہی چوٹی بھی اپنے سفید جوبن کے اُبھاروں کے ساتھ کھڑی تھی.. میرے جو بن کو دیکھو اُبھار یجان.. بقول جوش.. اور اُبھار جو بدن کے ہوتے ہیں عام اور قدرتی حالات میں دو ہوتے ہیں یہاں تین تھے.... تین سروں والی شاہی چوٹی.. تین گنبدوں کے اُبھار والی شاہی آسمانوں کے سامنے سینہ تانے کھڑی تھی اور اس کے سفید برفیلے جوبن کا جواب نہ تھا.. اس کے برابر میں دو جڑواں چوٹیاں تھیں جنہیں جڑواں بہنیں یا ٹوئن پیک کہا جاتا تھا.. ان کی بلندی میں بس اتنا ہی فرق تھا جتنا کہ جڑواں بچوں کی پیدائش میں ہوتا ہے.. یعنی ایک جو پہلے پیدا ہوئی تھی 5798 میٹر اونچی تھی اور دوسری 5700 میٹر کی تھی.. یہ سات سو میٹر کا فرق اُن کی پیدائش میں دیر ہونے کا تھا..

یہ اوبر شاہی کا شاہانہ منظر تھا..

ویسے اس اوبر شاہی کی ساری شہنشاہیت اور جاذبیت اور بلند بے نیاز تنہائی کی جاذبیت دراصل ہم سے تھی..

ہم اپنے اپنے شہروں میں.. اپنے روزمرہ کے کاموں میں اُلجھے ہوئے وہاں بھی اسی تنہائی اور جاذبیت کو اپنے اندر پوشیدہ رکھے دبائے ہوئے زندگی کرتے ہیں اور اس کیفیت کو ایک مختصر فاصلے کی مانند دنیا بھر سے چھپائے ہوئے رہتے ہیں..

اور یہ کیفیت یہاں اوبر شاہی میں اس پوشیدگی سے باہر آ گئی تھی..

یہ ہم ہی تھے جو اس بلند چراگاہ کی خیمہ گاہ کو حسن دیتے تھے ورنہ دیکھا جائے تو اوبر شاہی کیا تھی..

چند پتھر.. تھوڑی سی گھاس اور ایک ویران بلندی..

شاہی پیک کے تین سفید گنبدوں کے اُبھاروں میں جو ناآسودگی تھی اُسے ہم نے اپنی آنکھوں سے آسودہ کیا..

تو یہ صرف ہم تھے جو آج کی شب اس چراگاہی خیمہ گاہ کو زندگی.. رونق اور خوبصورتی عطا کرتے تھے..

ہم نے کل سویرے یہاں سے کوچ کر جانا تھا اور ہمارے بعد اس نے پھر سے بے آباد اور ویران ہو جانا تھا..

تو یہ صرف ہم تھے..

"شاہی پیک کی تین چوٹیوں سے اُترتی برف کا آبشار.. ایک ایولانچ"

تین سروں والی شاہی پیک ایک ترشول کی مانند شفاف گہرے سمندر نیلاہٹ آسمان میں خاموش کھڑی تھی.. ایک چُپ سکوت میں تھی.. اور میں نیچے گلیشیئر کے پار ایک رنگ و بو سے بھری.. گل و گلزار ہوتی ڈھلوان میں چلتے دیکھتی تھی جب اس کی دو چوٹیوں کے درمیان جو برفوں کا بوجھ تھا اور جانے کب سے تھا اپنے آپ کو مزید سہار نہ سکا اور شفاف گہرے سمندر نیلاہٹ آسمان کے گنبد میں ایک مانوس گونج کے ساتھ وہ برفوں کا بوجھ ایک سفید آبشار کی مانند نیچے گرنے لگا..

اس کی گڑگڑاہٹ اور مسلسل گونج سے پوری وادی لرز نے لگی..

ہم سب.. چلتے چلتے.. جہاں کہیں بھی تھے رک گئے اور اپنے اپنے مقام پر.. دم بخود اس برفانی آبشار کی دودھ سفیدی اور بار یک پھوار کو نیچے گرتے دیکھنے لگے.. برف کا انبار دونوں چوٹیوں کے درمیان میں سے جہاں ایک خاص مقام پر پہنچ کر ایک آبشار کی صورت گرتا چلا جاتا تھا اور پھر ایک برف زار پر گر کر اس کی برفوں کو بھی اپنے آپ میں شامل کر کے ایک سفید غبار اٹھاتا نیچے گلیشیئر تک اترتا جاتا تھا.. یہ آبشار مسلسل تھی اور تھمنے میں نہ آتی تھی.. لگتا تھا کہ شاہی پیک کی تینوں چوٹیوں پر ازل سے جو برفیں سکوت میں تھیں وہ سب کی سب اسی لمحے کی منتظر تھیں اور اب اس سفید آبشار نے تب تک گرتے جانا تھا جب تک کہ یہ تینوں چوٹیاں ننگی نہیں ہو جاتیں.. وہ برہنہ اور چٹیل ایسے ہو جائیں گی جیسے کبھی برف سے وہ آشنا نہ ہوئی تھیں..

برفیں ایک مسلسل سفید دھند کی صورت گرتی جا رہی تھیں اور ہم دم بخود سے انہیں دیکھتے

جا رہے تھے.. آج کا دن... یہ ایک ایسا شگفتہ شفاف دن تھا جس کی آرزو ہر کوہ نورد کرتا ہے.. راستہ ایسا رنگ رنگ کے پھولوں سے آراستہ.. جس پر چلنے کی خواہش ہر آوارہ گرد کے دل میں کسک بھرتی ہے..

جس بلند ڈھلوان پر ہم چل رہے تھے وہ اوزشاہ جنی کی خیمہ گاہ کے تسلسل میں تھی اور یہاں بھی گلیشیر اور اس ڈھلوان کے درمیان میں ایک تنگ وادی تھی جس کے اونچے کناروں کے دوسری جانب گلیشیر کا پھیلاؤ بچھڑ رہا تھا اور اس کے پار وہی دیدہ زیب برف بھری بلند چوٹیاں تھیں جن کا تذکرہ میں کر چکا ہوں.. آسمانی درجوں پر اوزشاہ جنی پیک پر سے ایک ایولانچ اتر رہا تھا.. ایک برف پھوارا آبشار کر رہی تھی..

یہ ایک ایسا ہی دن تھا..

اور تب ہم جان گئے تھے کہ یہ ہمارے ٹریک کا سب سے دل فریب راستہ اور بدن سے آلام اور دکھوں کی سیاہ کائی اتار دینے والا دن ہے.. آج صبح اوزشاہ جنی کی ڈھلوانوں پر ہم نے دیکھا کہ یاکوں کے ریوڑ اوپر بلند چراگاہوں کی جانب اپنا سفر شروع کر چکے تھے... وہ سفید اور سیاہ دھبوں کی صورت جھاڑیوں اور گھاس میں ڈولتے ہوئے اوپر اٹھتے جاتے تھے.. ان کے سموں میں سے ہلکی دھول اٹھتی تھی جو چوٹیوں سے اترتی صبح کی دھند سے ملاپ کرنے کو اوپر اٹھتی تھی..

انہی یاکوں نے ہر شام ان ڈھلوانوں پر سے لوٹنا تھا لیکن اپنے راستے میں ان کوہ نوردوں کو نہیں پانا تھا جو خیمے سمیٹ کر کوچ کر گئے ہوتے..

اوزشاہ جنی کی یہ چراگاہ جس میں ہم نے خیمے نصب کیے تھے کچھ کچھ ہسپر گلیشیر کے کناروں پر موجود ہریالی بھرے پیالہ نما جزیروں سے مشابہ تھی.. شاید یہ ان جیسا ہی حسن بے مثال رکھتی ہو لیکن انسان کی بڑی معصیت ہوتی ہے... یہ آنکھوں کے سامنے کی حقیقت نہیں دیکھ سکتا.. گزرے زمانوں کے خوابوں میں گرفتار رہتا ہے.. اس کی یادداشت میں جو کچھ چلا جائے وہ ضرب المثل لگتا ہے کہ بہت پیچھے منظروں اور چہروں میں جدائی کے برسوں کے رنج اور انہیں پھر سے دیکھنے کی تمنا شامل ہوتی ہے.. اوزشاہ جنی ممکن ہے کہ ہسپر کی خیمہ گاہوں سے کمتر ہو لیکن یہ ایک برف تنہائی کے سکوت میں ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جانے والی جگہ نہ تھی جہاں صرف اور صرف آپ کے سانس چلتے ہیں اور آپ کے قدموں کی چاپ ہے اور کچھ نہیں.. کئی دنوں کی مسافت پر کچھ نہیں اور انسان بہت پیچھے رہ گیا ہے اور گھر بہت آگے کہیں ہے.. اور آپ کہیں

ہیں؟ کہیں بھی نہیں.. اوپر آسمان اور نیچے برف اور آپ چلتے چلتے جانور ہو جاتے ہیں.. بھیڑیے اور مارخور ہو جاتے ہیں.. یہ ایسی تنہائی تھی..

ڈھلوان بے نشان نہ تھی.. اس پر یاکوں نے راستے بنا رکھے تھے اور ہم ان کے نقش قدم پر قدم رکھتے چلتے تھے.. قافلہ ہائے رنگ و بو میں سے گزرتے چلتے تھے... نیچے گہرائی میں گلیشیر کے کنارے کی اوٹ میں گوجروں کا ایک جھونپڑا تھا جس میں سے ایک سرخ دھبہ گوجر گرل سرخ لباس میں نکلی اور بلند کنارے پر چڑھنے لگی.. ہم تو اسے دیکھ رہے تھے لیکن اس کے لیے ہمیں دیکھنا ممکن نہ تھا کیونکہ ہم گھاس اور پھولوں میں اوجھل ایک پگڈنڈی میں اوجھل تھے..

اور یہی وہ مقام تھا جب ہم ٹریک کی تمام تر دشواریاں بھلا دیتے.. پوٹروں کے دنگا فساد کو فراموش کرتے.. ندیوں کے راستے میں پڑتے نالے کو پار کرتے اور نہ ہمیں روند دینے والے یاکوں سے شکایت کرتے یہاں تک کہ گلا اور کرد امیر کے ناروا سلوک کو بھی فراموش کرتے کل دنیا کے لیے امن و آشتی اور محبت کے جذبات رکھتے چل رہے تھے جب ہماری نظروں کے سامنے شاہ جنی پیک میں سے ایک گہری گونج کے ساتھ جنم لیتے ایولانچ نے ہمارے قدم روک لیے.. اور ہم جہاں کہاں تھے رک گئے.. دم بخود اسے تکنے لگے..

کرد امیر اپنے متعدد تھیلوں کی پھولا پھالی کر رہا تھا جن میں اس کے آلات کیمرہ وغیرہ بند تھے.. اور وہ ایک لمبے لکڑی نما قدرے فرش کے تلے نیلی لینز کو اپنے کیمرے کے منہ میں ٹھسیڑ کر اس ایولانچ کی تصویریں اتارنے کو تھا..

عمران ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں دم بخود کیمرہ آن کیے بیٹھا تھا اور اس کے بچے بھی سانس نہیں لے رہے تھے..

یہ ہمارا پہلا ایولانچ نہیں تھا..

لیکن برف کے یکدم گرنے اور گونج مچانے کا ہر منظر اپنے اندر وہ سحر رکھتا ہے کہ پہلا ہی لگتا ہے..

ہم نے یہ ایولانچ کہاں کہاں نہیں دیکھے تھے..

اور جب بھی دیکھے تھے ان کی گونج.. سفید گرد اور ان کی پرشکوہ سفید آبشاری کیفیت نے ہمیں گرفت میں لے کر دم بخود کر دیا تھا.. جیسے ہم انہیں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہے ہوں.. یہاں کیمپ اور اس کے دوسری جانب وادی کو دیل کے پار تاپ میدان میں گرتے نانگا پربت کے برفانی

ہم پھر رُک گئے..

یہ یقین سے ماورا ایک ایسا میدان تھا جو کوہ قاف میں بچھا تھا.. وادی سے اوپر برفوں کے سائے میں یہ ہرا بھرا تخت کسی نا آسودہ جن نے اپنی محبوبہ کے وصل کے لیے بچھا رکھا تھا..

یہ میدان خالی نہ تھا..

اس میں گھوڑوں کے [illegible] تھے.. یاکوں کے چند کھلونے تھے جب کبھی کوئی گھوڑا گھاس سے سر اٹھاتا تو پھر شک ہوتا کہ نہیں یہ کھلونا تو نہیں اس میں جان ہے اور یہ سچ مچ کا گھوڑا ہے جو دوری کے باعث کھلونا لگ رہا ہے.. اس دوری نے انہیں کسی مغل منی ایچر میں شکار کے منظر کے مختصر گھوڑے بنا دیا تھا.. اوپر برفیں تھیں اور ان کے دامن میں یہ ہریاول نظر میدان نظر کا دھوکہ تھا اور اس کی ہری سمندر گھاس میں بہت دور.. کچھ گھوڑے تھے.. چند یاک تھے..

ٹلتر پچھورا ٹریک اتنا بھی معمولی اور بے رونق نہیں تھا جتنا ہم نے سمجھ لیا تھا.. اگر اس راستے میں صرف اسی میدان کا دھبہ کے باز منظر ہوتا تو بھی ادھر سے گزرنا جائز ٹھہرتا..

گلگت میں اکرام بیگ کی ایک تصویری البم میں اسی میدان کی ایک تصویر میں نے دیکھی تھی.. خیموں سے آراستہ اس میدان کے پس منظر میں برف کی دیواریں تھیں اور اس نے بتایا تھا کہ آپ ایک رات یہاں بسر کریں گے.. میں اس تصویر کو بھول چکا تھا اور اب وہ یکلخت میرے سامنے آ گئی تھی..

ازابیل شا، جس نے پاکستانیوں کو پاکستان کے راستے دکھائے ہیں لکھتی ہے..

"آپ شاہی گلیشیئر کے بلند کناروں پر چلتے ہوئے تین گھنٹوں میں ایرشاہی میں پہنچتے ہیں.. ڈھلوان چراگاہوں کا ایک وسیع میدان جس میں گڈریوں کے چند بے آباد جھونپڑے ہیں.. وہاں تک پہنچنے کے لیے آپ ڈھلوان سے نیچے اترتے ہیں.. ایک ندی کو عبور کرتے ہیں اور وہاں سے سیدھا ایک عمودی بلندی پر ایک بل کھاتے راستے پر چڑھنے لگتے ہیں جہاں پھول تمہارے گھٹنوں تک آتے ہیں اور بالآخر ایک ایسے میدان میں قدم رکھتے ہیں جہاں یاکوں کے ریوڑ اور گھوڑے چرتے ہیں.. آپ کہیں بھی کیمپ کر سکتے ہیں.. وہاں شفاف ندیاں ہیں اور برف کے مجسم ستون آپ کے عین اوپر معلق ہوتے ہیں.. یہ میدان تقریباً تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے.."

"ابراہیم.."

وہ بہت آگے جا چکا تھا.. لیکن میرے پکارنے پر واپس ہوا اور لڑھکتا سنبھلتا مجھ تک پہنچا

گیا اور بریک لگا کر بولا "جی صاحب.."

"وہ پہاڑوں کے نیچے جو میدان دکھائی دے رہا ہے.. جہاں یاک اور گھوڑے چرتے ہیں.."

"جی صاحب.. ایرشاہی ہے"

"رات ادھر کریں گے ناں؟"

"نہیں صاحب.. آگے جائیں گے"

"آگے کہاں؟"

"درہ ٹلتر کے نیچے جو اس کا بیس کیمپ ہے وہاں تک پہنچیں گے جناب اور وہاں رات کریں گے.."

"لیکن ٹریکنگ کی تمام کتابوں میں یہی درج ہے کہ رات ایرشاہی کے اس میدان میں کی جاتی ہے تو ہم کیوں نہیں کرتے.."

"صاحب ایسا ہی ہوتا ہے.. اور ہمیں کوئی اعتراض نہیں.. آپ لوگ کتابوں کے مطابق نہیں چلتا.. بہت سوچ سوچ کر چلتا ہے.. تصویریں اتارتا ہے.. فلم بناتا ہے.. تو اگر ہم ایرشاہی میں وقت کرتا ہے تو کل سویرے آپ ٹلتر ٹاپ کے بیس کیمپ تک پہنچے گا تو کم از کم تین گھنٹے لگے گا.. وہاں سے ٹاپ کو پار کر کے جب ہم سرخ پتھر کیمپ تک پہنچے گا تو آپ کی رفتار سے آدھی رات ہو جائے گا.. اور ادھر رات اچھا نہیں ہے.. بہت ٹھنڈا اور اونچا ہے رات کے ٹائم گلیشیئر میں گر جائے گا.."

"نہیں ابراہیم.. ہم کل بہت تیز تیز چلے گا.. کوئی ریسٹ نہیں کرے گا لیکن رات اسی میدان میں کرے گا جس میں یاک اور گھوڑا چرتا ہے.."

"ٹھیک ہے صاحب.. ہمیں کوئی اعتراض نہیں.. یہ تو قریب ہے.. ہم ابھی ادھر جا کرے گا.. لیکن پھر ٹریک میں ایک اور دن لگے گا.. رات کو نہیں چلے گا اور ایک اور دن کا مزدوری بھی بڑھ جائے گا کیا کہتا ہے کہ پھر چلے؟"

مجھے تو مزدوری بھی منظور تھی..

لیکن کوہ نوردی میں فوری جذبات اور خواہشوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا.. میں نے جیپ ڈرائیوروں کو پورے پانچ روز بعد وادی شگوٹن کے گاؤں پچھورا میں پہنچ جانے کے لیے کہہ رکھا تھا.. انہوں نے وہاں پہنچنا تھا اور ہمیں وہاں موجود نہ پا کر واپس گلگت چلے جانا تھا.. ہم اگر ایک روز کی تاخیر سے پہنچتے تو اگلے روز کسی اور سواری کا بندوبست بھی ہو سکتا تھا.. لیکن ہم نے

ڈرائیوروں کو کچھ رقم پیشگی بھی ادا کر دی تھی.. اور شاید ہمیں اگلے روز کوئی سواری نہ ملتی..

کیا یہ میدان نظر کے سامنے .. دور سے دکھتا.. کوہ قاف کے دامن میں.. وادی پر معلق ایک ہرا ابھرا بے یقین کر دینے والا میدان جس پر برفوں کے منجمد ستون جھکے ہوئے تھے ایسے کہ وہ اُس پر گر بھی سکتے تھے اور اس میں گھوڑوں اور یاکوں کے کھانے کی گھاس میں تھوتھنیاں دیے منتظر کھڑے تھے.. اور اس کی ہوائیں بھی الگ ہوں گی اور ان میں سانس لیتے ہوئے برف کی کرچیاں بھی بدن میں اترتی ہوں گی.. برفیلی سردیلی بدن کو کاٹتی اور پھر گھاس پر پھیلتی اُس کی ایک ایک پتی کو سرد کرتی کنواری.. چھنکتی سرد ہوائیں..

کیا یہاں سے.. اس ڈھلوان سے نیچے اترنا.. وہ جو برفانی ندی نیچے وادی میں بہہ رہی ہے اسے عبور کرنا.. پھر سے اوپر چڑھنا.. بلند ہوتے جانا اور وہاں تک پہنچ جانا جہاں یہ سرسبز تخت بچھا ہے اور وہاں برف ستونوں کے دامن میں خیمہ لگا کر اس منظر کا ایک حصہ بن جانا.. کیا یہ اس لائق تھا کہ پھوراہ میں ہماری منتظر جیپیں ہمیں وصول کیے بنا واپس ہو جائیں اور ہم وہاں جانے کب تک کسی سواری کی آس میں پڑے رہیں اور ہماری پیشگی رقم بھی ضائع ہو جائے..

یقیناً یہ سب کچھ اس لائق تھا..

لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ کوہ نوردی میں فوری جذبات اور خواہشوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا.. کہیں بلند پہاڑوں میں اگرچہ عمومی تاثر یہی ہے کہ آپ آزاد اور بے پرواہ ہو جاتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوتا وہاں نیچے کی دنیا کی نسبت کہیں زیادہ پریکٹیکل ہونا پڑتا ہے.. دیکھ بھال کر سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے.. حساب کتاب مسلسل کرنا پڑتا ہے کہ اتنے دنوں کا راشن ہے.. اتنی ہمت ہے.. پورٹروں کے ساتھ کیا طے ہوا ہے.. ایک لہر میں.. ایک موج میں.. من کی موج میں.. ایک ترنگ میں اپنے طے شدہ منصوبے سے یکدم انحراف نہیں کر سکتے.. کوہ نوردی کے مذہب میں بھی کچھ بنیادی رکن ہوتے ہیں جن سے انحراف پر آپ مرتد ہو جاتے ہیں.. بھٹک جاتے ہیں..

"ابراہیم کیا تمہیں یقین ہے کہ اگر ہم اس میدان میں رات کرتے ہیں تو کل اپنی اگلی خیمہ گاہ نرخ چھر تک.. شام تک نہیں پہنچ سکتے.. ٹریک میں ایک اور دن کا اضافہ ہو جائے گا؟"

"ہاں صاحب.."

"تو پھر چلے چلو ابراہیم.. گھاس کے ایک بلند تخت.. کچھ برفوں.. چند یاکوں اور گھوڑوں کے لیے ایسا کرنا حماقت ہوگا.."

"ٹھیک ہے صاحب.." وہ لڑھکتا ہوا پھر آگے چلا گیا..

میں نے اگرچہ کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن میں چلتے چلتے ٹھوکریں کھاتا تھا کہ میں اپنا راستہ نہیں دیکھتا تھا اس معلق ہرے بھرے تخت کو دیکھتا تھا جس پر براجمان ہونا میرے نصیب میں نہ تھا..

از ابیل نشار نے بھی لکھا تھا کہ اگر آپ اس میدان کی جانب نہیں جاتے اور در وظتر کا رخ کر لیتے ہیں تو یہ ایک ایسا راستہ ہے جو خوش نظر نہیں اور اس پر صرف گدھے چلتے ہیں..

چنانچہ ہم بھی چلنے لگے.. اور ہم کیسے شاندار گدھے تھے جو کوہ قاف کی بجائے کسی اور جانب تھوتھنیاں اٹھائے چلنے لگے تھے..

ہم ڈھلوان سے اُترتے گئے اور وہ میدان ہم سے اونچا ہوتا گیا یہاں تک کہ اس کی گھنی ہریاول اور اس میں چرتے یاک اور گھوڑے روپوش ہو گئے اور صرف اس کی چٹانی ڈھلوانیں سامنے رہ گئیں جن کے دامن میں وہ ندی بہتی تھی.. اور اس ندی کو ہمارے وہ پورٹر عبور کرنے کی کوشش میں تھے کہ وہ اپنے تئیں اپر شاہنی کو جاتے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ ہم اس کی خواہش کو ترک کر چکے ہیں.. ابراہیم نے سیٹیاں بجا کر انہیں متوجہ کیا اور اشارے سے بتایا کہ اُدھر نہیں جانا.. در وظتر کے بیس کیمپ کی چڑھائی کی طرف آ جانا ہے..

ابھی میں اُس میدان سے جدائی کے سوگ میں تھا.. کہ سلیم جو بہت دیر سے چُپ چاپ آ رہا تھا میرے کندھے سے جھانکتا ہوا بولا "سر آپ اپنی بُڈھی سے مطمئن ہیں؟"

"بُڈھی؟"

"بُڈھی.. آپ کی بیگم.. ہماری بھرجائی.."

اہلِ لاہور کے اس کھردرے اور بدتمیز اظہار سے میں کبھی مفاہمت نہیں کر پایا کہ وہ اپنی بیگم کو بُڈھی کہتے ہیں..

کیا ایک ایسی خاتون کو جو بے شک تین ایجر ہو لیکن آپ کی بیوی ہو اُسے بُڈھی کہہ کر اس کے بستر میں شریک ہو سکتے ہیں..

"یار ابھی تو یہ عشق کیا ہے والا مسئلہ طے نہیں ہوا اور اب یہ.. بُڈھی کا سوال آ گیا ہے"

"یہ دونوں سوال آپس میں جڑے ہوئے ہیں سر.. اگر آپ اپنی بُڈھی سے مطمئن ہیں تو پھر عشق کیسے کریں گے.. نہیں سمجھے؟"

"سمجھ تو گیا ہوں لیکن یہ سوال ہرگز جڑے ہوئے نہیں ہیں.. ایک اپنی بُڈھی سے مطمئن

شخص بھی دماغ کے اس خلل میں مبتلا ہو سکتا ہے.. تم ہو؟"

"میں بھی مطمئن ہوں.."

"تو پھر کیوں پوچھتے ہو؟"

"یونہی"

"پھر بھی.."

"میری بیوی بھی ڈاکٹر ہے.. بڑی قابل قسم کی.. اور دیگر ڈاکٹروں کی مانند بے حد پریکٹیکل ہے اور اس میں حس مزاح بالکل نہیں ہے اور میں ٹھہرا پنجابی لاہوریا تو مجھ میں کچھ مزاق کرنے کی پیدائشی عادت ہے.. تو ابھی ہماری شادی کو چند روز گزرے تھے میں اپنی پرانی کار میں اسے بٹھا کر سیر کے لیے لے گیا.. ایک ٹریفک لائٹ سرخ ہوئی تو میں رک گیا.. برابر میں ایک اور کار آ کھڑی ہوئی جس میں ایک نوبیاہتا جوڑا تھا.. میری بیوی کہنے لگی "ذرا دلہن کی طرف تو دیکھو کتنی پیاری دلہن ہے.." میں نے کہہ دیا کہ اس کی بیوی بھی تو دیکھو کتنی خوبصورت ہے.."

"نہایت واہیات بات کی تم نے.. پھر کیا ہوا؟" سانس اگرچہ پھولا تھا لیکن میں اپنی ہنسی روک نہ سکا..

"بس وہ ناراض ہو گئی.. منہ پھلا کر روٹھ گئی.. بڑی مشکل سے منایا کہ جان میں تو مذاق کر رہا تھا.. ایک مرتبہ وارڈ ڈیوٹی کرنے کے بعد گھر واپس آئی تو بے حد خوش تھی.. چہکتی ہوئی تھی.. کہنے لگی.. تمہیں پتہ ہے آج جب میں وارڈ میں داخل ہوئی تو تمام مریض میری جانب متوجہ ہو گئے اور ان میں سے ایک کہنے لگا.. "ڈاکٹر صاحبہ آپ کتنی خوبصورت ہیں".. سلیم رک گیا.. میری خاطر کہ میں سانس درست کر لوں چاہ رہا تھا..

"تو پھر.."

"تو پھر سر.. میری تو کمبخت زبان ہے میں نے ہنس کر کہا.. اچھا اچھا آج پاگلوں کے وارڈ میں تمہاری ڈیوٹی تھی.."

"مجھے شرم آ رہی ہے کہ تم جیسے لوگ میرے دوست ہیں.."

"مجھے بھی شرم تو بہت آئی لیکن زبان پر اختیار نہیں تھا.. میری بیوی پھر ناراض ہو گئی لیکن آہستہ آہستہ اسے عادت ہو گئی.. برا تو اب بھی مان جاتی ہے لیکن بائیکاٹ نہیں کرتی.. آپ جانتے ہیں کہ اس عمر میں بیوی بائیکاٹ کر دے تو.. برا حال ہوتا ہے.. آپ کی عمر میں کر دے

تو آپ رب کا شکر ادا کرتے ہیں"

"صحیح.. میری عمر میں بیوی بائیکاٹ کر دے تو عزت رہ جاتی ہے.." مطمئن اور نامطمئن کی کیفیت تو پچھلے زمانوں کی بات ہے.. اب تو پانی سر سے گزر چکا.. ویسے ہم بے دھیانی میں چل رہے ہیں.. تم ذرا دھیان سے اس ندی کو عبور کرو.." ہم ڈھلوان کے دامن میں پہنچ چکے تھے جہاں ایک بپھری سی ندی ہمارے راستے میں آ گئی تھی.. اسے شاہد اور میاں صاحب کب کے پار کر چکے تھے اور حسن صاحب اس کے پار جانے کے لیے پر تول رہے تھے..

اور اس لمحے جب ہم نے حسن صاحب کو اس ندی کو پرکھتے اور پر تولتے دیکھا تو اس سے اگلے لمحے انہوں نے پانیوں میں ابھرے ہوئے ایک پتھر پر پاؤں جمائے.. پھر دوسرا قدم رکھا اور پھر جانے کیا ہوا.. وہ جو پر تولتے تھے ان میں توازن نہ رہا اور وہ منہ کے بل ندی میں گر گئے..

یہ زیادہ سے زیادہ بالشت بھر پانی کی ندی ہوگی.. اس میں اتنا پانی تو نہ تھا کہ حسن اس میں ڈوب جاتے یا بہہ جاتے اس لیے ہمیں قطعی تشویش نہ ہوئی اور ہم گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اس کے گرد کھڑے اس کے اٹھنے کے منتظر رہے.. جب وہ نہ اٹھا اور اس کے بل پانی میں تیرتے رہے تو پھر ہمیں تشویش ہوئی.. کہ کہیں خدانخواستہ اس کی کنپٹی پر چوٹ تو نہیں لگ گئی.. ابھی اس تشویش کا آغاز ہی ہوا تھا کہ وہ کمر پر ہاتھ رکھے ہائے ہائے کرتا اٹھ کھڑا ہوا.. اس کے بازوؤں اور پنڈلیوں پر خون آلود خراشیں تھیں لیکن وہ مزید کراہنے کی بجائے مسکرا رہا تھا..

یہ ایک ایسی ندی تھی جسے پار کرتے ہوئے گرنے کا کوئی بھی امکان نہ ہو سکتا تھا.. نہ اس کے پانی ٹخنوں سے اوپر آتے تھے اور نہ ان میں بہا لے جانے والا زور تھا اور اس کے باوجود کسی ایک پتھر پر بھی کوئی پر اس کا پاؤں پھسل گیا تھا.. ہم اس سے کہیں تند و تیز اور گہری سینکڑوں ندیاں عبور کر چکے تھے.. وہاں یہ پاؤں پھسلتا تو بیڑہ پار ہونے کی بجائے غرق ہو جاتا.. خیال میں ایک بڑا ڈر یہی ہوتا ہے کہ آپ بے شک دریا اور سیاہ ندیاں عبور کر جائیں.. سمندر پار کر جائیں لیکن ان راستوں میں کوئی ایک پتھر ایسا ہوتا ہے جس پر پاؤں رکھنے سے آپ اجل کی لپیٹ میں چلے جاتے ہیں.. بس اسی نامعلوم پتھر سے ڈرنا چاہیے..

حسن کی خراشوں پر فوراً ڈیٹول کا چھڑکاؤ کیا گیا اور پھر اس کے ہاتھ میں جو کیمرہ ہوا کرتا تھا اسے پانیوں سے دستیاب کیا گیا بلکہ وہ دو تین ٹکڑوں میں دستیاب ہوا.. اور سفر پھر سے شروع ہو گیا..

ہم ڈھلوان سے اتر آئے تھے اور اب سامنے کچھ بڑے بڑے پتھر تھے.. جھاڑیاں اور

اور جابر کو اشارہ کیا اور پھر وہ تینوں بندر ہو گئے.. وہ تینوں اچھلتے کودتے میرے..
بیریوں اور تیزیں سنبھالتے بڑے بڑے پتھروں کو پھلانگتے چند لمحوں میں میری نظروں سے اوجھل
ہو گئے.. اور پھر تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک وسیع کھائی کے پار چٹانوں میں کھڑے ہاتھ
کر کے مجھے اشارے کر رہے ہیں کہ شروع ہو جاؤ.. ان کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی.. وہ واقعی دور
تھے.. عمران ایک پیدائشی کیمرہ مین تھا.. وہ کسی منظر کو بھی نہیں دیکھتا تھا بلکہ اس مقام کی تلاش میں
رہتا تھا جہاں سے اس منظر کو بہترین زاویے سے فلم بند کیا جا سکتا تھا.. اسی لیے اس نے اس
نشیب پر پہنچتے ہی یہ بھانپ لیا تھا کہ اگر میں اس چڑھائی پر تارڑ اور گدھے کو چلاتا ہوں تو ادھر
کھائی کے پار ایک ایسا مقام ہے جہاں سے میں اس پوری وادی کے پھیلاؤ اور اس میں رینگتے اس
تارڑ اور اس گدھے کو بہترین زاویوں سے شوٹ کر سکتا ہوں

وہ تینوں بندر اچھل اچھل کر مجھے اشارے کر رہے تھے کہ چلو چلو..

"باندر کے بچے.." میں بڑبڑایا "بندے کو باندر ہی سمجھتے اپنی طرح کا چری باندر
سمجھتے ہیں.."

اس بڑبڑاہٹ کے خاتمے سے پہلے ہی مجھے احساس ہوا کہ غلطی ہو گئی ہے.. میری جیب
میں وہ بھاری پتھر مائک ہے جو میری ہر قسم کی بڑبڑاہٹ بندر نمبروں تک پہنچا رہا ہے اور اس شام
اس نے قہقہے لگاتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ سر جی جو کچھ آپ ہمارے بارے میں فرما رہے تھے وہ
ہم سن رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے.. ویسے ہم تو بندر ہیں لیکن ہو سکتا ہے آپ جو کچھ لگ رہے تھے
وہ ہم نہیں بتائیں گے..

تینوں حضرات اچھل اچھل کر اشارے کیے چلے جا رہے تھے کہ چلو چلو.

چنانچہ میں نے پچو کو اشارہ کیا کہ گدھا سٹارٹ کیا جائے اور پھر اس کے متحرک ہوتے
پر اس کے پہلو بہ پہلو مختصر بیگ اٹھائے واکنگ سٹک ٹیکتے چلنے لگا بلکہ چڑھنے لگا.. اور حسب ہدایت
خود کلامی میں محو ہو گیا.. میں جو جی میں آ رہا تھا کہہ رہا تھا.. اور ہانپتا لرزتا کہہ رہا تھا.. چڑھائی
ذرا دشوار تھی.. اور جو کہہ رہا تھا حیرت در حیرت بد زبان انگریزی کہہ رہا تھا.. اور انگریزی بھی ایسی کہ
انگریز بھی دنگ رہ جائیں اور صدمے سے گنگ [illegible] ہو جائیں..

"ہو ہو...." میں اپنے آپ سے بلکہ جیب میں رکھے مائک سے کہہ رہا تھا جس کے

وزن سے میری پتلون کا دایاں حصہ کچھ کھسکتا نیچے چلا جا رہا تھا" ہو ہو تارڑ جی.. تم کہاں ہو.. اور کیوں
ہو.. لیکن یار نلتر جھیلیں بھی کیا جھیلیں تھیں ڈوب مرنے کو جی چاہتا تھا.. لیکن ڈوبنے کے لیے شرط ہے
ہے کہ ایک عدد شاد گوری جل پری تمہارے عشق میں قید ہو کر تمہارے ساتھ ڈوبنے پہ آمادہ
ہو جائے.. یار ہم دونوں کے ڈوبنے کا کیا منظر ہوگا.. وہ ہرن.. ایک بھالو ہرن جس کا کچھ حصہ سفید
اور کچھ بھی.. اور بقیہ براؤن ہی براؤن.. اور اس کے ہمراہ ایک جل پری ایک پُرشکل پانی ہوگی ان
چٹانوں کے ساتھ جو کشتیاں الٹ دیتی ہیں.. اس کی لمبی گداز ٹانگیں پانی کے رنگوں کے ساتھ رنگ
بدلتیں.. لیکن نہیں.. ہوری جل پری کی ٹانگیں تو نہیں ہوتیں پُرشکل ہوتی ہے اور وہ ماہ ایک جل پری
میرے ساتھ کیسے ڈوب سکتی ہے وہ تو تیر سکتی ہے اور پانی کی مخلوق ہے.. تو پیچھے ہم اکیلے ہی ڈوب
جاتے.. اور اب میں کہاں ہوں.. ایک گدھے کے ہمراہ جس کو پورا آگے نکل چکا تھا.. بیلوڈی گی (میں
گدھے کے کان پکڑ کر اس کے ساتھ فرینڈلی ہوتا ہوں) ہاؤ آر یو مائی فرینڈ.. تم مجھے گدھے دکھائی
دے رہے ہو تو میں تمہیں کیا دکھائی دے رہا ہوں.. (گدھا جواب نہیں دیتا) تم تو مجبوراً یہاں آئے
ہو اپنے پیٹ کی خاطر لیکن میں اپنی مرضی سے یہاں آیا ہوں یعنی گدھا تو میں ہوا.. بیلوڈی گی ڈیئر
کیا تم ہو گا؟ میرا خیال ہے وہ کے لگ بھگ ہو گا.. اس وقت میرے بال بچے دوپہر کے کھانے
سے فارغ ہو کر لیونگ روم میں ایک دوسرے کے ساتھ چہلیں کر رہے ہوں گے.. شاید کسی کو میرا
خیال بھی آ جائے کہ ابو اس وقت کہاں ہوں گے.. سلجوق کہتا ہو گا کہ میں پاکستان ناردرن سروس کا
ایک معزز پائلٹ ہوں اور ذرا دیکھئے میرے والد صاحب اس عمر میں کیا حرکتیں کر رہے ہیں.. اور
ڈاکٹر عینی نے ذرا حساب کتاب کیا ہو گا کہ ڈیڈی پچھتر بلڈ پریشر کی گولیاں روزانہ کھا رہے
ہیں یا نہیں.. اسے کیا پتہ کہ میں اس سے کتنا ہائی ہو رہا ہوں.. شاید پیک اور سنگل پیک جتنا ہائی تو
پھر میرا بلڈ پریشر کیا ہوا.... ہائی ہائی.. بیلوڈی گی کیا تم سن رہے ہو.. نہیں نہیں عمران تم سے نہیں کہہ رہا..
سنو میری ایک کتاب کا نام ہے "گدھے ہمارے بھائی ہیں".. تو تم ہمارے برادر ہو.. کوئی بات کرو
یار.." بول بول کر میرا سانس اکھڑنے لگا اور میں اس لایعنی خود کلامی سے تنگ آ گیا اور میں نے
مائک کی جانب جھک کر کہا "اوئے عمران کے بچے.. اگر تم سن رہے ہو تو سن لو کہ بلندی کی وجہ سے
اور اپنی عمر کی وجہ سے میں اب مزید بکواس نہیں کر سکتا.. شوٹنگ پیک اپ"

میں اور گدھا خاصی بلندی پر آن پہنچے تھے.. ڈھلوان ختم ہو گئی تھی اور ہمارے سامنے

"کہیں بلند پہاڑوں میں.. رسول حمزہ توف مر چکا ہے"

دن ڈھل رہا تھا..

نیچے میدانوں میں پرندے اپنے گھونسلوں کی جانب لوٹ رہے ہوں گے.. اور ہم نے آج شب ورزدنجر کے دامن میں پہنچ کر اپنے عارضی گھونسلے بنانے تھے.. ہم چلنے لگے.. عمران نے پھر اپنے کیمرے کا رخ میری جانب کیا "نہیں.. پلیز اسے آف کر دو.. بہت ہو چکا.. اب میں اس پُرسحر اور ایک ان دیکھے پہاڑی منظروں کے درمیان بلاخوف و خطر.. کیمرے کی گھورتی آنکھ کے بغیر.. چلنا چاہتا ہوں.. آپ چاہے کتنے بھی تجربہ کار... کتنے بھی کھلاڑی ہوں.. ٹیلی ویژن کیمروں کے سامنے پوری عمر گزار چکے ہوں پھر بھی جب ایک کیمرہ آپ پر تکتا ہے.. اس کا لینز آپ کو فوکس میں لیتا ہے تو آپ وہ نہیں رہتے جو آپ ہوتے ہیں.. میں اب کچھ لمحوں کے لیے وہ ہونا چاہتا ہوں۔"

"او کے باس" اس نے مجھے اسی انداز میں سیلوٹ کیا جس انداز میں شوٹنگ کے آغاز میں.. میں نے اسے سرکس کے مسخرے کی طرح جھومتے ہوئے سیلوٹ کیا تھا..

یہاں چلنا دشوار تھا..

بلندی اگرچہ سانس کو گراں کرتی تھی لیکن یہاں نسبتاً ہمواری تھی جس کے باعث چلنے میں چنداں دشواری نہ ہوتی تھی..

ہم اس برف کناروں والے پیالے میں چلتے گئے..

پھر ایک مقام پر میں اپنا دم سنبھالنے کے لیے رکا اور آس پاس اطمینان سے نگاہ کی تو حقیقی معنوں میں میرا دم رک کے رہ گیا..

میرے چاروں اور برف پیراہنوں میں پوشیدہ بلندیاں تھیں.. نیلی چٹانیں اور تنہائیاں تھیں.. سورج ڈھلتا تھا اور ان کی نیلاہٹ، سفیدی اور تنہائی بھی روپہلی ہوئی جاتی تھی.. اور انسان

ان بلند سکوت میں بچھڑ چکے.. مر چکے عزیزوں اور دوستوں کو یاد کرتا تھا کہ یہ اکلاپا ان اونچے سنگی سلسلوں میں اجل کی قربت میں کی تھی.. وہ لوگ جو کبھی موت کے دامن تک گئے اس کی ٹھنڈک اور فضا کو محسوس کیا.. اور پھر کبھی لوٹ آئے کہ ابھی ان کے نصیب میں چند سانس اور تھے.. واپس آگئے.. تو جب انہوں نے موت کی نزدیکی کو بیان کیا تو بتایا کہ ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہم ایک سیاہ غار میں سفر کر رہے ہیں لیکن اس کے آخر میں کوئی روشنی ہے.. ایک نور ہے.. اور کچھ نے کہا کہ ہم کہیں ایک سناٹوں سے بھری بلند وادی میں تھے اور تنہا تھے.. اور کچھ جہاں مر رہے.. چل میلے نوں چلیے.

یہی وہ خیال تھا جو موت کی نزدیکی میں پیدا ہوتا تھا..

یہی پیالہ نما میدان اور اس کے چاروں اور برف پہاڑوں والے پہرے دار تھے جو تمہیں خوش آمدید کہتے تھے..

اجل کی قربت میں جو وادی تھی.. وہ ایسی ہی ہوگی.. یہاں پر بھی وہی ٹھنڈک اور فضا تو وہی تھی..

اجل کی قربت..

جس روز اجل آئے..

شاید کوئی ایسی اجلی برفوں کے سفید ہاتھ تمہیں سہارنے کو اجل آئے..

میں اگرچہ ان تحیروں سے غافل تھا مگر وہ میرے پیچھے پیچھے آتے تھے..

میں رکا تو وہ بھی رک گئے..

اور وہ میری کیفیت سے خوب واقف تھے کہ ان پر بھی یہی اجل تنہائی اتر رہی تھی..

"عمران.. میں نے "ایک سرائے" کے آغاز میں رسول حمزہ توف کی نظم "اے عورت" کا حوالہ دیا ہے.. اور یقین جانو کہ جب میں رسول کے قدموں میں بیٹھا اپنی عقیدت کا اظہار کر رہا تھا تو مجھے یہی احساس ہوا کہ وہ عورت میری طرف بڑھ رہی ہے.. اور اس داغستانی شاعر نے جس کی شاعری کا ترجمہ "میرا داغستان" میں فیض صاحب نے کیا ہے مجھے تھپکی دے کر کہا تھا کہ تم بے حد خوش نصیب ہو.. میرے ساتھ بھی یہ المیہ ہے کہ اگر کوئی غزل یا نظم مجھے پسند آ جائے تو پھر اسے بیان اتنا کرتا ہوں کہ اس کا ناس کر دیتا ہوں.. تو جیسے میں وہاں تھا ناں.. میں نے اپنے ٹیلی ویژن سیریل "شہپر" میں اسے تھیم سانگ کے طور پر پیش کیا اور ایک پاپ سنگر شہزاد نے جو بے مراد تھا اسے گایا.. تو کہنا میں یہ چاہتا ہوں، تم سن رہے ہو عمران؟"

وہ چونک گیا.. اس کے چونکنے سے اس کے بغل بچے بھی چونک گئے..

"آپ کہئے جو کہنا چاہتے ہیں ہم بھی کچھ منتظر اور کچھ جو نیا کے حر میں ہیں"

"تو عمران اس بلند مقام پر پہنچ کر مجھے محسوس ہوا ہے کہ رسول حمزہ توف کی نظم کا آخری بند ان پہاڑوں میں آ کر لکھا گیا تھا.. یہی وہ بلند پہاڑ ہیں جن میں رسول حمزہ توف مر گیا تھا.. میں ایک مرتبہ پھر اس نظم کو رسول کی یاد میں.. کہیں بلند پہاڑوں میں.. جہاں وہ مر گیا تھا.. پڑھنا چاہتا ہوں۔"

عمران فوراً چوکس ہو گیا اور اس نے کیمرہ کھول دیا..

کاظمی بیٹریوں کے کمربند سے بکتر بند ہو کر عمران کے قدموں میں لیٹ گیا اور خاہر ہے تو قدر رانس آن کریں کہ ہم نچاؤں تین ہورہے تھے..

"تارڑ صاحب.." عمران کیمرے میں پوشیدہ ہوا اور مجھے اس کے لینز میں دیکھتے ہوئے مخاطب ہوا "آپ یہ نظم پڑھتے ہوئے میرے گرد گھومتے جائیں گے.. کیمرے کی آنکھ میں آنکھیں ڈالے اسے پڑھتے جائیں گے. اور میں آپ کے ارد گرد جو بلند پہاڑ ہیں ان کے پورے سلسلے کو فوکس میں لاتا جاؤں گا.. نظم شروع کرتے ہوئے آپ کی نگاہیں چوٹیوں اور بلندیوں پر ہوں گی اور آپ آہستہ آہستہ میرے گرد ایک چکر مکمل کریں گے اور جب یہ دائرہ مکمل ہو گا تو آپ آخری بند پڑھ رہے ہوں گے.. اور اس کے اختتام پر میں کہیں بلند پہاڑوں میں چلا جاؤں گا.. شروع کریں سر.."

میں نے جب وہ نظم شروع کی تو مجھے قطعی طور پر احساس نہ ہوا.. گم نہ ہوا کہ وہاں عمران بھی ہے اور اس کا کیمرہ مجھے گھور رہا ہے.. میرے ساتھ حرکت کر رہا ہے کہ میں پھر سے تنہا تھا اور وہ نظم مجھ پر ازل جیسی جاتی تھی جسے میں نے رسول حمزہ توف کی خواہش پر آسان اردو میں ڈھالا تھا..

میں جب کبھی اس نظم کا حوالہ دیتا ہوں اس کا ترجمہ مختلف ہوتا ہے کہ میں اور اس لمحے کی کیفیت اور ماحول اس پر اثر انداز ہو کر اسے مختلف کر دیتا ہے..

"اے عورت....

وہ کس عورت سے مخاطب تھا؟"

یقیناً اس عورت سے جس کے بارے میں گورسیا مارکیز نے کہا تھا کہ ہر مرد.. ناممکن ہے اور پھر ایک عورت اس کی زندگی میں آتی ہے جو اسے مرد بنا دیتی ہے.

تو رسول بھی ایسی عورت سے مخاطب تھا..

"اے عورت..

اگر ایک ہزار مرد تمہاری محبت میں مبتلا ہوں تو..

جان لینا کہ رسول حمزہ توف ان میں سے ایک ہو گا.."

کہ عشق تو وہ ہے کہ کوئی آپ سے محبت نہ کرے تو آپ اس سے محبت کریں.. اگر کوئی آپ سے محبت کرتا ہے اور آپ بھی اس کی محبت میں مبتلا ہیں تو یہ عشق نہ ہوا کاروبار ہوا.. کسی فرانسیسی دانا نے ساہیر اکچہ ہوئے کہا تھا..

"اور اگر ایک سو مرد تم سے محبت کرتے ہوں تو.."

میں کہیں بلند پہاڑوں میں رسول کی نظم اس کے لفظوں میں نہیں اپنے احساسات کے تابع اپنے لفظوں میں ڈھالتا تھا اور کیمرے کی آنکھ میں تکتا اور اس کی موجودگی سے غافل بھی اس کے گرد طواف کرتا جاتا تھا..

"اور اگر صرف ایک مرد..

تو یہ رسول حمزہ توف کے سوا کون ہو سکتا ہے"

اور جب بخشی اوجبری کی کے ہاں میں اسلام آباد میں رسول حمزہ توف.. داغستان کا امیر الشعرا یہ مصرع پڑھتا ہے تو ہال تالیوں سے گونج اٹھتا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مقطع ہے.. لیکن رسول ہاتھ بلند کر کے نظم کا آخری بند پڑھتا ہے.

"لیکن.. اگر تم تنہا ہو.. اور اداس ہو..

اور کوئی بھی تمہاری محبت میں مبتلا نہیں..

تو سمجھ لینا کہ.. کہیں بلند پہاڑوں میں..

رسول حمزہ توف.. مر چکا ہے"

یہی وہ بلند پہاڑ تھے..

میں کیمرے کے گرد دائرہ مکمل کرتے آخری بلندی پر چڑھنے کے بعد ایک دم تمام عمر میں گرفتہ
رک گیا کہ اب نہ سامنے وہی کچھ تو نہ تھا..

تب عمران نے کیمرے میں سے سر نکالا "یہ رسول حمزاتوف یہاں تو آیا نہیں تو اس
نے کیسے یہ نظم کہی.."

"لیکن میں تو یہاں آیا ہوں.." میں نے ہنس کر کہا "کسی بھی بڑے شاعر کو کہیں بھی
جانے کی ضرورت نہیں ہوتی.. وہ جگہ خود چل کر اس کے پاس آجاتی ہے.."

"کیا آپ اس نظم کو انگریزی میں ریسائٹ کر سکتے ہیں؟"

رسول نے یہ نظم اپنی مادری زبان آوار میں لکھی تھی.. پھر ایک ازبک دوشیزہ نے اسے
انگریزی میں منتقل کیا جہاں سے میں نے اسے اردو میں ڈھالا اور اب ایک مرتبہ پھر جب میں نے اسے
انگریزی میں واپس کیا تو وہ عجیب ادھوری اور بے ذوق.. اور اس کے باوجود اس کی تاثیر میں کوئی فرق نہ آیا جیسے
دری کی ابتدائی موجودگی رکھنے والے فخر اللہ کے اپنے احساسات اس پر حاوی ہو گئے.. یہ جاوی طور
یہ نظم اب رسول کی نہیں رہی تھی بلکہ میرے کچے پکے جذبات میں ڈوب کر اردو کی ہو گئی تھی..

"او ہو میں.." میں نے پتھر سے عمران کے کیمرے کو اپنی آنکھ میں رکھا اور اس سے گرد
گھومنے لگا..

"انف اے تھاؤزنڈ مین آر ان لو ود یو..
ریسٹ اشیورڈ دیٹ رسول.. ول بی ون آف دیم..
اور پھر آخر میں..
"اینڈ اف آئی ایم ڈیڈ.. ریزولیوٹ..
اینڈ نو باڈی از ان لو ود یو..
دین.. سم ڈیز ان دی سکائی..
رسول حمزاتوف از ڈیڈ.."

کہیں بلند پہاڑوں میں.. رسول حمزاتوف مر چکا ہے..
از ڈیڈ.. از ڈیڈ..
یہ آواز دیر تک بلند پہاڑوں میں گونجتی رہی..

"درہ ہلتر کے بیس کیمپ سے دھواں اٹھ رہا تھا"

وہ یاک جنہیں ایک مدد اور ہیرکت کی شدید ضرورت تھی ہمارے قریب آگئے.. پھر ہم
تھے جو چپکے چپکے ان کے قریب آگئے تھے..

انہوں نے تھوتھنیاں اٹھا کر ہمیں ناراض نظروں سے دیکھا.. انہیں اپنے رکھوالوں کی
عادت تھی جو انہیں اس بلند چراگاہ میں چھوڑ کر نیچے جا چکے تھے.. انہیں اس مکمل تنہائی میں اطمینان
سے چرتے رہنے کی عادت تھی ہم جیسے حاتی الفضول قسم کے لوگوں کی عادت نہ تھی جو بلا وجہ اٹھاتے.
جنگلوں میں چلے ان کے قریب ہو کر انہیں دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے.. یہ ایک تھوتھنی سے وہ بچے
تھے.. ذرا قریب ہوتے تو تھوتھنوں کی اندھی آمیز خراٹے نتھنوں سے نکالنے لگتے.. ہم نے ان
سے کیا لینا دینا تھا تھوڑی دیر ان کا مشاہدہ کیا اور پھر آگے بڑھ گئے.. میدان کے خاتمے پر کنارہ
اونچا ہوا.. اور وہاں ایک اور منظر ہمارا منتظر تھا..

کچھ فاصلے پر چٹانوں اور برفوں کی ایک بلند دیوار تھی ہے اور اس کے دامن میں ایک
وسیع گھاٹ ہے.. ایک پھیلاؤ ہے سلیٹی رنگت کا اور اس میں سے تین چار ندیاں جو پُرشور نہ تھیں
اطمینان سے بہتی اترتی تھیں اور ان کے پل کھینچے جاتے تھے.. یہ ندیاں درہ ہلتر کی برفوں میں
سے جنم لے کر ایک گلیشیئر میں راستہ بناتی نیچے آرہی تھیں.. درہ ہلتر ان چٹانوں اور برفوں کی دیوار
کے اوپر کہیں تھا.. ہمیں اس منظر کی توقع نہیں تھی کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ ہم بیس کیمپ تک پہنچ گئے
ہیں.. ندیوں پر گلیشیئر اور اس بلند دیوار پر شام کے سائے گہرے اور سرد ہو رہے تھے.. ہم آہستہ
آہستہ نیچے اترنے لگے اور پہلی ندی کے کنارے پر پہنچ گئے جہاں ابھی تک ہمیں راستہ دکھانے کے
لیے رکا ہوا تھا وہ ہمیں پہلے بالکل دکھائی نہیں دیا تھا اور ہم اس منظر میں گم تھے..

اور تاریکی میں مکمل طور پر روپوش تھے اور صرف جب کش کھینچا جاتا تھا اور ان کے خصوصی سگرٹ کا جگنو پل بھر کے لیے سلگتا سرخ ہوتا، روشن ہوتا تو ان کی وہاں موجودگی کا پتہ چلتا تھا.. یہ خیمہ گاہ بھی ایک چھوٹی سی پاک سرائے تھی..

میں اس سرائے میں سب سے آخر میں داخل ہوا تھا.. اور ساتھیوں کی ہیلو ہائے کے بعد سیدھا اپنے خیمے.. یعنی وہ خیمہ جو سلیم کا تھا اور میں اس کا شریک بن چکا تھا اس میں گھس کر لم لیٹ ہو گیا تھا.. لیکن میں نے خیمے کے اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا کہ سلیم خیمہ گاہ کے آس پاس منڈلاتے چرتے یاکوں کو نہایت ہی دل جمعی اور دلچسپی سے دیکھ رہا ہے کہ وہ اس کے پہلے یاک تھے اور اسے پسند آ گئے تھے... وہ اپنی مونچھیں سنوارتا ان پر مسکراہٹیں نچھاور کرتا ان کے قریب قریب ہو کر ان سے اٹھکیلیاں کرنا چاہتا تھا اور وہ کرنے نہیں دیتے تھے بیزار بیٹھے تھے.. بلکہ کھڑے تھے.. اور ناراض نظروں سے اُسے دیکھتے ذرا پرے پرے ہوتے تھے..

ابر رات ہو گئی.. اور مزید سردی ہو گئی.. ہم تقریباً ساڑھے بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر خیمہ زن تھے.

جب رات ہو گئی تو خیمے کا پردہ ہوا اور سلیم جھکا جھکا اندر آ گیا اور بیٹھ گیا "سر یہ یاک چلے گئے ہیں... یہ کہاں چلے گئے ہیں؟"

"یار میں تو خیمے میں پڑا اپنی خراشیں سہلا رہا ہوں.. مجھے کیا پتہ کہاں چلے گئے ہیں"

"میں بہت دیر تک ان کے قریب بیٹھا رہا.. انہیں پچکارتا رہا.. چاکلیٹ کھلانے کی کوشش کی لیکن وہ مجھ میں دلچسپی نہیں لے رہے تھے.. پھر تاریکی ہوئی تو وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر ایک ایک کر کے کھسک گئے... پتہ نہیں کہاں گئے ہیں.. کہاں گئے ہیں سر جی؟"

سلیم عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا... وہ تین بلندی پر پہلی بار آیا تھا اسی لیے بہک گیا تھا... ہم سب یعنی قدیمی گروپ اس بیس کیمپ سے کہیں بلند درجات پر فائز ہو چکے تھے.. کنکورڈیا میں، بیس کیمپ نانگا پربت اور روپل کی برف کے دامن وغیرہ... اور سب سے بلند ستر ہزار فٹ سے زیادہ بلند درہ میں ہیں.. اس لیے ہم یہاں محض ساڑھے بارہ ہزار فٹ پر پہنچ کر بھی تو متاثر نہیں تھے.. اس لیے میں نے سلیم کو اس عیاشی پر جیسے کسی نظر سے دیکھا جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہے اور اس کے سامنے ایک ایسا نوجوان ہے جو کسی گھاٹ سے پہلی بار پانی پی کر آیا ہے اور حیران اور خوش ہے کہ اچھا پانی ایسے ہوتے ہیں..

"سر آپ پانی پئیں گے؟"

"کون سے گھاٹ کا پانی ہے؟"

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا "یہ منرل واٹر ہے جو میں اسلام آباد سے لے کر آیا ہوں تاکہ پیٹ خراب نہ ہو."

"یار میں نے تو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور مجھے کبھی پیٹ کی خرابی کا شکار نہیں ہوا.. آپ اپنے معدے کو سختی آزمائیاں دیں گے.. چھان پھٹک کر.. ابال ابال کر اگر پانی پئیں گے تو وہ اتنا ہی خود سر ہو جائے گا... بے شک بسم اللہ کا پانی پیو... جو بہتی سے دو گھونٹ بھر لو.. معدہ اس کا بھی عادی ہو جائے گا."

"لیکن سر یہ تو منرل واٹر ہے.."

"ہائی وے پر جو درجنوں بھرنڈیاں ہماری خیمہ گاہ کے برابر میں گھنٹے بھر میں سے بہتی آ رہی ہیں اور جن کے بہاؤ کی آواز ہمارے کانوں میں آ رہی ہے اور جن میں سے آخری ندی کے کنارے عمران ایند کمپنی کے سگرٹ کے جگنو چمکتے ہیں وہ بھی تو خالص منرل واٹر ہے... کیوں نہ ہم بجائے ان کے اور ٹیک لگا کر اسے پی لیں... وہ یک مشت دل کی شدید خون دل کی کشید."

"لیکن سر یہ اب میں تو یہ تین پلاسٹک کی منرل واٹر کی بوتلیں اسلام آباد سے اٹھا کر یہاں تک لایا ہوں تو ان کو بھی تو ختم کرنا ہے.. اور یقین کریں یہ ہمارے میدانوں کا پانی ہے اور اس میں تاثیر بہت ہے.. ذرا چیک کریں"

میں نے چیک کیا..

وہ برف ہو رہا تھا لیکن اس میں کچھ پوشیدہ سی تاثیر تھی جو میری سمجھ میں نہ آئی.. شاید یہ اپنی مٹی کے پانی تھے.. اپنے میدانوں سے کشید کردہ تھے اور ان میں دراصل سرسوں کے کھیتوں کی.. مکئی کی روٹی اور سرسوں کے ساگ کی.. اور گیہوں کے زرد پھولوں کی تاثیر تھی..

خیمے کی چھت سے ایک تھیلے میں بندھی ٹارچ لٹکی تھی اور اس کی بیٹری کمزور پڑ رہی تھی سردی کی شدت کے باعث لاچار ہو رہی تھی اور روشنی زرد ہوتی جا رہی تھی... ہم دیر تک باتیں کرتے رہے.. بلندی کے باعث بہکی بہکی باتیں کرتے رہے..

خاموشی بہت تھی..

"کون؟" میں نے صدا دی..

برابر کے خیمے سے سرگوشیاں یکدم منقطع ہوئیں اور ایک سرد سی "جی سائیں" کی آواز جواب میں آئی۔

گدا ہمیشہ سے ہر ٹریک کے دوران میوزک سیکشن کا انچارج رہا تھا اور وہ جہاں اپنے رک سیک میں سے نمبر چار کی پولی کی مانند برچھے برآمد کر کے پیش کر دیتا تھا وہاں کسی بھی سنو لیک یا شمشال میں آپ کی فرمائش پر کوئی بھی گیت یا غزل یا مارننگ کلام اپنے ڈیک پر سنوا سکتا تھا۔ صرف ہمیں سنواتا ہی نہ تھا بلکہ اس کی تال پر رقص کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔۔

"یار جب سے یہ ٹریک شروع ہوا ہے تم نے موسیقی نہیں چھیڑی۔۔ کوئی 'جان بہاراں رشک چمن غنچہ دہن' کوئی استاد جی کی یا وارث شاہ کی عشق آتش لائی ہے چھ دن ہو گئے سنائے بہت ہے۔۔ کچھ چھیڑو یار۔"

"موسیقی کا موقع نہیں ہے سائیں۔۔" ادھر سے بے حد روکھا جواب آیا۔

"کیوں گدا بھائی۔" سیم نے پوچھا۔ "یہی تو موقع ہے۔۔ آواز بلند کر دینا تا کہ ہم یہاں بیٹھے بیٹھے انجوائے کریں۔"

"موقع نہیں ہے۔۔ سائیں گرو آ میرزا ابھی نماز پڑھیں گے۔"

"سوری گدا۔" میں قدرے خفیف ہو کر چپ ہو گیا لیکن چپ ہونے سے پیشتر میں نے ایک اور صدا دی۔ "سائیں گرو آ میرزا کی نماز کبھی تو ختم ہو گی پھر لگا دینا۔"

اب ہم دونوں آپس میں باتیں نہیں کر رہے تھے انتظار کر رہے تھے کہ بلندی کی اس سرد تنہائی میں ہم موسیقی کے راستے کسی جان بہاراں کی قربت میں جانے کے متمنی تھے۔۔ ایک مناسب وقفے کے بعد میں نے پھر پکارا۔ "گدا۔۔ اگر سائیں گرو آ میرزا نماز پڑھ چکے ہیں تو لگا دو سائیں جی تو۔"

"اب سائیں گرو آ میرزا آرام کر رہے ہیں اور وہ بھی میوزک کو پسند کرتے ہیں تارڑ صاحب۔"

اس دو ٹوک رویے کے جواب کی مجھے ہرگز توقع نہ تھی۔۔ اس لیے کہ میں انسانی خصلت کو نہیں جانتا تھا۔۔ گرگٹ ہو جانے اور رنگ بدلنے کو نہیں جانتا تھا۔۔ تو ظاہر ہے میں مزید خجل ہوا۔۔ بے حد شرمندہ بلکہ بے توقیر ہوا اور خواب میں چھوڑ گیا۔۔ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔۔ وہ شخص میرا تھا کہ میں نے ان لوگوں پر تکیہ کیا تھا۔۔ انہیں گمنامی سے ناموری تک لے آیا تھا تو وہ شخص میرا تھا۔

سردی بڑھتی جاتی تھی۔۔

یہ کچھ چپ چپ سی اکٹھی زندگی تھی۔۔

ہم ایک دوسرے کے ساتھ جڑے تو تھے۔۔

جڑنے سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ ہم بغل گیر ہو کر ہمہ وقت ایک دوسرے کے ساتھ چپکے رہیں۔۔ بوس و کنار میں مشغول رہیں نہیں۔۔ بے شک آپ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ ہم کلام نہ ہوں۔۔ اپنے آپ میں گم رہیں اور پھر بھی ایک مشترکہ نبض آپ کے درمیان دھڑکتی رہے۔۔ کچھ کہے بغیر ایک نظر ڈالنے سے آپ جان جائیں کہ آپ کے ہم سفر کو آپ کی ضرورت ہے۔۔ ایک دوجا۔۔ ایک دوسرے کے لیے فکر مندی آپ سب میں مشترک ہو۔۔ جو اس مہم کے ارکان میں نہیں تھی۔۔

ان میں ایک بکھراؤ تھا۔ ہم سب بظاہر پہلو بہ پہلو چلتے تھے لیکن ایک دوسرے سے آگاہ نہیں تھے۔۔

شاید یہ کیفیت اس فرقہ واریت کا ثمر تھی جو عمران اور اس کے بلند پنڈوں اور دوسری جانب گدا اور گرو آ میرزا کی بلند کی پسندی کے باعث ظہور میں آئی تھی۔

جو کچھ بھی تھا یہ سب میرا کیا دھرا تھا۔۔ میری ذاتی حماقت تھی۔۔ کیونکہ میں نے ہی یہ بھان متی کا کنبہ جوڑا تھا۔۔

اگر میں نے یہ کنبہ جوڑ ہی دیا تھا تو کم از کم کنبے والے ہی کچھ لحاظ کرتے جو انہوں نے نہیں کیا اور گرگٹ ہو گئے۔۔

ہم نیلے ترپال پر بیٹھے تھے اور دہکتے ہوئے الاؤ کے قریب ہوتے تھے تا کہ منجمد نہ ہو جائیں۔۔ ہم الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے اس کی دہکتی بھڑک میں پلیٹ میں نظر آتے۔۔ کبھی کبھار اس بھڑک سے نظر آتے سامان میں سے ذرا ابھر لیتے کہ وہ پھر اگلے لمحے تاریکی میں ڈوب جاتی۔۔

چپ کا راج تھا۔ سوائے الاؤ کی بھڑک کے۔۔

"ایسا ہے۔" میں نے خاموشی۔۔ اور شدید اجاڑ میں ٹھٹھرتی سردی جس کا پنجہ ہاتھوں سے خاموشی کا قتل کرنے کی سعی کی۔۔ "ان کو بتانا مرا تھی کا نقش تھا۔" "کیا ہم دو کر اس کریں گے؟"

"جی صاحب۔"

"کیسے؟"

"یہ جو دیوار ہے چٹانوں کی.. تاریک اور مہیب.. کل صبح سے ہم اس پر چڑھیں گے.. یہاں سے مشکل دکھائی پڑتی ہے لیکن ہے نہیں.. آپ بھی چڑھ جاؤ گے انشاءاللہ.. اور اوپر بہت بڑے بڑے پتھر آئیں گے.. چٹانیں اور برف آئے گی اور پھر ایک گھنٹے کے بعد ہم چوٹی پر پہنچ جائیں گے جہاں سے وہ گلیشیئر سامنے آ جائے گا"

"گلیشیئر بہت بڑا ہے؟"

"بڑا تو ہے صاحب.. ان علاقوں میں یہ سب سے بڑا گلیشیئر ہے.."

"بیافو، ہسپر اور بالتورو سے تو بڑا نہیں؟"

"نہیں صاحب.. وہ تو دریا جیسا ہے.. برف کا دریا ہے.. ادھر تو ان کے اندر بیچ جاؤ تو پھر قسمت سے ہی باہر آتا ہے.. ہم تو وہاں گھس گیا.. صرف سکردو کا پورٹر.. بچی لوگ ہی اس کے اندر جا سکتا ہے.. خطرناک ہے تو ہم ایک دو گھنٹے میں پار ہو جائیں گے انشاءاللہ.. اگر برفباری نہ شروع ہو گیا"

"برفباری؟" ہم سے بہت الگ.. ایک فاصلے پر.. تاریکی میں.. ایک پتھر پر براجمان گلی جو کہ کھانا پکا چکا تھا اور اب اپنے آپ میں آگ کی بجھتی تھا اور کسی جوگی انداز کرشماتی پیک کو گھورتا تھا.. اور جس نے شاید پوری گفتگو میں صرف "برفباری" کو قابلِ فہم سمجھا تھا.. چونکا "کیسی برفباری؟"

عمران اپنے خیمے میں چوکڑی مارے بیٹھا تھا وہیں سے بلند آواز میں بولا "اوئے گلی.. ویسی برفباری"

"کیسی برفباری ہوتی ہے.." گلی تقریباً جھنجھلایا۔

"بس ویسی ہی برفباری جیسی کہ برفباری ہوتی ہے"

"اچھا اچھا میں سمجھا تھا کہ ویسی برفباری جیسی کہ برفباری نہیں ہوتی" یہ کہہ کر گلی اپنے پتھر پر شانت ہو گیا اور انگیٹھی پر پتیلا چڑھاتے ہوئے مزید شاقی کے بندوبست کرنے میں مشغول ہو گیا۔

یہ گفتگو تقریباً ویسی ہی تھی جیسی کہ حسن صاحب سے "کیا بات ہے.. اور کوئی بات ہے" کے سلسلے میں کی اور شاہی میں کی تھی..

یہ پرخطر اور فلسفیانہ برف بارہ کا اختتام کو پہنچا تو میں نے پھر سے سلسلہ کلام شروع کیا

"اگر برفباری شروع ہو جاتی ہے تو پھر کیا ہوگا ابراہیم؟"

"صاحب پھر دیکھیں گے.. اگر تو کم برف اترتا ہے تو آگے جائیں گے اور اگر بہت ہے اور رکتا نہیں ہے برف پڑتا جاتا ہے تو ہم ادھر پیچھے کیمپ واپس اتر آئیں گے اور اس کے رکنے کا انتظار کریں گے.. لیکن پرواہ نہیں ہے صاحب.. پار جائیں گے انشاءاللہ"

"گلیشیئر میں دراڑ تو نہیں؟"

"نہیں صاحب.. بہت نہیں.. دو چار ہی تو ہو گا.. گلیشیئر میں دراڑ تو ہوتا ہے صاحب ورنہ وہ گلیشیئر کیسا.. لیکن ادھر کوئی آسانی سے گرتا نہیں جب تک کہ اس کی اپنی مرضی نہ ہو.. وہ سے کے پار ہو کر ہم پھورا وادی میں اتریں گے اور اسی نام کے گلیشیئر کے بلند کناروں پر چلتے ہوئے شام تک فرخ چتر تک پہنچیں گے.."

"راستہ کیسا ہے؟"

"بس مسافت ہے صاحب.."

"خوبصورت ہے؟"

"پتہ نہیں صاحب.. بہت بار ادھر آیا ہے لیکن کبھی غور نہیں کیا.. بس مسافت ہے"

جیسے مجھ سے کوئی پوچھے کہ تارڑ صاحب آپ جب اپنے گھر سے.. گلبرگ سے نکلتے ہیں اور شہر جاتے ہیں.. اپنے ناشر نیاز احمد کے پاس سنگ میل جاتے ہیں تو کیا راستہ خوبصورت ہے تو میں بھی یہی کہوں گا کہ بس مسافت ہے.. میں اس قبرستان کو تو نہیں دیکھوں گا جہاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی شہزادی بمبا سدرلینڈ دفن ہے.. نہر کنارے خزاں رسیدہ پاپلر یا اس کے پانیوں میں ڈولتی بطخوں کی شاخوں پر غور نہیں کروں گا.. راستے میں پڑتی ٹریفک لائٹس پر غور نہیں کروں گا.. یا کشمی بلڈنگ کو دیکھوں گا جہاں مشہور ہوتا تھا.. اس پوسٹ آفس پر نظر کروں گا جہاں راجندر سنگھ بیدی ہوا کرتا تھا.. نہ ہی مونٹی روڈ میں امرتا پریتم کو دیکھوں گا اور نہ.. جب گھر کے سامنے زمزمہ توپ پر تو چھوڑوں گا جس پر زیادہ کپلنگ کا کردار کم براجمان ہوا کرتا تھا.. میرے لیے تو یہ ایک معمول کی.. رزق کی تلاش کے لیے.. ایک محض مسافت ہوگی..

"کاظمی اس کا پتہ کرو کہیں ندی میں لڑھک ہی نہ گیا ہو" عمران خیمے میں قہقہے لگانے لگا۔
"ہاں اگر وہ لڑھک گیا ہے تو اب تک سمندر کی جھیل میں جا گرا ہوگا پتہ کرنے سے
فائدہ" یہ کہہ کر کاظمی بھی اپنے باس کے قہقہے میں شامل ہو گیا۔
"تارڑ صاحب" میاں صاحب نے پھر سرگوشی کی "یہ اس مرتبہ آپ اپنے ساتھ کیا اٹھا
لائے ہیں... عجیب جانگلوس قسم کی چیزیں ہیں..."
"ارے تو میاں صاحب جانے دیں..." کاظمی قہقہے سے فارغ ہو کر پھر میاں صاحب
سے مخاطب ہو گیا۔ اب مجھے بھی شک ہوا کہ وہ جان بوجھ کر پاگل بنا ہوا ہے... کچھ پاگل پنے پر کا
ہوا ہے ورنہ مکمل طور پر اپنے حواس میں ہے...
"جانے دیا..." میاں صاحب بھی اس کی تیاری سمجھ گئے...
"لیکن مسٹر تارڑ صاحب..." وہ انگلیوں سے سر و ہتھیلی میں ایک نقشہ سا بنانے لگا "میں
اگرچہ ایک جونیئر بچہ ہوں پھر بھی آپ مجھ سے یہ تو پوچھئے کہ میں نے برف سفید پتلے کے
بارے میں کیوں پوچھا تھا۔"
"کیوں پوچھا تھا؟"
"دراصل آج جب آپ نے وہ کہیں بلند پہاڑوں والی نظم پڑھی تھی اور میں نے پاس
سے کھڑے ہو کر آپ کی بنیان تلے سے ہاتھ گزار کر آپ کی ٹی شرٹ کے گلے میں ٹیک مائک لگایا تھا
تو اس وقت مجھے وہ گورا پتلا یاد آ گیا تھا۔"
"کس کا پتلا؟"
ابراہیم اپنے گھٹنوں پر سر رکھے مسلسل کوشش کر رہا تھا کہ یہ سمجھ جائے کہ ہم کیا باتیں
کر رہے ہیں لیکن سب کچھ اس کے سر سے گزر رہا تھا۔
محسن صاحب کے چہرے پر ایک عجیب طاری اور پرسکون مسکراہٹ پھیل رہی تھی اگرچہ
ان کی خراشوں میں سے ابھی تک ٹیسیں اٹھ رہی تھیں جنہیں وہ دانت بھینچ کر برداشت کر رہا تھا... میاں
صاحب بھی اس رات میں خوش تھے... کبھی اپنی عینک درست کر کے مسکراتے اور کبھی منہ بنا لیتے...
البتہ شاہد ابھی تک اپنے سفید جاسوسی ہیٹ سے جدا نہیں ہوئے تھے اور اپنی موٹی
عینک کے پیچھے سے ایک متروک شدہ وحشی آدمی کی مانند آنکھیں جھپکاتے تھے...
عمران اپنے خیمے میں تھا اور گفتگو کے دوران وہیں سے لقمے دیئے جا رہا تھا... سلیم شاہد

سو رہا تھا اور بمشکل آنکھیں کھلی رکھتا تھا...
گدا اور گرد... شاید سو چکے تھے... شاید جاگ رہے تھے...
اس ٹریک میں ایک اور افسوس ناک بات سامنے آئی... پورٹر بھی فرقہ واریت کا شکار
تھے... چنانچہ جو سنی عقیدے کے تھے وہ الگ رات بسر کرتے تھے اور جو شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے
تھے ان کا ڈیرہ الگ ہوتا تھا...
جب میں نے کاظمی سے جو اس شب ہماری واحد تفریح تھا یہ پوچھا کہ کس کا پتلا تو وہ
بڑے اشتیاق سے بیان کرنے لگا "سر جی آپ تو ہمیں جونیئر سمجھ کر گھاس نہیں ڈالتے... حقیر سمجھتے
ہیں لیکن میں ٹیلی ویژن کا ایک نہایت ہٹ پروگرام "الالی ڈا" بھی پروڈیوس کرتا رہا ہوں... اور اس
دوران فلم انڈسٹری کی بڑی بڑی... یہاں میں بھی بڑی بڑی اداکاراؤں کو شوٹ کرتا رہا ہوں...
تو جناب والا آپ خود میڈیا کے بندے ہیں جانتے ہیں کہ شوٹ کرنے سے پہلے آواز کے لیے
ٹیلنٹ کو ٹیک مائک لگانا پڑتا ہے... کچھ خواتین تو خود ہی لگا لیتی ہیں اور کچھ کہتی ہیں کہ کاظمی بھائی...
اور یہاں اس نے ٹی ٹی کر کے کاظمی بھائی کاظمی بھائی کی گردان کی "کہ کاظمی بھائی آپ خود ہی
لگا دیں... تو حضرت صاحب میں ایک اچھے بھائی کی طرح... نہایت ادب اور احترام کے ساتھ جس
طرح آپ کو لگایا تھا تو ان کی قمیضوں اور قمیصوں وغیرہ میں ہاتھ ڈال کر ان کے گلے میں مائک
لگا دیتا ہوں اور سر جی میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اکثر کے نیچے کچھ نہیں ہوتا صرف پیڈنگ ہوتی
ہے..."
"اوئے ہوئے تو یہ سب ٹھگی کا ہوتا ہے؟" میاں صاحب کو بے حد افسوس ہوا۔
"کاظمی... تم بہک رہے ہو... تم کسی ایک برف گورے بدن کی بات کر رہے تھے"
"سوری سر..." وہ پھر شرمندہ ہوا اور انتہائی سنجیدہ ہو کہ مجھے پھر اس پر ترس آنے لگا
"تو سر آئی ایم سوری میں ذرا آف ٹریک ہو گیا... تو ایک مرتبہ وہ مدیحہ شاہ تھیں ناں؟"
"ہاں ہے شاید..."
"سر مدیحہ شاہ ہوتی ہے یقیناً ہوتی... شاید نہیں ہوتی"
"کاظمی..." میں نے سیدھا پوچھا کر اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کی "یہ جو مدیحہ شاہ ہے یہ
اول اول میرے ڈرامہ سیریل "سورج کے ساتھ ساتھ" میں انٹروڈیوس ہوئی تھی اور اب بھی
اگر اتفاقاً کہیں آمنا سامنا ہو جائے تو ایک استاد کی حیثیت سے اتنا احترام کرتی ہے کہ باقاعدہ

''درہ ملنزا اور گلیشیئر کے پار..ایک مجبوری برفباری''

نیلے گگن پر سفید بادل امڈتے تھے..
نیلے گگن کے تلے..

اور ان سفید بادلوں میں ساون کی گھنگھور گھٹاؤں ایسے کچھ بادل تھے جو نیلاہٹ پر بچھے جاتے تھے..ایک مرمریں دھند کی مانند..

پتھروں کے ایک وسیع ملبے کے اوپر..بلندی پر..جہاں آ رہن تھی..جب کہ میں چڑھائی چڑھتا اپنے پھیپھڑوں کی ناتوانی کو سانس سے بھرنے کی جستجو میں منہ کھولے ہانپتا تھا اور جب رک کر اوپر دیکھتا تھا تو نیلے گگن پر سفید اور مرمریں بادل اسی رنگ کے ہاتھیوں کی مانند مستی میں جھومتے اٹھتے تھے..

تو وہاں..مجھ سے بہت اوپر جہاں دھان رنگی روئے رہا تھا وہاں میرے ساتھیوں کی رنگ رنگ جھلکیاں نظر میں..ایک پتھروں سے اٹے ہوئے خشک منظر میں..رنگ بھرتی تھیں..

نیلی..پیلی اور زرد جھلکیاں..محسن کا نیا ڈاؤن کوٹ..گرو آ یوسف کی لال لال سرخ پی کیپ..

سب وہاں پہنچ چکے تھے اور میں پیچھے رہ گیا تھا اور اب ان کو نظر میں رکھتا اوپر آ رہا تھا..

کل کی شب اگر گزری تھی تو ظاہر ہے آج کی صبح بھی ہوئی تھی..

اور جب صبح ہوئی تھی اور میں اپنے خیمے سے باہر آیا تھا تو کچن کی نیلی ترپال کے قریب ایک پتھر کے گرد بہت سارے یاک ہنگامہ کر رہے تھے..بڑبڑا رہے تھے آپس میں الجھ رہے تھے اور اس پتھر پر پڑی کسی سفید شے کی چاہت میں پاگل ہو رہے تھے..

معلوم ہوا کہ وہ شے..نمک کا ایک ڈھیلا ہے..

عمران یاکوں کو نزدیک سے شوٹ کرنا چاہتا تھا اور وہ نزدیک نہیں آتے تھے تب ایک پورٹر نے بتایا کہ صاحب یاک..نمک کے بے حد شوقین ہوتے ہیں..نمک چاٹنے کو مل جائے تو اپنی یاکئی کو بھول جاتے ہیں چنانچہ ان کو پاس بلانے کے لیے ایک پتھر پر نمک کا ایک ڈھیلا رکھ دیا گیا تھا اور اسے چاٹنے کی جستجو میں ایک دوسرے کو دھکیلتے تھے اور عمران انہیں کلوز اپ میں شوٹ کر رہا تھا..

مجھے کچھ کچھ یاد ہے کہ زمانوں سے پیشتر نسبت روڈ اور گوالمنڈی کی دکانوں کے تھڑوں پر ہندو حضرات خیرات کے طور پر گئوماتا کی خوشنودی کے لیے نمک کے بڑے بڑے ڈھیلے رکھ دیتے تھے..اور گائیں سارا دن اس نمکین ضیافت سے لطف اندوز ہوتی رہتی تھیں..ان مسلمان یاکوں کی خصلت بھی قدرے ہندوانہ تھی کہ نمک چاٹنے کے لیے اپنے برادران اسلام کو ٹکریں مارتے تھے..

یاکوں کے اس رنگین نظارے کے علاوہ میرے لیے اور دیگر ساتھیوں کے لیے آج صبح میں ایک اور دھچکا تھا..

وہ خیمہ گاہ کہ ہم نے اسے کل شام میں اور پھر تاریکی کی اداسی میں دیکھا تھا اور اس کے آس پاس اور پس منظر میں جو کچھ تھا وہ ہماری نظروں سے اوجھل رہا تھا..ہم اگرچہ ایک بلند اور بے روح فصیل کے سائے میں تھے لیکن ہم وہاں تھے جہاں شانی پیک کے تینوں گنبد چھو لینے کی نزدیکی میں تھے..نیچے ندیاں تھیں..گلیشیئر تھے اور نباتات برنائی حیرت کدے تھے..

ہم پہاڑوں کی اوٹ میں پناہ گزیں یہ نہ جان سکے کہ ہم کہاں خیمہ زن ہیں..صرف صبح نے..اور سورج کی اولین کرنوں نے آس پاس کی بلندیوں پر جب اپنی روشنی نچھاور کی تو ہمیں احساس ہوا کہ ہم کہاں تھے..اور ہم ناشکری کے مرتکب ہوئے تھے محض تاریکی اور تھکاوٹ کے باعث..

ناشتے کے ذرا بعد ہم اس چٹانی فصیل پر چڑھنے لگے جس کے دامن میں ہم نے رات گزاری تھی اور چیونٹیوں کی طرح چڑھنے اور رینگنے لگے..

یہ چڑھائی اتنی بھی آسان نہ تھی جتنی کہ ابراہیم نے بیان کی تھی..اس میں دو چار سخت مقام بھی آتے تھے..یہ مقام جان لیوا تو نہیں تھے لیکن بدن لیوا ضرور تھے..

اس بلند فصیل کے اوپر پتھروں کی ایک سلطنت آباد تھی..

اور یہاں ہم سب اپنے اپنے [illegible] میں..الگ الگ ہو گئے..

بلند پتھر یے کنارے تھے جن پر چلتے ہوئے آپ اپنا توازن کبھی برقرار رکھتے تھے اور کبھی نہیں رکھتے تھے..

وہاں زمین نہ تھی.. گھاس بھی نہ تھی.. محض پتھر تھے جن پر چلتے چلتے.. کہ انہی پتھروں پر چل کر.. اگر آ سکو تو آؤ.. ہم اگرچہ نہیں آ سکتے تھے لیکن آ گئے کہ ہم مجبور اور لاچار تھے..

اور جب میں نے ایک بار اوپر دیکھا اور نیلے گگن تلے رنگ رنگ کی چند جھنڈیاں دیکھیں.. افق پہ کچھ برفپوش آبشار نظر آئے تو مجھے ڈھارس ہوئی کہ ہاں اوپر ایک بلند درہ.. ایک گلیشیئر ہو سکتا ہے ورنہ ہماری خیمہ گاہ سے اوپر دیکھتے ہوئے یہی گمان ہوتا تھا کہ اوپر کچھ بھی نہیں ہے..

اوپر دیکھتے ہوئے اور پھر چڑھتے ہوئے یہی خدشہ تھا کہ جب میں ٹاپ پر پہنچوں گا تو وہاں کچھ بھی نہ ہوگا..

لیکن جب میں ان جھنڈیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے بلند ہوتا وہاں تک پہنچا تو وہاں کچھ تھا..

وہ وہاں تھا..

پتھروں کی بادشاہی کی سنگ دلی کے بعد جب میں اوپر پہنچا تو وہ وہاں تھا..

ایک ہموار سطح پر کھڑے ہی اس کا آغاز ہو جاتا تھا.. برف زار سامنے تھے.. اور تاحد نظر تھے.. ان کا.. اس برف سفید کائنات کا کوئی انت نہ تھا.. کوئی حساب نہ تھا..

میں نے درہ ہنزہ کو اپنے ذہن میں.. سنولیک اور بالتورو کے بعد اتنا معمولی سمجھ لیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک کاغانی گلیشیئر ہوگا جس پر سے درجنوں بھیڑیں بھی آسانی سے گزر جاتی ہیں.. لیکن یہ تو ایک باقاعدہ اور مفرور گلیشیئر تھا.. جس کے کناروں پر جتنی بھی بلندیاں تھیں اونچی برفوں میں ڈھکی ہوئی تھیں.. بجانب خپ اور شخند تھیں..

یہاں سے دائیں جانب اترنے سے آپ چھورا کے راستے پر آتے تھے اور اگر برفوں کی مسافت طے کرتے بائیں جانب رخ کرتے تھے تو حیال درے کے پار چپورخند میں جا نکلتے تھے.. دیا تر درے کا راستہ بھی یہیں سے نکلتا تھا..

یہ جو ہنزہ گلیشیئر یکدم ہماری نظروں کے سامنے نمودار ہو گیا تھا اس میں صرف ایک ہی خوبی نظر آتی تھی کہ یہ بدن دریدہ نہ تھا.. کم از کم جہاں سے ہم اسے دیکھ رہے تھے وہاں سے نہ تھا.. اندر کے بھید ہم نہیں جانتے تھے.. جیسا کہ پہلی ملاقات میں ایک بظاہر معصوم اور نہایت نیک

خصلت دکھائی دیتی خاتون کے بارے میں آپ یقین نہیں جان سکتے کہ پوشیدگی میں اس کا بدن کیا ہے.. دریدہ ہے یا نہیں..

یہاں جانے کے لیے درّہ ہوا..

ہم ہنزہ گلیشیئر کی اس وسعت کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھے..

یہ درہ تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا..

اگرچہ وسیع تھا لیکن اس کے باوجود ہماری نظر اس کا احاطہ کر سکتی تھی..

ہمیں دائیں جانب اترنا تھا..

ہم نے.. ہمارے پورٹروں نے اور ہم نے اس پر قدم رکھا تو اس کی برف سخت تھی.. نرم نہ تھی کہ چلنے میں دشواری ہوتی.. یہ بس ہمارے بوٹوں کے نیچے آ کر کرچ کرچ کرتی اور ہمیں گزر جانے دیتی.. اس میں کوئی کھائی کوئی گہرائی نہ تھی.. یہ کسی حد تک کھیل تماشا تھا.. نوکیلے پتھروں اور پگڈنڈیوں کی نسبت اس پہ چلنا آسان تھا.. محض ماحول بنانے کی خاطر ہم نے اسے تشویش سے دیکھا پھر ذرا چلنے کی کوشش کی لیکن بات نہ بنی.. صرف بلندی مشکل میں ڈالتی تھی اور سانس سنبھال کر چلنا پڑتا تھا..

ہمارے دیکھتے دیکھتے نیلے گگن پر جو بادل تھے وہ گھنے ہوتے گئے اور پھر ایک دھندی چھا گئی.. موسم خراب ہو رہا تھا.. لیکن ہمیں پروا نہ تھی ہم موسم سے بھی زیادہ خراب تھے.. آہستہ آہستہ آگے پیچھے چلتے رہے.. بچھڑتے گئے..

اور تب جب ہم اس کے درمیان میں پہنچے ہیں اور نیچے پتھروں کا وہ سرخ کنارہ نظر آنے لگا ہے جس پر ہم نے برف کی دنیا چھوڑ کر اترنا ہے تو.. برفباری شروع ہو گئی.. یہ کوئی باقاعدہ بھاری.. دفن کر دینے والی برفباری نہیں تھی.. مینہ کی بوندیں تھیں جو ہوا میں آ کر سفید ہو گئی تھیں.. جم گئی تھیں اور ہمارے چہروں اور جیکٹوں پر گرنے لگی تھیں.. اور گرتے ہی پگھل بھی جاتی تھیں..

پہلا سوال ظاہر ہے کہ ٹلی کی جانب سے آیا "سر یہ کیسی برفباری ہے؟"

"یہ ویسی ہی برفباری ہے جیسی کہ برفباری ہوتی ہے"

"مجھے قبول ہے.." وہ پھر سے بندر ہو گیا اچھلا کودا برف کو چہرے پر ملتا وہ اپنی زندگی کی پہلی برفباری انجوائے کر رہا تھا..

ہاں زندگی کی پہلی برفباری تو ہر شخص کے لیے ایک ہیجان خیز طلسم ہوتی ہے.. جیسے پہلی

محبت میں در کھلتے ہیں.. جیسے کرسمس کی شب میں اپنے کالج کے پرنسپل کے گھر میں مدعو نوجوان طالب علم پیانو پر بیٹھی اس کی حسن آمیز بیٹی کی صرف ایک نگہ التفات کے منتظر ہوتے ہیں تو کوئی مہمان اندر داخل ہو کر اطلاع دیتا ہے کہ... باہر برفباری ہو رہی ہے..

یا مانچسٹر میں بھاری برفباری کے فوراً بعد ایک جنگل ہے جس کی ہر شاخ سفید ہے اور جب برف کا بوجھ بڑھتا ہے تو وہ جھٹک کر اسے خالی کرتی ہے تو سنانے میں سرسراہٹ ہوتی ہے اور میری لینڈ لیڈی کا گھگنا سا کش نیریر کنواری برف کی دبیز تہہ میں دھنسا جاتا ہے اور اس کے بالوں کے گرد برف کے گولے بن جاتے ہیں اور جب وہ چل نہیں سکتا تو میں اسے گود میں اٹھا کر گھر لے آتا ہوں اور آتش دان کے سامنے رکھ کر اس کے بالوں کی برف پگھلاتا ہوں..

یا ریڈ مناد کیمپ کی سویر میں ہماری نظروں کے سامنے سرسبز پہاڑ سفید ہوتے ہوئے کہ برفباری نے ہمیں آ لیا تھا..

تو برفباری.. پہلی برفباری پہلی محبت کی مانند ہیجان خیز ہوتی ہے اسی لیے میں بوکھلی کی کیفیت سے آ گیا تھا.. اگرچہ یہ کوئی خاص برفباری تو نہ تھی صرف بارش تھی جو سفید ہو کر برس رہی تھی ..میری سفید چترالی ٹوپی کی سفید اون کو مزید سفید کر رہی تھی.. میری نیلی جیکٹ پر سفید پھول گرا رہی تھی.. میرے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں پناہ لیے ہوئے تھے لیکن وہ میرے کانوں پر گرتی انہیں سن کر رہی تھی.. انہیں بے حسی کے قریب لے جاتی تھی.. بائیں ہاتھ پر برفپوش پہاڑ اونچے تھے اور وہاں یقیناً ان برفباری میں شدت آ چکی تھی.. ہم بائیں جانب اتر رہے تھے..

"کیوں میاں صاحب کچھ روح میں بالیدگی پیدا ہوئی؟" میں نے میاں صاحب کو پکارا..

وہ رک کے سوچ میں پڑ گئے "تارڑ صاحب بہت زیادہ سوچیں تو شاید تھوڑی سی پیدا ہو جائے ورنہ یہ گلیشیر تو مال روڈ ہے.. ہاں البتہ برفباری نے اس کی کرافٹنگ میں کچھ چاشنی پیدا کر دی ہے"

گلیشیر کی ہمواری میں یکدم ایک وسیع اور چوڑی دراز سامنے آ گئی..

اسے دیکھ کر کسی پوٹر نے "یا ہو یا ہو" کا نعرہ نہ بلند کیا بلکہ اسے ٹاپ کر آگے چلے گئے البتہ عمران 'کو ٹی' طاہر اور گوہر آمیز خوش ہو گئے کہ یہ ان کی زندگی کی پہلی برفانی دراز تھی.. وہ اس میں جھانکتے "ہوئے اوئے" کرتے پُرمسرت ہوتے تھے..

"سر جی.." کاظمی میرے پہلو میں آ گیا.. "بس اس میں گر نہیں جانا.. اگرچہ اس کے اندر گر کر مجھے پتہ چلے گا کہ.. بقول میاں صاحب.. گہرا ٹھنڈا کیا ہوتا ہے لیکن میں اس میں گرنا نہیں چاہتا"

"تو نہ گرو.. ذرا اوپر چلے جاؤ جہاں اس دراز کا اختتام ہوتا ہے وہاں سے دوسری جانب چلے جاؤ"

"نہیں سر.. میں اسے بے فکری سے کراس کرنا چاہتا ہوں.. اسے ناپنا چاہتا ہوں.."

"پہلے تم یہ بتاؤ کہ صبح سے تم نے کتنے سگرٹ پیئے ہیں؟"

اس نے کانوں کی لویں کھجوئیں "نہیں سر.. قسم لے لیں جو صبح سے ایک بھی لگایا ہو.."

"تو پھر ناپ جاؤ"

کاظمی نے ایک جست لگائی اور دراز سے کہیں آگے جا کر لینڈ کر گیا.. گرا اور کھڑا ہو گیا اور کپڑے جھاڑ کر انگلیوں سے "وِی" کا نشان بناتے ہوئے نہایت فخر سے اعلان کیا "سر جی آپ اپنی کتابوں میں خواہ مخواہ درازوں سے ڈراتے رہتے ہیں.. یہ تو معمولی کام ہے.. بچوں کا کھیل ہے.."

اس پر میاں صاحب کو تاؤ آ گیا مڑ کر بولے "اوئے کاظمی درازوں کی بے حرمتی نہ کر بچے.. انہیں معمولی نہ کہنا.. بچے یہ حشتی رن کی طرح تمہیں اپنے اندر کھینچ لیتی ہیں اور تمہیں پتہ بھی نہیں چلتا.. ہم سے پوچھو ہم سے" انہوں نے اپنا سرخ باونما سینہ تھپکا "یا فور پر کوئی قدم دراز کے بغیر نہیں ہوتا.. چینی بولی اور درکوت میں جو قبر بائیں دراز یں ہوتی ہیں وہ تمہارے جیسے بچے نگل کر ڈکار بھی نہیں لیتیں.. وہ تو دیسیر سے نیچے اترتے ہوئے برتنے والی دراز یں ہوتی ہیں یہ بھی خالد ندیم سے پوچھنا کہ ان میں گرنے سے قبل بندے پر کیا گزرتی ہے.. یہ ذرا معصوم سی دراز ہے اس کے آگے حتا نیک اس کا شکریہ ادا کر کہ یہ اپنی بہنوں جیسی آدم خور نہیں ہے.. درازوں کی بے حرمتی نہ کر.."

"نہیں کرتا میاں صاحب.." کاظمی سہم گیا اور دم ان لپیٹ کر چلتے گئے..

برفباری کو شاید ہماری بے اعتنائی پسند نہ آئی اور وہ صرف ہمیں متاثر کرنے کی خاطر باقاعدہ اور گھنی ہو گئی.. اتنی زیادہ ہو کہ ہمیں راستہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا.. ہر شے سفید ہو گئی.. نظروں کے سامنے جو کچھ تھا وہ سب کا سب سفیدی کے لبادے اوڑھ چکا.. یہاں تک کہ تمام کو ہوڈوں بھی سنو میں دکھائی دینے لگے.. گدہا اپنے گرد آمیز کو سہارا دیے گلیشیر کے پار لے جا رہا تھا..

لیکن یہ چند لمحوں کا کھیل تھا.. برفباری میں کمی آ گئی..
آسمان کی نیلاہٹ اور سرد رنگت میں اداسی کی نمود ہوئی.. جیسے سویرا ہونے کو ہو.. ابھی ملگجا
اندھیرا تھا.. کچھ سلیٹی سی سرد اداسی تھی..
گلیشیئر کا کنارہ آ گیا.. ہم اس پر سے اتر کر سرخ پتھروں پر آ گئے..
پتھروں پر قدم رکھا ہے تو برف سرد بارش میں بدل گئی.. جیسے وہ صرف برف زاروں کے
لیے ہی گر رہی تھی.. پتھروں پر گرنا اسے پسند نہ تھا..
ہم سانس لینے کے لیے رک گئے.. برف زاروں پر ایک آخری نظر ڈالنے کے لیے رک گئے..
اپنے بدن کے حجم کے مطابق پتھر تلاش کر کے ان پر براجمان ہو گئے اور بارش مسلسل ہوتی
چلی جاتی تھی..
عمران نے اپنے قیمتی کیمرے کو بارش سے بچانے کی خاطر ایک برساتی پہن رکھی تھی اور
وہ اس میں سر دیے ہوئے بھاری تھکاوٹ اور تھرتھراہٹ سے کیمرے کو بند کرنے میں مشغول تھا..
اس کے کیمرے کا رخ زرد جیکٹ اور اونی کیپ میں ملبوس نرم اور گداز نیلی آنکھوں
گرہام میری کی جانب ہوا "ہیلو نانی...."
گرہام اپنا سانس درست کر رہا تھا.. گدا کے کندھے کا سہارا لیے ہوئے رکا تھا.. اور گدا
اس عزت افزائی پر کہ گرہام ایسی اہم تاریخی شخصیت اس کے کندھے کا سہارا لیے ہوئے ہے
نہایت پاکیزہ اور مطمئن محسوس کر رہا تھا..
جب گرہام نے کوئی جواب نہ دیا تو عمران نے پھر پکارا کیونکہ اس کی فلم ضائع ہو رہی
تھی "نانی.. گڈ بائے نانی... اس طرف دیکھو پلیز اور برف زار کو خیرباد کہنے کے بارے میں اپنے
تاثرات بیان کرو... کم آن نانی.." گڈ بائے نانی نے کیمرے کی جانب چہرہ کیا اور ذرا شرما
کر... ذرا ہچکچا کر کہا "یہ تو خداوند کی مہربانی ہے اور گدا کا سہارا ہے کہ ہم اتر آئے.."
"تھینک یو سر.." عمران نے برساتی میں سے کلام کیا "اردو میں نہیں.. انگریزی میں اپنے
تاثرات ریکارڈ کرواؤ.. ہو سکتا ہے یہ ڈاکیومنٹری انٹرنیشنل مارکیٹ پر چلے"
نانی نے جو تاثرات ریکارڈ کروائے وہ ایسی انگریزی میں تھے جو سراسیمگی سے جدا نہ
ہوتی تھی.. لمحہ بھر کے لیے اگر جدا بھی ہوتی تھی تو پھر سے اداس ہو کر اسے چمٹا لیتی تھی... دیگر
ساتھیوں کی انگریزی بھی مختصر ہوتی.. البتہ محسن صاحب قدرے سرخرو ہیں کہ ان کی بیگم امریکی ہیں

کو اردو پڑھاتی ہیں اور وہ انہیں انگریزی پڑھاتے ہیں.. سلیم چونکا.. یوں بھی بالائی منزل خالی تھا اس لیے وہ
اس پل صراط سے بخیریت گزر گیا... بھلا اس پر کون انگلی دھرے.. اور میری انگریزی کے بارے میں
صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ وہ میری اردو سے بھی زیادہ کمزور ہے.. چنانچہ آپ اندازہ لگا سکتے
ہیں کہ وہ کتنی کمزور ہو گی.. بلکہ جاں بلب ہو گی.. پچھلے کئی روز سے کیمرے کی خاطر انگریزی بول بول
کر میرا بھیجہ نرم پڑ گیا تھا.. کوشش کرنے پر بھی میری انگریزی پر گرفت سی اے ٹی.. کیٹ
.. کیٹ معنی بلی.. اور آر اے ٹی.. ریٹ.. ریٹ معنی چوہا.. سے آگے نہیں بڑھ رہی تھی..
میاں صاحب نے البتہ انگریزی کو دھوبی پٹڑا دیا تھا اور اس کے سینے پر سوار ہو کر
گویا کہتے تھے.. ارے نامراد ہم اب بول..
شاہد صاحب چونکہ ذرا خفیہ طور پر منمنا کر بات کرتے تھے اس لیے یہ پتہ ہی نہیں چلا
کہ وہ کونسی زبان میں گفتگو کر رہے ہیں..
اگرچہ نلتر گلیشیئر اپنے تئیں خاصا معزز اور مناسب گلیشیئر تھا.. لیکن یہ ہمارا پہلا گلیشیئر نہ
تھا اس لیے ہم اس کی عزت نہ کر سکے.. اگر ہوتا تو اسے عبور کرنے پر ہم اپنے آپ کو شرپا تن زنگ
اور ایڈمنڈ ہلیری کے ہم پلہ ضرور سمجھتے..
ہم ذرا آرام کرنے کے بعد گلیشیئر کے پہلو بہ پہلو بڑے بڑے پتھروں... ٹیلوں اور
گیلی بجری پر قدم جماتے نیچے وادی میں اترنے لگے اور پھر... ایک مرتبہ پھر برف پر آ گئے کیونکہ نلتر
گلیشیئر کی دم وادی میں اتر رہی تھی.. اور یاد رہے کہ ہم وادی نلتر سے جدا ہو چکے تھے اس لیے ادھر
سے چھوٹا گلیشیئر کہلاتا تھا.. گلیشیئر کی یہ دستی دم بہت دور تک جا رہی تھی.. ہم نے اسے ناپسند کیا.. یہ
کوئی بات نہیں کہ ہم اسے عبور کر آئے تھے اور اب ایک مرتبہ پھر اس کی پوشش پر.. اس کے سرد
بدن پر ہمیں سفر کرنا تھا.. یہ تو کوئی بات نہ تھی.. صریحاً زیادتی تھی..
یہ برف بالکل پتھر تھی.. اس پر بے دھیانی اور اطمینان سے نہیں چلا جا سکتا تھا.. قدم
پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا تھا.. اگرچہ ہمارے جوتوں سے وہ پھسلتی نہیں تھی..
بلندی البتہ کم ہو گئی..
یہاں تک کہ برف زار نظروں سے اوجھل ہو گیا.. اوپر رہ گیا..
لیکن یہ ایک عجب انداز کی دم گلیشیئر کی دم تھی جو پوری وادی کو بھرتی تھی اور ختم نہ ہوتی
تھی.. بائیں ہاتھ پر بھی برف انباروں سے ڈھکے پہاڑ تھے.. ہم گدلا اور بے لطف تھا اور زنگوں

میں جتنی سکت تھی نچڑ چکی تھی.. درّے کو عبور کرنے کا چاؤ اور چلبلاہٹ دم توڑ چکی تھی اور تھکاوٹ اس طور پر کرتی تھی جیسے ہم نڈھال کر دے گی..

کہیں کہیں اکا دکا دراڑیں بھی منہ چھوڑے منتظر ہوتی تھیں لیکن ہم ان کو نظر انداز کر رہے تھے..

اس برف زار پر چلتے مدتیں بیت گئیں..

وہ منظر جس دکھاوا اٹھا آزمائش تو اب شروع ہوئی تھی..

طاہر ایک ایسے ستون کی طرح جس کی تعمیر میں خرابی واقع ہو گئی تھی.. شپ شپ کرتا.. لمبے لمبے ڈگ بھرتا.. نہ احتیاط کرتا اور نہ یہ دیکھتا کہ آگے کیا ہے منہ اٹھائے وادی کو دیکھتا ایک نائٹس وائیٹ کی مانند چلتا جا رہا تھا..

البتہ کاظمی چہرے سے اداس ہو گیا تھا "سر جی.. اب برفباری نہیں ہو گی؟"

"شاید نہیں.. کیونکہ ہم بلندی کم کرتے نیچے ہو رہے ہیں"

"اور اگر ہم واپس بلندی پر چلے جائیں تو وہاں برفباری ہو رہی ہو گی؟"

"وہاں جا کر دیکھ لو.." میں نے چڑ کر کہا..

"اور سر وہاں پتہ ہے کیسی برفباری ہو رہی ہو گی.. ویسی جیسی کہ برفباری ہوتی ہے"

میں اب مسکرانے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا..

"کاظمی تم نے کبھی دریا میں قدم رکھا ہے؟"

"کیوں نہیں سر جی.. وادی میں بہت بوٹنگ کی ہے.. نہائے بھی ہیں"

"تو دریا کے پانی بھی ایک جیسے نہیں رہتے.. جن پانیوں میں تم ایک بار اترتے ہو دوسری بار اترنے سے وہ پانی نہیں رہتے.. وہ گزر گئے ہوتے ہیں.. وہ ایک اور دریا ہوتا ہے.. ایسے ہی برفباری ہوتی ہے.. تم بے شک دوبارہ اوپر درّے تک چلے جاؤ لیکن اب وہاں جو برف گر رہی ہو گی وہ نہیں ہو گی جو ایک گھنٹہ پیشتر تم پر روئی کے سفید گالے اتارتی تھی.. اب وہ سفیدی اور ہو گی وہ گالے اور ہوں گے اور تمہیں پہچان نہ پائیں گے.. تو دوبارہ اوپر جانے سے فائدہ؟"

"ہاں فائدہ.." اس نے سر ہلایا "اگرچہ میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں لیکن فائدہ.."

"برف کا ایک بگولا.. ایک داوردلا.. جس کی نیلی برفوں کے کنوئیں میں سے میرے ابا جی کی آنکھیں مجھے دیکھتی ہیں"

ہم سے کچھ فاصلے پر پورٹروں کا قافلہ رکا ہوا تھا.. برف کی سفیدی پر ہمارا سامان ڈھیر تھا.. ایک ایک رک سیک اور ڈرم جیسے سفید کینوس پر رنگین تصویر کی صورت میں دکھائی دیتا تھا.. میاں شاہد.. حسن اپنی ورکنگ سنگس برف میں گاڑے کھڑے تھے.. نہایت اداس اور سنجیدہ جیسے کوئی ٹریجڈی ہو گئی ہو.. انہیں یوں کھڑے دیکھ کر میرا دل دھڑکا.. شاید کوئی حادثہ ہو گیا ہے.. کوئی پورٹر دراڑ میں گر گیا ہے..

میں تیز تیز چلتا اور پھسلتا قریب ہوا تو وہاں کھڑے ابراہیم نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں مجھے خبردار کیا "صاحب سیدھے مت آؤ.. ذرا اوپر سے ہو کر ادھر آؤ.."

"کیوں؟"

"ادھر برف کی کھائی ہے سر.. احتیاط کرو"

میرے آگے کوئی دراز نہ تھی.. البتہ پہلو میں ایک نیلی ندی تھی جو بہت دیر سے میرے ساتھ بہتی ہوئی آ رہی تھی.. گلیشئر کی برف میں راستہ بناتی چلی آ رہی تھی.. اس کے پانی نیلاہٹ سے بھرپور تھے اور جن برفوں میں سے وہ گزرتی تھی ان کا رنگ بھی شفاف نیلا تھا..

تب میں نے دیکھا کہ سب لوگ شدید فکرمندی کی حالت میں اور ڈرے ڈرے جہاں یہ ندی گم ہوتی تھی اور وہاں جو کھائی تھی اس میں جھانک رہے ہیں.. مجھے یقین ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ ہو گیا ہے..

میں ابراہیم کی وارننگ کے مطابق ذرا پرے ہو کر احتیاط سے قدم رکھتا آگے ہوا۔ آگے ایک برف میں ابھری ایک کنواں تھی جس کے دوسرے کنارے پر سب مخلوق ذری ذری جیسی قطرے پر اشتیاق تکتی اس میں جھانک رہی تھی..

میں دوسرے کنارے تک پہنچا تو وہ سب ایک کنویں میں جھانک رہے تھے..

برف کے ایک آبشاری کنویں میں۔ اور اس کا شور بے پناہ تھا.. وہ سب جھانکتے تھے.. ایک دوسرے کو تھامے ہوئے کہ کہیں وہ اس میں گر نہ جائیں.. تھکے لیکن پرشوق ہوتے.. بدن میں دوڑتے خون کے ہر قطرے میں احتیاط برتتے.. وہ ایک ایسے برفانی جنون کے طلسم کی زد میں تھے کہ آنکھیں نہ جھپکتے تھے..

میں ابھی صرف ان کے چہروں پر جو محویت اور حیرت تھی اور ہر لمحے اس کی تصویر بدلتی تھی اسے دیکھ رہا تھا.. ابھی جس میں وہ جھانکتے تھے اسے نہ دیکھتا تھا.. میں اور قریب ہوا..

وہ ندی جو میرے برابر میں گلیشیر کی برفوں میں نیلاہٹ کی کرچیاں بکھیرتی بہتی آ رہی تھی یکدم یہاں پہنچ کر ایک برفانی کنویں میں گرتی جا رہی تھی.. ایک آبشار کی صورت.. اس کے سرد اور برف ہوتے پانیوں کا حجم پرشور اور ہیبت بھری آوازوں کے ساتھ کنویں کی انتہا اور تاریک گہرائیوں میں گرتا جا رہا تھا..

کنویں کی برف دیواریں جہاں تک روشنی اترتی تھی شیشہ نیلاہٹ کے رنگ کی تھیں.. بلوریں فانوسوں کی مانند تھیں اور ان کے نیچے تاریکی تھی.. ندی کے پانی اس تاریکی میں گم ہو کر جانے کہاں جاتے تھے..

یہ ایک ایسا عجوبہ منظر تھا جو نہ تو آج تک کسی سائنس فکشن کی کتاب میں تخلیق ہوا ہے اور نہ اس نے کسی فینٹسی میں جنم لیا ہے.. یہ کسی داستان امیر حمزہ میں بھی بیان نہیں ہوا کہ یہ انسانی ذہن کی فینٹسی تخلیق ہی نہیں کر سکتی..

اوپر سے وہ منظر سے اترتی برف کناروں میں چمکتی شیشہ ندی کے پانی یکدم ایک ایسی آبشار ہوتے تھے جو دنیا کے کہیں بڑھ کر شاندار اور خوفناک کر دینے والی تھی اور یہ آبشار تقریباً بیس میٹر قطر کے ایک برفانی کنویں میں گر رہی تھی اور اس کنویں کی تہہ کہاں تھی وہ تو دکھائی نہیں دیتا تھا.. صرف اس آبشار کے گرنے کا شور تھا جو کہیں پاتال سے اٹھتا اوپر آتا تھا اور کانوں کو بہرا کرتا تھا..

کنواں بھی برف کا ہے.. پاتال بھی برف اور اس میں گرتے پانی نیلگوں شیشہ اور شور!

اس سے پیشتر میں نے بیافو گلیشیر پر ایک ایسا کنواں دیکھا تھا.. لیکن وہ بہت چھوٹا سا تھا اور اس میں پانی کی ایک چھوٹی سی نالی گرتی تھی.. یہ کیفیت نہ تھی..

میں جب آہستہ آہستہ اس کے گرد چلتا دوسری جانب گیا ہوں جہاں میرے ساتھی چمک چمک کر اسے دیکھتے تھے اور جب میں نے اس سفید خواب کنویں کی نیلی جھلک دیکھی تو بے اختیار اس میں جھانکنے کے لیے آگے بڑھا تو سیم نے مجھے باقاعدہ دھکا مار کر پیچھے کر لیا کہ نہیں تارڑ صاحب.. خطرناک ہے.. اور یہ خطرناک تو تھا ایک پل میں آپ اس میں جھانکتے ہیں اور پھسل کر دوسرے پل میں اس آبشار کے ساتھ نیچے چلے جاتے ہیں تو کہاں جاتے ہیں.. کوئی گر کر واپس آئے تو بتائے کہ کہاں جاتے ہیں..

البتہ ایک مہربانی تھی.. ایک آسانی تھی کہ اس کے کنارے ایسے ڈھلوان نہیں تھے کہ انسان لڑھک کر پھسلتے ہوئے اندر گر جانے والے نیچے تھے..

میں آگے بڑھ کر اس میں نہ جھانکوں یہ تو ممکن نہ ہوگا.. جھانکنا تو مجھے بہر حال تھا.. بنا اس سفید مرگ میں جھانکے میں یہاں سے جانے کو نہ تھا.. میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ جو آبشار گر رہی ہے اور اس کے سرد شیشہ چھینٹے میرے چہرے پر کر بیتوں کی مانند برستے اسے بیچ کرتے تھے تو کہاں تک گرتی ہے.. اس سفید بھید کی تہہ کہاں ہے.. میں نے ہر صورت یہ پتا لگانا تھا.. برف مجھے ہر.. کہتا تھا.. اور بہت غور کرنے سے مجھے ایک ترکیب سوجھی "ابراہیم.."

ابراہیم میرے قریب آ گیا "جی صاحب.."

"دیکھو میں ادھر برف پر لیٹتا ہوں اور تم پیچھے سے میرے دونوں پاؤں پکڑ لو.. میں آہستہ آہستہ برف پر کھسک آگے ہو تا کنویں کے کنارے تک جاتا ہوں لیکن میرے پاؤں مضبوطی سے پکڑے رکھنا چھوڑنا نہیں.."

ابراہیم اگرچہ ایک اچھی روح تھی لیکن اس کنویں کی مرد موت اس کے سامنے تھی اور وہ روح اسے دیکھ کر پرواز کرنا چاہتی تھی "چھوڑیں صاحب.. خطرہ ہے"

"اگر تم میرے پیروں کو پیچھے سے مضبوطی سے پکڑے رکھو گے تو اتنا خطرہ نہیں لیکن ابراہیم تمہیں آتش نمرود کی قسم میرے پیر نہ چھوڑنا.."

"کیا صاحب؟"

"کچھ نہیں.. بس میرے پاؤں نہیں چھوڑنے.."

میں نے اپنا مختصر رک سیک اُتار کر برف پر پھینکا.. پہلے اپنے جوگرز کے تسمے کھول کر دوبارہ کسے کہ کہیں ڈھیلے ہونے کی صورت میں ایسا نہ ہو کہ وہ ابراہیم کے دونوں ہاتھوں میں رہ جائیں اور میں کنویں میں گر جاؤں.. پھر میں اپنے دونوں بازو پھیلا کر برف پر سیدھا لیٹ گیا جیسے بدھ حضرات مہاتما کے مجسمے کے سامنے لیٹ جاتے ہیں یا نئے کارڈینل حلف اٹھاتے وقت پوپ کے سامنے لیٹ جاتے ہیں.. ابراہیم نے پیچھے سے میرے دونوں پاؤں اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیے اور میں رینگتا ہوا کنویں کے کنارے تک چلا گیا.. صرف کندھے تک نہیں ذرا آگے یہاں تک کہ میرا چہرہ اب اُس خلاء کے اوپر تھا جس کے نیچے کنویں کے بھنور میں آبشار دھادھم گر رہی تھی.. میری جان.. جاگرز میں اٹکی ہوئی تھی جنہیں ابراہیم نے جکڑ رکھا تھا..

گھسٹتا ہوا جب میں آگے ہوا تھا تو میرا پورا بدن ان ہتھیلیوں تک جنہیں میں ایک تیراک کی مانند برف پر چلاتا آگے ہوا تھا ایک برفیلی اور منجمد کیفیت میں چلا گیا تھا لیکن جونہی میرا چہرہ اس گہرے غار کنویں کے اوپر آیا تو آبشار کے پانیوں کے نیچے جو اتھاہ گہرائی تھی وہاں سے جو کہر آلود اور تند برفیلی ہوا ایک مرغولے کی طرح اٹھتی تھی یہ چہرہ اس کے راستے میں آیا تو گویا مردی سے حنوط ہو گیا..

چنانچہ میرا بدن تو برف تھا لیکن اس میں زندگی کی رمق اور حرارت ابھی بجھی نہیں تھی لیکن چہرہ جو تھوڑی دیر پاتال سے اٹھتی.. مرغولوں کی صورت میں اٹھتی برفیلی ہواؤں کی زد میں آ کر بقیہ بدن سے الگ ہو گیا اور حنوط ہو گیا..

میرا حنوط شدہ چہرہ کنویں میں جھانکتا تھا.. ایک بے پناہ شور اور نیلی برف گہرائی میری آنکھوں تلے تھی.. آنکھیں جنہیں مرنا ہوا اور جھپکنے دیکھنے نہیں دیتے تھے..

اور میں کیا دیکھتا تھا..

برف کی سنگ مرمر سفیدی میں گھرا ہوا کہیں کہیں نیلاہٹ میں رنگا ہوا ایک برف مرغولہ جس میں سرد لہریں گرجتی ہوئی والے پانی گرتے چلے جاتے تھے.. گرتے چلے جاتے تھے.. اور وہ کہاں تک گرتے چلے جاتے تھے.. اس کا کوئی انت نہ تھا.. کچھ پتہ نہ چلتا تھا.. بس ایک کہکشاں خلا تھا جس میں یہ پانی کوئی گھومتے گرتے تھے.. یہ کوئی بلیک ہول تھا جو پانی کی کائناتوں کو اپنے اندر کھینچتا.. چوستا انہیں ہمیشہ کے لیے معدوم کر رہا تھا..

میرا حنوط شدہ چہرہ آنکھیں نہیں جھپکتا تھا.. اور یہ آنکھیں جیسے وقت کی ایک برف غار

میں اترتی جا رہی ہیں.. آبشار کے ساتھ گرتی جا رہی ہیں اور اس غار کے آخر میں کوئی روشنی دکھائی نہیں دیتی.. گھپ اور سرد اندھیرا ہے..

ابراہیم کبھی کبھار خوفزدہ ہو کر مجھے پیچھے گھسیٹ لیتا اور میں ہاتھ چلاتا تیراکی کرتا پھر سے آگے ہو جاتا کہ برف کے اس منہ زور سانپ نے مجھے مسحور کر رکھا تھا..

وہ کچھ کہتا تھا.. شاید یہی کہ صاحب اب پیچھے ہو جاؤ لیکن پانیوں کے بے انت شور میں کچھ سنائی نہیں دیتا تھا اور اگر میں کچھ سن بھی لیتا تو جان بوجھ کر ان سنی کر دیتا کہ کون ہے جو ایک برفانی تاج محل کے اندر چلا جائے اور پھر اپنی مرضی سے واپس آ جائے..

کون ہے جو ایک نئی کائنات کے بھید کے اندر سفر کر رہا ہو اور اپنے قدم روک لے..

اس کنویں میں سے.. برف سنگ مرمر کے گول کٹے ہوئے دائرے میں سے ایسی سرد ہواؤں کے مرغولے اٹھتے تھے جو آج تک کسی اور کے چہرے کو نہیں چھوئے تھے.. تو میں کیسے پیچھے ہو جاتا..

مجھے یہ مرغولے اپنی لپیٹ میں لے کر کہیں کو کہیں لے جا رہے تھے..

وقت کی غار میں سفر کرتا میں کہیں کا کہیں جا رہا تھا..

ان مرغولوں میں میرے بچپن کی تصویریں گھومتی چلی آتی تھیں..

ایک فوٹوگرافر کے سٹوڈیو میں ایک اونچے سٹول پر بیٹھا ہوا ایک گول مٹول بچہ.. گیلس کے ساتھ نیکر پہنے ہوئے.. پس منظر میں پردے پر ایک پہاڑی منظر ہے.. اور بچے کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہیں.. شاید وہ کیمرے سے خوفزدہ ہے.. کتنے برس پہلے.. صرف ستاون برس پہلے..

میرے دادا جان چوہدری امیر بخش ایک سادہ دہقان اتنے ہی برس پیشتر مجھے اپنے کندھوں پر اٹھائے لاہور ریلوے سٹیشن کے قریب ایک چڑیا گھر تک لے جا رہے ہیں کہ وہاں کچھ انگلیاں ہیں جنہیں دیکھ کر میں خوش ہو جاتا ہوں.. اور وہ سارا دن کھائے پیے بغیر مجھے انگلیوں سے کھینچتے رہتے ہیں اور اپنے انگوٹھے پڑتے وہ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں..

میرے ابا جی کی نیلی آنکھیں اس کنویں کی برفیلی دیواروں میں کہیں دکھائی دیتی ہیں اور پھر ہمیشہ کے لیے پتھر ہوتی ہیں.. سنو فلیک پر پرواز کرنے والی تتلیاں جو کنویں کی تہوں سے اڑتی آتی تھیں میرے حنوط شدہ چہرے سے ٹکراتی تھیں اور وہ بھی برف کی ہیں اور گرجتوں میں بکھرتی ہیں.. پھر سے آبشار کے پانیوں میں شامل ہو کر نیچے چلی جاتی ہیں.. میرے چہرے کے پیچھے ایک ایسا حیرت کدہ تھا کہ جو کبھی آسمانوں سے اترتا ہے اگر میں اس سے اس کی خواہش کرتا تو وہ میرے

چل رہے تھے.. اور اپنے آپ کو دائیں جانب گرنے سے بچاتے تھے.. وہ کمبخت گلیشیئر ابھی تک نیچے چلا آ رہا تھا.. اور بائیں جانب گرنے سے گریز کرتے تھے کہ ادھر پتھروں کے انبار تھے..

جب کسی کو پتہ چلا کہ دوپہر ہو چکی ہے.. دن ڈھلنے کو آ رہا تھا اور ہم نے ابھی تک پیٹ پوجا نہیں کی تھی۔ "ابراہیم!"

وہ کہیں آس پاس تھا ضرور بولا "جی صاحب؟"

"یار لنچ کدھر گیا.. کب کرے گا.. کہاں کرے گا؟"

"صاحب اس اوپر گلیشیئر کے کنارے کو جہاں ختم ہو رہا ہے.. وہاں پہنچ.. بہت نیچے جدھر کچھ گھاس ہے کچھ درخت زندگی کی نشانی دے رہا؟"

"نہیں رکنے کا... سیدھا"

"ابھی رکنا نہیں ہوئے گا.. تو ادھر رکنے کا اور لنچ کرے گا.. ادھر تو رکنے کا کوئی جگہ نہیں۔"

یہ ایک انتہائی اذیت ناک وقفہ...

ہر کوئی نڈھال ہو چکا تھا.. ہم صبح سے چل رہے تھے اور بدن کی توانائی خوراک کی کمی کے باعث بھی.. اور تھکن کے باعث بھی.. ہوتی جاتی تھی۔

برف کنوری کی آبشار کی ٹھنڈک بدن سے رخصت ہو چکی تھی اور اب یہ جسم تھا سلگتا ہوا اور بوجھل تھا۔

خدا خدا کر کے دائیں جانب جو ڈھلوانیں تھیں اور یہ پسندیدہ خشک گلیشیئر اب تک چلا آتا تھا ختم ہوا.. ہم اس اُجڑے اور دھول کی رست سے نیچے آئے.. نیچے آئے تو سخت نا معقول پتھروں کی دنیا میں آ گئے.. قدم بقدم ٹھوکریں کھاتے.. گرتے پڑتے.. جہاں کسی بہت اس نے اجازت تھی کہ ہم ایک روٹی کے لیے.. مٹھی بھر چاولوں کے لیے اور ایک خیمے میں استراحت کی خاطر.. اپنا عقیدہ بدل سکتے تھے..

نہ ہم چل سکتے تھے.. نہ ہم رک سکتے تھے..

اب اس جسمانی اور ذہنی اذیت کے بیان کو کیا طول دینا.. قصہ مختصر کرتے ہیں تو شام کے پانچ بج رہے ہیں.. ہم ٹھوکریں کھاتے گرتے پڑتے.. ٹھوکریں کھاتے ایک گھاس بھری ڈھلوان تک یا خوش قسمتی میں جہاں ہمارے پورٹر کب کے استراحت فرما رہے ہیں اور ہمیں اس مقام پر پہنچ کر تھکن سے چور ہوتے دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

"صاحب لنچ بنائے گا؟" ابراہیم ہماری جانب آ گیا جو ہمارے جذبات کی جانب آ گیا..

بنائے گا... بنائے گا... ہر جانب سے انہی کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں جو کہہ رہی تھیں کہ ہم ترت چکے ہیں.. ہمیں خوراک سے چونکہ ہم بھوکے ہیں.. ہم تھکے ہیں..

"تم رات ادھر کرے گا؟"

"نہیں صاحب ابھی صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر سرخ پتھر کا علاقہ ہے.. آپ اُدھر پہنچے گا تو خوش ہو جائے گا.. رات اُدھر کرے گا۔"

"تو ابراہیم آپ ہمیں اُدھر ہی خوش کر لینا.. ادھر لنچ بنائے گا تو رات ہو جائے گا.. چلو۔"

پورٹروں نے میرے اس فیصلے پر خوشی کا اظہار کیا.. کچھ سر پھروں نے منہ بنائے اور بڑبڑائے اور ہم پھر سے چلنے لگے..

اگرچہ ابراہیم نے یہ بیان دیا تھا کہ سرخ پتھر کیمپنگ صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے لیکن اس نے ہمیں یہ نہیں بتایا تھا اس مسافت کے درمیان میں ہم کو تین ایسے پہاڑی نالوں کی تقریباً خشک گزرگاہیں واقع ہیں جن کے کنارے بے حد بلند ہیں اور ان میں اترنا اور نیچے پہنچ کر دوسرے کنارے پر چڑھنا صرف اور صرف بکریوں.. اور جنگلی بکریوں کے بس کی ہے۔

یہ ایسے نالے تھے کہ جب آپ جھاڑیوں اور درختوں میں سے گزر کر ان کے کناروں تک آتے تھے تو نیچے جانے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا کیونکہ وہاں راستہ تھا ہی نہیں تھا.. ایک خیالی کنکریلی سیڑھی دیوار ہوتی تھی.. جس کے دامن میں آپ کو اترنا ہوتا تھا.. آپ یہاں پورٹروں کے ہاتھ تھام کر ایک خلا میں لڑھکتے ہوئے نیچے ہوتے تھے.. نالے کے پانیوں کے پار جاتے تھے تو دوسرا کنارہ عرش سے باتیں کر رہا ہوتا تھا.. اور اس کی باتیں ختم ہی نہیں ہوتی تھیں کہ آپ اس سے درخواست کریں کہ محترم ہم پردیسی لوگ ہیں ہمیں ذرا خیریت سے گزر جانے دیں آپ کی بڑی مہربانی.. یہاں بھی پورٹر ہمیں ایک ڈولی کی صورت دونوں جانب سے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر ہمیں اٹھا کر اوپر لے جاتے تھے..

پار ہوتے ہیں تو ایک گھنا جنگل آتا ہے.. شاید وہ اتنا گھنا نہ ہو لیکن شام کے اترنے سے اور آنکھوں میں تھکاوٹ کا اندھیرا اترنے سے وہ گھنا ہی دکھائی دیتا تھا.. وہاں آپ سانس درست کرتے ہیں.. کچھ دور چلتے ہیں تو ایک اور نالے کے بلند کنارے پر جا معلق ہوتے ہیں۔

ایک اور نالے کے بلند کنارے پر ہم تادیر کھڑے رہتے ہیں کہ وہاں سے نیچے اترنے

"برچ کے سفید جنگلوں میں ایک سویر.. جو دھند میں غرق تھی.."

بہت دیر کے بعد کھلا کہ میں خواب میں تھا.. نیند میں نہیں.. جاگ چکا ہوں.. میں اس ہوں اور ایک ونڈر لینڈ میں ہوں..

ہر شے دھند میں ڈوبی ہوئی ہے.. پورا جنگل ڈوبا ہوا ہے.. جیسے ایک پورا شہر پانی میں ڈوب جائے.. دھند میں غرق ہے اور جیسے کہیں پانی کم ہوں تو اس شہر کا کوئی برج کوئی مینار کوئی چھت نظر آ جاتی ہے ایسے کہیں دھند کم ہوتی تھی تو اس میں سے کوئی نیم جاں سیدھا برچ کا درخت ایک اپاہج گداگر کی مانند ظاہر ہونے لگتا تھا.. کوئی ایک ایسی ٹہنی دکھائی دے جاتی تھی جس کی سفیدی دھند سے الگ ہو کر تارڈ اور کیفے چینٹ کی، تنہ چمکتی تھی.. کہیں ایک سوختہ شجر ایک آسیب کی طرح ظاہر ہونے لگتا ہے.. اور کبھی برچ کے جنگلوں میں کہیں کہیں نیم پوشیدہ ندی کے پانی پاؤں بھگو دیتے تھے..

میں ہر قدم احتیاط سے رکھتا تھا.. آنکھیں بند کر کے رکھتا تھا کہ کہیں دھند میں ملفوف سوکھی ٹہنیاں ان میں چبھ نہ جائیں. البتہ چلتے ہوئے یہ شاخیں اور ٹہنیاں میرے بدن کو مسلسل کریدتی تھیں..

برچ کے جنگل میں اس سے میں تنہا چلتا تھا.. چلتا تھا اور گم ہوتا تھا.. اس کے پیڑ پتے جھاڑیاں اور زمین پر بچھی گھاس سب کے سب ان چھوئے تھے اور مجھے چھونے کی کوشش کر رہے تھے.. کہ میں پہلا شخص تھا جو ان میں آ گیا تھا.. یوں لگتا تھا جیسے وہ آج تک کسی بھی ذی روح سے نا آشنا تھے اور ان میں تجسس تھا کہ یہ کون جانور ہے جو اس وقت.. جب رات ابھی پوری طرح رخصت نہیں ہوئی.. سویرا ابھی ٹھیک طرح سے نہیں اتری.. بدقسمتی.. ابھی گھپ اندھیرا سا جو دن سے جدا ابھرا لگتا ہے..

رات بھر میں نیند میں مدہوش رہا.

مدہوش ارادتاً تھی لیکن سحر خیزی کی عادت نے جو الارم میرے اندر نصب کر رکھا تھا اس نے مجھے بیدار کر دیا.. میں اپنے تئیں لاہور میں تھا اور مجھے اب اپنا بستر ترک کر کے.. چہرے پر چند چھینٹے ڈال کر.. جوگنگ سوٹ بدن پر کھینچ کر.. ماڈل ٹاؤن پارک میں صبح کی سیر کو جانا تھا.. ٹریک پر چلتے ہوئے.. دوسری جانب سے نیم تاریکی میں نمودار ہونے والے شیخ صاحب.. سردار صاحب.. بیگ صاحب.. قاضی صاحب اور شاہ صاحب کو بلند آواز میں السلام علیکم کہتے ہوئے دو چکر پورے کرنے تھے.. لیکن پھر کھلا کہ میں لاہور میں نہیں استاد محمد علی کے گل بوٹوں سے تراشے ہوئے ثقیل پایوں والے پلنگ پر نہیں بلکہ کہیں اور ہوں.. میرے نیچے زمین سخت ہے اور بے حد سردی ہے اور میں اپنے سلیپنگ بیگ میں پیک شدہ جاگ رہا ہوں لیکن کہاں ہوں؟

ایک نامعلوم چراگاہ میں.. کہیں بلند پہاڑوں میں..

میں اگرچہ پھر سے آنکھیں موند کر نیند میں غرق ہو جانا چاہتا تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا.

صرف اس لیے کہ میری درمیانی منزل میں پانیوں کا بوجھ تھا جو مجھے بے چین کرتا تھا.. مجھے ان سے نجات حاصل کرنے کی خاطر مجبوراً اٹھنا پڑا.. جوگرز چڑھانے اور خیمے سے باہر آ گیا..

میرے ہاتھوں سے ابھی تک بھنے ہوئے گوشت کا ذائقہ چھوٹا تھا..

باہر تقریباً رات تھی..

الاؤ کی سرد راکھ اور ادھجلی برچ کی لکڑیوں کے گرد چند پورٹر مدہوش پڑے تھے.. بکرے کی کھال ایک خشک تنے سے لٹکی تھی اور شاید مجھ سے فریاد کرتی تھی کہ اے سنگدل شخص تم نے مجھے ہی کیوں چنا تھا.. میرے کسی اور ساتھی کو چن لیتا تو میں اس وقت اپنے ریوڑ میں زندہ ہوتا اور بآں بآں کر رہا ہوتا..

میں اس لٹکی کھال میں بکے ہوئے بدن تھا اس کا ذائقہ محسوس کر کے شرمندہ ہوا اور اس سے نظریں چرا کر بائیں جانب ایک ڈھلوان پر چڑھتے جنگل کے اندر چلا گیا..

دراصل مجھے یہ احساس نہ ہوا کہ میں جنگل کے اندر جا رہا ہوں کیونکہ دھند ہر سو بکھری ہوئی تھی اور میں اس میں بھٹکتا اپنے خیمے سے ذرا دور ہو کر اپنے آپ کو ہلکا کرنا چاہتا تھا.. اور جب میں فراغت حاصل کر چکا تو تب ظاہر ہوا کہ میں دراصل برچ کے درختوں کے ذخیرے میں اتر چکا

ہوں.. بھٹکتا ہوں.. شکر ہے کہ تنہا ہوں.. کہ برف خود سفر کر رہی ہے.. اس کی شناخت ممکن نہیں ہے.. میں فارغ ہو کر اپنے قدموں خیمہ گاہ میں واپس بھی آ سکتا تھا لیکن یونہی بھٹکتا.. ایک عجیب سفید جنگل میں بھٹکتے ہوئے مجھے اچھا لگ رہا تھا.. دھند رخصت ہو چکی تھی.. آنکھیں کھلی تھیں لیکن ان کے سامنے دھند کی سفیدی کے سوا کچھ نہ تھا.. اب بھی کوئی نہیں.. ایک شاخ ایک شجر.. اور پھر دھند کے حرکت کرتے سفید لبادے..

البتہ ایک غلطی ہو گئی تھی.. میں اپنے تئیں صرف چند لمحوں کے لیے خیمے سے باہر آیا تھا تا کہ اپنے آپ کو ہلکا کروں اور واپس چلا جاؤں.. اور صرف ایک سویٹر میں آیا تھا چنانچہ اب میں ٹھٹھر رہا تھا.. اور ٹھٹھر سے آتی تمام ہوائیں اسی وادی میں شوخی اڑاتی تھیں اور یہاں اپنے سامنے برچ کا ایک گھنا جنگل پا کر الجھ جاتی تھیں جیسے موسم بہار میں مرغزار چمن کے پاؤں پھولوں میں الجھ جاتے ہیں.. اس رکاوٹ کے باوجود سردی اپنا ٹھنڈا رنگ دکھاتی تھی اور میں ٹھٹھر رہا تھا..

میں نے کچھ دیر اپنے آپ کو بھری دور کے شاہکار مجسمے "دی تھنکر" کے سٹائل میں ایک ٹیلے پر براجمان ہونا پایا.. کچھ دیر بچار میں گم ہونا چاہا لیکن گھاس بھی اتنی یخ تھی کہ اس پر بیٹھے رہنا برداشت میں نہ آتا تھا.. اس نے لمحوں میں میری نشست خاص کو پھر سے ٹھنڈا کر دیا اور میں اسے سہلاتا ہوا پھر سے جنگل میں بھٹکنے لگا..

دھند کی سفیدی اب گھٹتی جاتی تھی.. اس کا گھنا پن چھدرا اور ہلکا ہونے لگا تھا جیسے گاڑھی لسی میں پانی ڈالنے سے اس کی گھنی سفیدی ہلکی ہونے لگتی ہے.. دھند کے ذرے الگ الگ دکھائی دینے لگتے ہیں.. یہ اس لیے ہو رہا تھا کہ دھند کی رخصتی کا لمحہ آن پہنچا تھا.. اور سویرا ہونے کو تھی..

برف کے اندھے کنوؤں میں گرنے والے پتی کے مرغولے روشن ہونے لگے..

گھاس کے تنکوں میں کہیں کہیں جو اکا دکا پھول پوشیدہ تھے ان کے رنگ نظر آنے لگے تھے.. دھند اپنے قدموں لوٹ رہی تھی.. جنگل کو خالی کر رہی تھی..

اور میں نہیں جانتا کہ وہ کونسا لمحہ تھا جب سورج کی پہلی شعاعیں برچ کے اس سفید جنگل میں نقب لگا کر داخل ہوئیں اور دھند کو چیرتی ہوئی برچ کے ہر شاخ اور ہر ٹہنی کو منور کرتی چلی گئیں..

یہ ایک معجزہ نما تبدیلی تھی.. کرنوں کے زرد برچھوں کے آگے دھند کی سفید گمشدگی اور تاریکی ہتھیار ڈالتی جاتی تھی اور دھوپ غالب آتی جا رہی تھی..

دھوپ ہر شجر کے پہلو میں سے ہو کر نکلی تھی..

جہاں ہوا دار جنگلی پھولوں اور گھاس پھونس میں اپنی روپہلی چمک بھرتی ہوئی نمایاں ہو رہی تھی. میں نے طلوع آفتاب کا ایک منظر ہرات میں.. ملکہ گوہر شاد کے مقبرے سے پرے ایک ٹیلے پر ایک بڑی بوڑھی سیاح کے پہلو میں بیٹھے دیکھا تھا جب شعاعوں کے تیر مینار سے شاں شاں کرتے گزر رہے تھے.. اور اب اسی.. کسی عام فرد کے تجربے میں نہ آنے والی اس کیفیت کو یہاں برچ کے ایک جنگل میں اپنے آپ پر وارد ہوتے محسوس کر رہا تھا..

جب دھوپ رنگ کا پورا جنگل عیاں ہو گیا.. دھند کا لبادہ اتر گیا اور وہ عریاں ہو گیا.. تو اس کا حسن دو چند ہو گیا..

پہلے میں بھی اب تک اس سفید پوشیدگی میں تھا اس لیے دھوپ نے مجھے بھی برہنہ کر دیا اور بے آرام کر دیا..

اب یہ محض ایک اور جنگل تھا..

اور میں محض ایک اور انسان..

اب یہاں نہ کوئی ونڈر لینڈ تھی اور نہ کوئی سفر رہا..

چراگاہ کی جانب سے پورٹروں کی آوازیں آ رہی تھیں.. وہ جاگ چکے تھے اور ناشتہ تیار کرنے کے لیے جنگل میں سے لکڑیاں اکٹھی کرنے کے لیے آ رہے تھے..

"پیاس کے صحرا میں ایک آبشاری شالیمار"

ہم ایک مرتبہ پھر ایک بکری پگڈنڈی پر بکری ہوتے اترتے اور بھورا نالے کے پاس آ گئے... یہاں اس نالے کے اوپر ایک ایسا شاندار پل تھا کہ کہیں تھا اور کہیں بالکل نہیں تھا.. برچ کے دو چار شہتیر... اور جن پر ٹہنیاں جو شاید کسی انسان نے نہیں چند بکریوں نے وہاں رکھ دی تھیں۔ یعنی اسے مرنے کے بعد جاگ ذرا اب وقت شہادت ہے آیا کا بورڈ وہاں نصب ہونا چاہیے تھا.. لیکن میری خود کی زندگی میں یہ پہلا وقت شہادت تو آیا نہیں تھا، گھبراتا... تو بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق یعنی ہم پار ہو گئے..

پار ہوئے تو دوسری جانب ذرا ویرانی تھی... ویرانی تھی.. چٹیل چٹانوں کی خشکی تھی جس پر یہاں اگر کہیں تھی تو بے رونق اور جلی ہوئی.. کسی ایک جھاڑی کا نشان بھی نہ ملتا تھا..

ایک مختصر پگڈنڈی اس خشک چٹانی بلندی پر اٹھتی تھی جس پر ہم کبڑے عاشقوں کی مانند جھکے جھکے اٹھنے لگے..

جب ہم پوری طرح اٹھ چکے... یعنی بھورا نالے سے اٹھ کر اس ویران بلندی پر پہنچ گئے تو وہاں تیز تیکھی سنسنی دھوپ ہماری منتظر تھی..

یہ تیز دھوپ گھات لگائے بیٹھی تھی۔ ہمیں بہت دیر سے گھورتی رہی تھی لیکن ہم برچ کے جنگلوں میں پوشیدہ چلتے تھے اور وہ ہمارا سراغ نہ پا سکی تھی کہ وہاں کی شفاوت میں چھید کر کے ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھی.. اور اب جب ہم ایک چٹیل ڈھلوان پر چڑھ کر اوپر ایک پگڈنڈی پر آ گئے تھے تو اس کے گرم جال میں آ گئے تھے..

اس نے بہت دیر انتظار کیا تھا اس لیے غصیلی ہو چکی تھی.. غضب ناک ہو چکی تھی..

وہ ہم پر یوں اتری کہ ہمارے بدنوں کو جلا کر رکھ دیا۔

تاحد نظر ایک تنگ وادی چلی جاتی تھی..

نہ کوئی شجر تھا اور نہ کوئی سایہ.. بس دھوپ تھی.. چٹیل بلندی تھی اور نیچے بھورا نالہ تھا جو کہیں نیچے تھا.. گہرائی میں.. کبھی دکھائی دینے لگتا اور کبھی ڈھلوان کی اوٹ میں غائب ہو جاتا اور صرف اس کا شور باقی رہ جاتا... پگڈنڈی پرخطر نہ تھی.. لیکن احتیاط پھر بھی لازم تھی کہ دائیں جانب جو ڈھلوان تھی اس پر اتفاق کرنے سے.. یقیناً بھورا نالے تک کرتے ہی چلا جاتا تھا..

بعض مقامات پر وادی تنگ ہو جاتی.. نالے کے پار کی چٹانیں اتنی قریب ہو جاتیں کہ ہم انہیں سنگسار کر سکتے تھے.. ان پر پتھر پھینک سکتے تھے... وہ اتنی نزدیک آ جاتیں.. اتنی کہ ہمارے اور ان کے درمیان کسی نالے کا وجود ممکن نہ لگتا..

جہاں تک ہم دیکھ سکتے تھے ایک خشک اور ویران گھاٹا نظر آتا تھا جس کے ایک جانب خشک پہاڑوں میں ایک پگڈنڈی بل کھاتی کبھی نہ ختم ہونے والی بے جان کیفیت میں چلی جا رہی تھی..

کبھی اس یکسانیت میں کوئی سخت مقام بھی آ جاتا.. پگڈنڈی غائب ہو جاتی اور اس کی بجائے گہرائیوں پر ایک گیلری سی معلق ہوتی.. چند ٹہنیاں.. کچھ پتھر.. اور ہم سانس روک کے کچھ نہ کچھ پڑھتے سانس روکے اس پر سے پھونک پھونک کر قدم رکھتے گزر جاتے.. اور پھونک بھی آہستہ مارتے کہ کہیں وہ گیلری ہل نہ جائے..

جہاں ہم وادی کا اختتام سمجھتے وہاں جو دم مار کر کے موڑ کے پاس پہنچتے تو ایک اور ویران وادی سامنے آ جاتی جس پر ہماری لامتناہی پگڈنڈی بے تکان بل کھاتی چلی جاتی..

اگرچہ یہ ایک پہاڑی سفر تھا لیکن یہاں ایک صحرا کی مسافت ایسی پیاس تھی..

ہماری تھرماس میں جتنا پانی تھا وہ ہم پی چکے تھے..

سورج سوا نیزے سے بھی نیچے ہو کر قریب آ چکا تھا... تیز سے تنگ آ گیا تھا اور ہم سے برچ کے جنگلوں میں پوشیدگی کا بدلہ لے رہا تھا..

کمال اور کرنل میرزا کو فرق ہم سے الگ ہو کر آگے چلا گیا تھا اور اب نظروں سے روپوش ہو چکا تھا.. صرف ہم تو پیچھے جو ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے تھے..

نیپ اڑتی اور پر غبار گرم مسافت تھی.. نہ آس پاس کوئی منظر تھا اور نہ کسی بادل کا کوئی شائبہ یا نشان.. ہم اس تنگ وادی میں قید تھے اور دھوپ کا کڑا پہرہ تھا.. ہم پیاس اور پسینے

سے پچھڑتے تھے..

خیال تھا کہ کہیں پیٹ پوجا کے لیے رکیں گے..لیکن آج تو صرف مشقت..تھکاوٹ اور پیاس کی پوجا کا دن تھا..

دوپہر ڈھلنے لگی..لیکن یاد رہے کہ صرف دوپہر..سورج نہیں..وہ بدستور آدھے سر پر رہتی..اس کی تمازت اور کرنوں کی آتش فشاں ذرہ ذرہ جلتی تھی..کبھی کوئی ایسا موڑ آتا جب ہم پل بھر کے لیے سائے میں چلے جاتے تو وہاں اپنے رک سیک اتار کر گرم چٹانوں کے ساتھ ٹیک لگا کر ہانپنے لگتے..

ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اس تنگ وادی کا کوئی اختتام نہیں..کوئی انجام نہیں..ہم چلتے ہی رہیں گے اور یہ پگڈنڈی ہمیں ایک لامتناہی بل کھاتی پگڈنڈی دکھاتی..جو کہ ایک آتش برساتے سورج کی ہمسائیگی میں ہے..بس جاری رہے گی..یہ دیوارِ چین کے پار ہو جائے گی..اہرام مصر، تاج محل اور مسجد قرطبہ کو دائیں بائیں چھوڑتی دنیا کے..یا شاید کائنات کے کسی ایسے کنارے پر جا پہنچے گی جہاں سے ہم ایک قدم آگے اٹھائیں گے تو خلا میں گر جائیں گے..

کوہ نوردوں کے لیے اگرچہ انعام بھی بہت ہیں لیکن سزائیں کہیں زیادہ ہیں..

ایک یونانی فلسفی کا کہنا ہے کہ آپ کو زندگی میں جتنی بھی مسرت حاصل ہوتی ہے آپ کو اس کے عوض اتنی ہی اذیت بھی سہنی ہے..شاید ہمیں خنجراب جھیلوں..اور شاہ تلی..برف کے کنوؤں اور برچ کے جنگلوں کی قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی..

اور جب ہم گرمیوں کی آگ برساتی..کڑکتی اور لو دیتی دوپہروں میں گاؤں کی سنسان گلیوں میں کسی گندی نالی میں لوٹ کر بدن کو اس کی غلاظت میں بھگو کر تھوڑی سی آسودگی حاصل کرنے کی خواہش کرنے والے کتے کی مانند زبانیں لٹکائے چلتے تھے تو ایک موڑ پر مڑتے ہی چٹانوں کے خشک گھاؤ میں سے ایک آبشار اتر رہی تھی..

اس کے یخ پانی ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہوئے لیکن ہم بے یقین بھی ہوئے کہ پیاس کے اس صحرا میں یہ کیسے ممکن ہے..سراب ہوگا..

اور وہ آبشار ایک آبی شالیمار کی مانند چٹانوں سے تختہ بہ تختہ اتر رہی تھی..اوپر سے گرتی آتی ہے تو چٹانوں میں ایک تالاب بنتی ہے..اور پھر اس تالاب میں سے رک کے شفاف سرد پانی چھلکتے ہیں تو ایک دھارے کی صورت چٹانوں کی نوک کو بھرتے..انہیں لبریز کر کے پھر نیچے آتے ہیں..ہماری پگڈنڈی کے قریب ہو کر گزرتی ہوئے زمین ہو کر ایک اور تالاب میں اترتے ہیں..

اور پھر اسے لبالب بھر کر پگڈنڈی پر سے ایک سیلاب کی طرح رواں ہو کر کہیں نیچے گر جاتے ہیں..

ہم اس آبشار کے دامن پر اگر نہ پہنچتے تو یہ جان جھوٹ جاتی..کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا..

ہم نے اس کے قریب پہنچ کر بے اختیاری میں اپنے رک سیک اتار پھینکے..سجدہ ریز ہوئے اور اس کے سرد پانیوں میں تا کہیں ڈوب کر کہ بے شک ہم بھی ڈوب جاتے..اس کے پانی پیتے رہے تا آنکہ اس کی آبی خنکی سے ہمارے پیٹ متشکر ہوئے..ہو پیاس سے پچک چکے تھے..پھول گئے اور ان میں گنجائش باقی نہ رہی اور وہ پھٹنے کو آئے..تب ہم نے مجبوراً پی نا کہیں اٹھائیں..پھر ہم نے بیتابی سے اپنے کپڑے اتارے اور ایسے اتارے جیسے "جلتا ہے بدن" گاتے ہوئے فلم کی ہیروئن اتارتی ہے..اور اگر کسی نے اندرونیر پہن رکھا ہے تو خیر ہے نہیں پہن رکھا تو بھی خیر ہے ہم اس کے پہلے تالاب میں کود کر رنگ رلیاں منانے لگے..کبھی شفاف اور نیلے پانیوں میں اوندھے ہو جاتے تو کبھی چھینٹے اڑانے لگتے اور کبھی پتھروں میں سے نیچے گرتے پانی کے نیچے بیٹھ جاتے..کبھی ایک مختصر آبشار تلے نہاتے اور کبھی دوسری آبشار تلے سانس روک کر بیٹھ جاتے..

میاں صاحب چونکہ سنگِ نیلی کے ہیں..پھرتیلے ہیں اس لیے وہ کلکاریاں مارتے ہوئے پتھروں پر چڑھتے ذرا بلندی پر جو تالاب تخلیق ہو رہا تھا اس میں جا کر اشنان کرنے لگے..

کوشش تو میں نے بھی کی کہ اس آبی شالیمار کے دوسرے تختے تک پہنچ کر فرزند کے ساتھ ڈبکیاں لگاؤں لیکن میرا وجود بھاری اور ناہموار تھا..خدشہ تھا کہ میں اوپر جاتے ہوئے پانی میں بھیگے ہوئے پتھروں پر پھسل نہ جاؤں اس لیے میں نے پگڈنڈی کے برابر میں پہلے والے تالاب کو ہی غنیمت جانا اور اوپر سے چھینٹے اڑاتے آتے پانیوں کی برفیلی آغوش میں سرد وصال کے مزے لوٹتا رہا..

جب کچھ زیادہ ہی مزے لوٹے گئے تو ہمارے بدن نیلے پڑنے لگے..چھینکیں آنے لگیں..ہم بے اختیار کپکپانے لگے..ٹھٹھرنے لگے..ہماری بتیسیاں بجنے لگیں..ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم تن سوزک سے ہلاک ہونے ہونے کو تھے اور اب نمونیے سے انتقال کر جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا..

چنانچہ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی آبشار سے الگ ہوئے..ٹھٹھرتے ہوئے کپڑے پہنے..رک سیک اٹھائے اور پھر سے چلنے لگے..

"وادی اشکومن میں اُترتے ہیں..اور سفر تمام کرتے ہیں"

پھر سے چلنے لگے تو تنگ وادی نے پھر سے اپنے آپ کو اشکومن ندی کی صورت میں دہرایا اور لاتعلق ہو گئی.. کوئی انجام نہ تھا.. مشقت پھر سے شروع ہو گئی..

اس کچھ دیر کے لیے ہم ان بلند اور خشک چٹانوں سے اتر کر نیچے آئے تو ہمیں نالے کے پار ایک گاؤں نظر آیا.. ہریاول کا ایک ایسا جنت نظیر ٹکڑا نظر آیا کہ اسے دیکھتے ہوئے آنکھیں ہری ہو جاتی تھیں.. بدن کے در و دیوار پر سبزہ اُگنے لگتا تھا.. اسے گاؤں تو میں نے یونہی کہہ دیا کہ وہاں گھر نہ تھے.. بس سبز چارے کے کھیت تھے اور کہیں کہیں ایک آدھ جھونپڑا تھا اور خشک چارے کے ڈھیر تھے..

یہ "آخر" تھا.. کھوار زبان میں "چشمہ"..

شاید ان پر سایہ فگن چٹانوں میں سے کوئی بڑا چشمہ اُبلتا تھا اور نیچے آ کر اس کے کھیتوں اور کھلیانوں کو سیراب کرتا تھا..

یہ علاقہ ہریاول کا ایک سمندر تھا جو ارد گرد کی خشک چٹانوں کے بیچ ایک طلسم کی مانند دمکتا تھا..

اگرچہ ہم ابھی ابھی نہائے تھے.. بارش نے بدن بھگو دیے تھے لیکن یہاں تک آتے آتے حالات پھر سے دگرگوں ہو گئے تھے.. ہم نے جیسے کبھی کسی آبشار میں اپنے آپ کو بھگویا ہی نہ ہو ایسے خشک اور پیاسے ہو گئے تھے اور ہمارا جی چاہتا تھا کہ نالے کے اوپر کمندیں ڈال کر اس ہرے بھرے گھر کی آغوش میں پہنچ جائیں..

نہ صرف یہ کہ وہاں کوئی گھر نہ تھا بلکہ کوئی ذی روح بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا.. وہاں کوئی بھی نہ تھا.. اشکومن پہنچنے پر ہمیں بتایا گیا کہ لوگ یہاں سے اوپر "چشمہ" کو جاتے ہیں اور چارہ

کاشت کر کے پھر نیچے آ جاتے ہیں.. وہاں قیام نہیں کرتے..

ان ہرے بھرے نظارے سے ہم آگے چلے گئے.. وہ پیچھے رہ گیا اور پھر سے ویرانی اور خشکی کی کائنات شروع ہو گئی..

دھوپ کی حدت قدرے کم ہو گئی کہ وہ پہروں مسلسل جاری تھی لیکن چھبورا کا کوئی نشان نظر نہ آتا تھا.. پگڈنڈی پہلے سے تنگ ہونے لگی.. بکریوں کے اس راستے پر چلتے چلتے ہم بکری ہو گئے.. نہایت ہی [illegible] راستہ تھا..

جب ہماری جان بدن سے رخصتی چاہ رہی تھی اور ہماری نظر میں فرق آنے لگا تھا.. ایک کی بجائے تین تین پتھر نظر آنے لگے.. چھبورا نالے کے پانی دھندلانے لگے تو پگڈنڈی یکدم نیچے ہونے لگی اور نالے کے کنارے پر پہنچ گئی.. بے حد شور تھا.. ہم بات نہیں کر سکتے تھے.. ظاہر ہے اگر پگڈنڈی نیچے اتری تھی تو بلاوجہ نہیں اتری تھی اس نے ہمیں نالے کے پار لے جانا تھا.. سو ہم چلتے گئے.. پانیوں میں سے گزر کر نہیں بلکہ ایک پل پر سے گرتے پڑتے گزر گئے.. دوسری جانب بھی پگڈنڈی پھر سے اوپر ہوئی لیکن اس نے مہربانی کی کہ زیادہ اوپر نہیں ہوئی.. نالے کی قربت میں ہی رہی..

شام ہونے کو تھی اور شور تھا..

ہم نے کسی گائیڈ بک میں پڑھا تھا کہ اس پل کے پار چھبورا آ جاتا ہے..

ہم چلتے گئے.. لیکن چھبورا نے آنا نہ چاہا..

ہمارے گھٹنے آپس میں بجنے لگے.. ہم گرنے لگے.. گرنے لگتے تو پتھروں پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ کو سنبھال لیتے.. ہتھیلیاں بھی چھل گئیں.. ہماری نظر میں کچھ زیادہ ہی فرق آنے لگا.. کبھی دھند پھیل جاتی اور کبھی اس میں آبشاریں گرنے لگتیں اور کبھی پیاس کے صحرا جھلمل جاتے... ہمارا جی چاہا کہ ہم سفر ترک کر دیں اور قہقہے لگانے لگیں.. تب ہمیں اس دھند میں.. وادی کے آخر میں ہریاول کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آیا.. قریب ہوئے تو وہ پاپلر کے چند درخت ہوتے گئے.. اور قریب ہوئے تو وہ تیز ہوا سے جھول رہے تھے.. یہ تیز ہوا ہم ساتھ لے کر آئے تھے.. یہ پاپلر درخت چھبورا کے نالے کے اوپر تنگ وادی میں تیز ہوتی شرلاٹے بھرتی آئی تھی اور وادی کے اختتام پر اپنے رستے میں ان درختوں کو پا کر غضب ناک ہوئی ان کے بدن دوہرے کرتی تھی..

چھبورا کا پہلا گھر آ گیا..

اب چھبورا الگ ذرا پرے بہتا تھا اور ہم ادنیٰ ہاتھوں کی ہتھیلی ہوئی ایک برفانی پانی

وادی تل ایک چھوٹی سی نہر کے کنارے پہنچے تھے.. پہنچے تھے یا اپنے آپ کو لاشوں کی مانند گھسیٹتے تھے..

نل بن سے رجب نگر جانے والے چند مقامی افراد نے ہمیں اپنی جانب آتے دیکھا تو ان کے سپید چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی کہ اچھا بھلا اور بے وقوف ٹورسٹ خود کو مجبور کر کے ادھر آتے ہیں اور پریشان حالوں میں ہیں.. انہیں کس حکیم نے کہا تھا کہ یہ حماقت کریں.. ہمیں ان کی یہ مسکراہٹ زہر لگی اور ہم نے ان سے کلام تک نہ کیا..

پگڈنڈی جس پر ہم چلتے تھے پہلے آزاد تھی اب آہستہ آہستہ قید ہونے لگی.. اس کے دونوں جانب گھروں اور کھیتوں کی دیواریں ابھرنے لگیں.. کھیت میں سے ایک نوجوان ہمیں دیکھ کر کدال اٹھائے راستے پر آ کھڑا ہوا جیسے روکنے کے لیے آیا ہو.. اس کا منہ کھلا تھا اور چہرہ ناتراشیدہ لوگوں کی مخصوص جنگلی بناوٹ لیے ہوا تھا.. ہنستا ہوا.. ہمیں دیکھ کر اور زیادہ ہنسا کہ مجھے تو رب نے اسی طور تخلیق کیا تھا اس لیے مرا تو کوئی دوش نہیں لیکن تم جو.. کچھ مجبور کیے ہوئے بھی ان راستوں پر آئے ہو تو تم ہی سے پاگل کون ہوا..

اس نوجوان سے ہم نے مختصر ڈائیلاگ کیے اور آگے بڑھ گئے..

دائیں جانب ایک قبرستان کے آثار تھے..

آثار اس لیے کہ ان بلند وادیوں میں باقاعدہ قبریں نہیں ہوتیں.. بنائی باقاعدہ جاتی ہیں لیکن برفباری اور بارشوں سے ان کے ڈھیر ڈھے جاتے ہیں اور بس کچے رہ جاتے ہیں.. یہ پتہ نہیں چلتا کہ کونسا کتبہ کس قبر پر تھا.. تارڑ کا کتبہ شیخ صاحب کی قبر کے سرہانے اوندھا پڑا ہے اور شیخ صاحب پتہ نہیں کہاں پڑے ہیں.. اکثر قبریں گڑھوں میں بدل جاتی ہیں کسی شیخ صاحب کی ہڈیاں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں..

ہمیں بتایا گیا تھا کہ پھگورا کی کیمپنگ سائٹ کو اسی قبرستان سے راستہ ہو کر جاتا ہے.. چنانچہ ہم اہل قبور سے معذرت کرتے ان کے لیے فاتحہ پڑھتے ان کے کتبوں کو پاؤں تلے آنے سے بچاتے اس قبرستان میں سے گزرے اور چند کھیتوں اور گھروں اور دیواروں کے بعد پھگورا کی خیمہ گاہ میں پہنچ گئے.. کچی چار دیواری میں گھرا ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کے ایک کونے میں چند درخت تھے..

پورٹر پہنچ چکے تھے..

گدا اور گرد آمیز بھی پہنچ چکے تھے اور اطمینان سے تاش کھیل رہے تھے.. اخروٹ کے درخت تلے ہمارا سامان اور خیمے جوں کے توں پڑے تھے..

"ابراہیم" میں نے اپنے باقاعدہ مونس و غمخوار کو پکارا "ابھی تک خیمے کیوں نہیں لگائے؟"

"گدا صاحب کہتے تھے کہ تارڑ صاحب آئیں گے تو خود لگوائیں گے"

"کھانے کا کیا بندوبست ہے؟"

"گدا صاحب کہتے تھے کہ تارڑ صاحب آئیں گے تو بنائیں گے ابھی ہم تاش کھیلتے ہیں ہمارے لیے چائے بناؤ.."

میں گھاس پر گرا اور بے سدھ ہو گیا..

کوہ نوردی کا ان لکھا دستور ہے کہ جب کوئی ساتھی سب سے پہلے منزل پر پہنچتا ہے تو فوری طور پر خیمے نصب کرواتا ہے.. خوراک کی تیاری میں مشغول ہو جاتا ہے تاکہ بعد میں آنے والے ساتھی جو تھکن سے چور آئیں گے خیموں میں آرام کریں اور پھر ان کے لیے خوراک تیار ہو.. شہرت ایک "انتی" شے ہے.. آپ اپنے ہم خیال اور مشترکہ دلچسپی رکھنے والے لوگوں سے دوستی کر لیتے ہیں.. پہلے پہل وہ آپ کی قربت پر فخر کرتے ہیں اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ وہ آپ کو ناپسند کرنے لگتے ہیں کہ یہ شخص تو ہم جیسا ہے.. اس میں کوئی خاص خوبی تو نہیں تو اسے ہر جگہ اولیت اور توقیر کیوں دی جاتی ہے.. وہ آپ کے حوالے سے نامور ہو جاتے ہیں کہ آپ دوستی میں ان کی بے جا توصیف کرتے ہیں اور پھر وہ آپ کو ناپسند کرنے لگتے ہیں..

صرف میں ہی نہیں.. حلیم.. میاں.. حسن اور شاہد بھی اسی طرح سے بے سدھ گرے کہ نہ خیمے نصب ہیں اور نہ چولہا گرم ہوا ہے اور اخروٹ کے ایک گھنے شجر کے نیچے بے سدھ گرے.. یہ صرف عمران.. کوشی اور طاہر تھے جو ابھی تک مکمل طور پر چاق و چوبند اور پھرتیلے تھے اور ایک مرتبہ پھر بندر ہو چکے تھے..

عمران نے میرے عالم بے سدھی میں خلل ڈالا اور نیکر نول کر بولا "سر آپ تو جونوں کی اور رُٹے ہیں.. ٹھیک ہے عمر کا تقاضا جو ہوا.. ہم لوگ تو دو گھنٹے پہلے پہنچ گئے تھے"

"تو مجھ پر احسان کیا ہے.." میں نے غضبناک ہو کر کہا.. "میں پہنچ تو گیا ہوں ناں.. تم میری عمر کے ہو گے ناں تو کہیں بھی نہیں پہنچو گے.. زیادہ سے زیادہ تمہاری خاک پہنچے گی جہاں کا خمیر تھا.. کچھ سمجھے؟"

"نہیں" اس نے دانت نکال کر کہا "لیکن سر کیا گاؤں ہے یہ پھگورا کا اور کیا وادی ہے اشکومن کی.. ہم نے آپ کی آمد سے پہلے پھر چیرے.. کچھ گھر اور کچھ کھیت شوٹ کیے ہیں.. سر اس

وادی میں بھی ایک گھر ہونا چاہیے.. کیا خیال ہے؟"

"نیک خیال ہے.. میں یہاں پہلی بار نہیں آیا" میں اپنے عالم بے سُدھی میں سے اٹھا "میں چند برس پیشتر اس گاؤں سے گزر کر آگے بہت تک گیا تھا.. اور وہاں سے "پاک سرائے" کے ٹریک کا آغاز کیا تھا.. یہ جو گاؤں کے پار ایک وسیع پھیلاؤ والا دریا ہے یہ اشکومن ہے اور اس کے پار جو بلند درّے ہیں وہ وادی یاسین میں اُترتے ہیں.. کچھ کوہ نورد طرز ٹریک مکمل کر کے اس دریا کے پار اترتے ہیں اور پھر ان بلند درّوں کو عبور کر کے وادی یاسین میں جا نکلتے ہیں۔"

"تو کل صبح چلتے ہیں ناں سر".. کاظمی نے دانت نکال دیے..

"ہاں جی ہاں جی.. ظاہر ہے الف لیلیٰ کے ایک ناکام جن کی مانند سر ہلایا تو اس کے کانوں کی بالیاں بھی ہلنے لگیں..

"مجھے کوئی اعتراض نہیں.." عمران بولا..

مجال ہے جو ان تینوں پر اس مسافت کا کوئی اثر ہوا ہو.. شاید وہ ہم سے جدا کوئی اور نسل تھے.. انسان نہ تھے.. بندر سے تھے.. ان پر تھکاوٹ اور پہاڑی مشقت اثر نہ کرتی تھی..

"نہیں.. کل صبح جیپیں ہمیں لینے کے لیے آ جائیں گی.. ہم گلگت جائیں گے اور وہاں سے سیدھے رُکے بغیر لاہور جائیں گے.. ہم انسان ہیں تمہاری طرح بندر نہیں ہیں.. نہیں سمجھے؟"

"سمجھ گیا سر.. تو پھر یہ فیصلہ ہو گیا ہے کہ ٹریک کا اختتام ہو گیا ہے.. تو اس صورت میں اس ڈاکومنٹری کے آخری منظر کے لیے آپ ذرا میرے ساتھ آ جائیں.."

"کہاں؟"

"قبرستان میں.."

"قبرستان میں تو کندھوں پر اُٹھا کر لے جایا جاتا ہے.. میں خود بخود چلتا ہوا کیسے چلا جاؤں؟"

"ویسے تو ہم تینوں آپ کو کندھوں پر اٹھا کر بھی لے جا سکتے ہیں لیکن سر مذاق الگ.. میں چاہتا ہوں کہ.."

"نہ تم چاہنے والے کون ہوتے ہو.."

"میں آپ کا ہدایت کار ہوتا ہوں سر.. اتنے دنوں سے مکمل تعاون کرتے رہے ہیں تو آخری شاٹ کے لیے بھی تعاون کیجیے.. میں چاہتا ہوں کہ آپ ٹریک کے اختتام پر ایک قبرستان

میں گلے میں مالا ڈالے کسی بے نام قبر کے کتبے تھامے ہوئے.. یعنی کسی اور قبر کے کتبے کو تھامے ہوئے کیمرے سے مخاطب ہو کر کہیں.. خواتین و حضرات میں کتنا خوش بخت ہوں کہ اس خوفناک اور حیرت ناک مہم سے زندہ بچ کر آ گیا ہوں.. پکھورا پہنچ گیا ہوں، نہ پہنچتا تو اسی قبرستان میں ہوتا.. شاید اس کتبے پر میرا نام ہوتا.. چلیں؟"

میں اپنے آپ پر جبر کر کے زبردستی اس بے ہودہ کیفیت میں سے اٹھا اور عمران اور اس کے بغل بچوں کے ہمراہ اس قبرستان میں چلا گیا.. مالا گلے میں ڈالا اور اپنی بڑھی ہوئی داڑھی اور سرخ آنکھوں سے کیمرے کو گھورتا اداکاری کرنے لگا "خواتین و حضرات اگرچہ میری مسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں کہ میں طرز پکھورا مہم کے آخر تک خیر و عافیت پہنچ گیا ہوں لیکن یہ کتبہ جو میں نے تھاما ہوا ہے اس پر میرے نام کا امکان بہت کم تھا.. اگر میری قسمت میں ایک گمنام قبر میں ہونا ہوتا تو یہاں نہ ہوتا.. بر الدو.. یا تو یا سپر کی کسی بھی دراز میں ہوتا ہوتا.. میں سنولیک یا درہ ہسپر.. چٹی بوئی یا درہ وروت میں دفن ہوتا.. یہاں نہ ہوتا.. اس لیے کہ یہ ٹریک ان کی نسبت محض بچوں کا کھیل تھا.. اگرچہ بچوں کے کھیل میں بھی کسی کی جان چلی جاتی ہے.. ٹھیک ہے؟"

"سر جی" عمران کیمرے میں سے سر نکال کر دھاڑا "سچ نہ بولیں.. جھوٹ کی انتہا کر دیں.. ڈرامہ کریں.. کوئی ہولناک بات کریں.. کوئی ایسی بات کریں کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں.."

"سوری.." میں نے معذرت کی.. "یعنی لوگ عشق کی انتہا چاہتے ہیں اور تم جھوٹ اور ڈرامے کی انتہا چاہتے ہو تو عمران مجھ سے بہتر تم اور کسی کو نہ پاؤ گے.. شاٹ دوبارہ کرو"

"او کے.." عمران نے کیمرے میں سر گھسا کر مجھے اشارہ کیا "گو.."

"خواتین و حضرات.." میں ایک نہایت المناک شکل بنا کے شروع ہو گیا "میں اس انتہائی خوفناک مہم سے زندہ بچ کر بالآخر پکھورا کے گاؤں میں پہنچ گیا ہوں جہاں کل صبح دو جیپیں آئیں گی اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو گلگت لے جائیں گی.. ان جیپوں کی بجائے کل ایک تابوت بھی آ سکتا تھا.. میرے سائز کا.. کیا ایسا.. دنیا کا خطرناک ترین ٹریک ہے کہ بہت کم لوگ زندہ بچ کر آتے ہیں.. میں نے خود اپنی آنکھوں سے راستے میں جگہ جگہ مُردہ کوہ نوردوں کے ڈھانچے دیکھے ہیں.. اب اس قبرستان کو دیکھیے جس میں میں کھڑا ہوں اس میں بیشتر قبریں ان کوہ نوردوں کی ہیں جو اس ٹریک کے دوران ہلاک ہو گئے.. وہ میری طرح خوش قسمت نہیں تھے.. یہیں کہیں میری

قبر کا کتبہ بھی واضح طور پر پڑھا جاتا اور اس پر میرا نام لکھا ہوتا... اگرچہ اسکولی کے کتبہ نویسوں کو میرا نام لکھنے میں بے حد دشواری ہوتی لیکن کتبوں پر درج ناموں کے ہجے کون چیک کرتا ہے... مستنصر کا "س" "ص" سے لکھا جاتا یا "ص" "س" سے تو کون چیک کرتا ہے... لیکن اگر قسمت یاوری نہ کرتی تو میں بھی ان بے نام قبروں میں سے ایک ہوتا... اور بے نام قبروں پر کوئی دیا جلانے بھی نہیں آتا... آپ بھی نہ آتے کہ... وادی اسکولی بہت دور ہے... خدا حافظ!"

"مادھری والا آپ نے تو کمال کر دیا... آج اخیر کر دی... یہ ڈاکومنٹری ہٹ ہے سر" کامران اینڈ کمپنی نے کیمرہ آف کیا، اپنا ساز و سامان سمیٹا اور گھوڑوں کو شوٹ کرنے کی خاطر قبرستان سے اتر کر میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے... اب میں ان کے لیے بیکار ہو چکا تھا... وہ پروفیشنل لوگ تھے... مجھے استعمال کرنے کے بعد وہ مجھے ترک کر گئے... کوڑے کے ایک ڈھیر پر پھینک گئے...

اب میں آپ سے... اس قبرستان کی تنہائی میں صرف آپ سے... اپنے پڑھنے والوں سے مخاطب ہوتا ہوں کہ آپ مجھے کبھی ترک نہیں کرتے "خواتین و حضرات... اگرچہ اس سفرنامے کے آغاز میں میں نے اقرار کیا تھا کہ یہ سفر اس لائق نہیں کہ اسے بیان کیا جانا چاہیے... البتہ اس کے کچھ کردار ایسے ہیں جو اس لائق ہیں یا نالائق ہیں کہ انہیں بیان کیا جانا چاہیے... لیکن اب اس کوہ نوردی کے اختتام پر مجھے یہ اقرار کرتا ہے کہ اگر دنیا بھر کی جھیلوں میں سے سب سے آئینہ دار اور رنگ در رنگ منظر جھیلوں کو بیان نہ کرتا... ہر شام ابر شاہی کی ڈھلوانوں پر سے اترتے ایک تنہا فانوس کی سمتوں سے اٹھنے والی دھول اور دھند کو تحریر میں نہ لاتا... تین سروں والی شاہی پیک میں سے گرتے برف کے آبشار یا ایولانچ کو قلم بند نہ کرتا... گوندوگورو کے ان گہرے بلند برفانی تخت کا تذکرہ نہ کرتا جس میں یاک اور گھوڑے بھاگتے تھے... کہیں بلند پہاڑوں میں ہونل محو برف کی نظم "اے دوست" نہ پڑھتا... برف کے کنوئیں میں گرتی ان آبشاروں میں ایک "دولاشہ" دیرے سے نہ جھانکتا جب کہ میرے جبڑوں میں میری جان تھی اور انہیں ابراہیم نے جکڑ رکھا تھا... برنج کے سفید بنگلوں میں تجسید کرتی سورج کی اولین شعاعوں کو دھند میں غضب لگتے نہ بیان کرتا... ایک آبی شالیمار میں بدن ڈوبنے کی کیفیت... نہ تحریر کرتا... تو کتنا بڑا گناہ کرتا... وہ جو رب نے جو کچھ بنایا ہے اسے دیکھنا اور پھر بیان نہ کرنا کتنا بڑا گناہ ہے... تو میں نے بیان کر دیا تو کیا برا کیا؟...

دوسرا سفر

"چٹان پر ایک لڑکی... کچھ نہ بن سکو تو گھاس بن جاؤ"

چٹان پر ایک لڑکی...

چٹان بلند ہوتی جا رہی ہے اور جب چوٹی تک پہنچتی ہے تو وہاں ایک لڑکی...

چٹان کی چوٹی پر ایک لڑکی... براجمان!

اور چٹان حرکت کرتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ لڑکی جو اس کی چوٹی پر براجمان تھی، وہ بھی حرکت کرتی جاتی تھی... بہت تیزی سے... جیسے میں ایک تیز رفتار ہیلی کاپٹر میں بیٹھا اس کے قریب سے گزر رہا ہوں...

چٹان پر اطمینان سے بیٹھی لڑکی سرخ لباس میں تھی۔

وہ ایک جل پری کی مانند چوٹی پر آنکھیں میچے بیٹھی تھی...

ایک سرخ جل پری جو بھوری چٹان کی بلندی پر آنکھیں میچے بیٹھی تھی اور وہ شاید جانتی تھی کہ وہ سامنے افق کے پار تکتی تھی نیچے نہیں دیکھتی تھی اور اگر وہ نیچے نگاہ کرتی تو دیکھتی کہ دو بے حد روشن کی زوروں میں تنہائی ایک جیپ ہے جو دھول اڑاتی ٹوٹے جانے والے کچے راستے پر چلتی جاتی ہے اور اس کے پچھلے حصے میں ٹرک میک اور چند کوہ نورد ٹھنسے پڑے ہیں... یہ ٹوٹ چکے ہیں اور وہ ڈوٹے کے اوپر سایہ فگن مشابرم کو تکتے ہیں اور اس کے دامن سے آنے والی سرد ہوا کو اپنے رخساروں پر محسوس کر کے مسکراتے ہیں کہ وہ بچ گئے... پنجاب کے میدانوں سے اوپر آتے ہوئے اور ابھی تک ان کے چہروں میں سے پنجاب کی گرمی پھوٹتی ہے۔ اور جیپ کی اگلی نشست پر ایک موٹے ڈرائیور کے برابر میں ایک بھوری آنکھوں والا شخص حیرت کی کیفیت میں گرفتار نظر اٹھائے اسے تک رہا ہے اور اس کی بھوری آنکھوں میں بھی ایک حرکت کرتی ہوئی بلند چٹان ہے جس پر

ایک سرخ لباس میں، ناگین جیسے بیٹھی لڑکی ہے جو گزرتی جاتی ہے..
اگر وہ پیچھے نگاہ کرتی تو مجھے دیکھتی..
یہ پل دو پل کا منظر تھا لیکن اس پر ابدیت نے مہر لگا دی تھی...
چٹان پر بیٹھی سرخ لباس والی لڑکی بھوری آنکھوں میں ثبت ہو گئی تھی..
جیسے ٹکسال میں ایک سکے پر کسی سکندر، کسی اشوک یا کسی شاہ جہان کی شبیہ ثبت ہو جاتی ہے.. اور وہ سکہ سینکڑوں یا ہزاروں برس بعد جب کسی کھنڈر میں سے برآمد ہوتا ہے تو متروک ہو چکا ہوتا ہے لیکن.. اس پر ثبت شبیہ قائم ہوتی ہے..

یوں اس شخص کی بھوری آنکھیں بھی ایک ایسی ٹکسال تھیں جو لمحہ موجود میں تو دیکھ سکتی تھیں، رائج تھیں اور ان پر چٹان کی چوٹی پر براجمان سرخ لباس والی لڑکی ناگین جیسے بیٹھی ثبت ہو چکی تھی ایسے کہ کل کلاں جب یہ آنکھیں متروک ہو چکی ہوں گی.. خاک در خاک ہو چکی ہوں گی تو بھی اس خاک میں سرخ پیراہن میں ملبوس چٹان پر بیٹھی ایک لڑکی کی شبیہ محفوظ ہو گی...

میں جیپ کی ونڈ شیلڈ پر نظریں جمائے ہوشے جانے والے کچے راستے کی خطرناکی سے آنکھیں چراتے سامنے مشابرم کی چوٹی کو تک رہا تھا جو شام میں جا رہی تھی اور میرے دل میں وسوسے تھے.. کہیں ہوشے کے راستے میں ہی رات نہ ہو جائے.. اگر رات ہو گئی تو خیمے کیسے اور کہاں نصب کریں گے.. بدن میں کلبلاتی بھوک کا مداوا کرنے کے لیے چولہا کیسے روشن کریں گے... جب میں نے جیپ کی کھڑکی میں فریم ہوتے اس میں سے تیزی سے گزرتے منظر کی جانب نگاہ کی..

اور اس لمحے ایک ویرانے میں خشک اور چٹانی ویرانے میں چٹانوں کی اوٹ میں ان درجنوں گھروں کو دیکھا جو شاندار ان چٹانوں کی کوکھ میں سے جنم لے رہے تھے.. درجنوں گھروندے نما صرف انسانی ہاتھوں کی مدد سے تعمیر کردہ گھر جو کاندے کے سیلاب میں بے گھر ہو جانے والے لوگوں نے یہاں آ بنائے تھے... یوں کینداس تھنگ نامی ایسے مقام پر جہاں پانی کی ایک بوند نہ تھی.. کاندے میں پانی نے ان کو بہا دیا تھا اور یہاں کینداس تھنگ میں کربلا تھی.. پانی کا ایک گھونٹ نہ تھا...

اسی لیے ہماری جیپ کے پچھلے حصے میں میرے ساتھیوں کو بے آرام کرتے پانی سے بھرے تین پلاسٹک کین تھے جو ہم کاندے کے فرات سے بھر کر ان کے لیے لائے تھے..

اور پھر اگلے لمحے جیپ کی کھڑکی میں سے ایک چٹان بلند ہونے لگی... وہ گزرتی جاتی تھی۔ اسی رفتار سے جس رفتار سے ہماری جیپ جاتی تھی اور اس کی چوٹی پر یہ لڑکی بیٹھی تھی.. چٹان کے پس منظر میں جو برفپوش بلندیاں تھیں، وہ یکدم غائب ہو گئیں اور وہ چٹان اور اس پر بیٹھی لڑکی جو جانے کس دھیان میں تھی اور جانے چوٹی تک کیسے پہنچی تھی آسمان میں تیرنے لگی..

یہ محض پل دو پل کا سماں تھا.. جو تیزی سے گزر گیا.. آنکھ جھپکتے ہی گزر گیا لیکن میری یادداشت پر ثبت ہو گیا.. سکے پر مہر لگ گئی...

وہ کوپن ہیگن کی "لٹل مرمیڈ" کی مانند اس چٹان پر بیٹھی تھی..

کوپن ہیگن کی لٹل مرمیڈ ایک بڑے پتھر پر براجمان سمندر کو تکتی تھی.. اس شہر کی علامت ہوتی تھی.. اتنی مختصر تھی کہ قریب پہنچنے پر بھی غور کرنے سے نظر آتی تھی لیکن کینداس تھنگ کی یہ جل پری اس کی نسبت ہزاروں گنا بڑی اور بلند چٹان پر.. اور جانے وہاں تک پہنچی کیسے تھی، اطمینان سے بیٹھی تھی.. اور اس کے سامنے سمندر نہ تھا.. خلا تھا... وہ اتنی بلندی پر تھی.. اور اس خلا کے کہیں نیچے دریا بہتے ہوئے اور شیوک تھے.. اور بہت دور خپلو کی وادی تھی اور سیاچن جانے والے راستے تھے... وہ ایک لیڈی گوڈائیوا تھی جو اپنے بے لباس بدن کو محض اپنے طویل گیسوؤں سے ڈھکتی ایک سفید براق گھوڑے پر سوار تھی..

ایک جون آف آرک تھی جو اپنے جلائے جانے کی منتظر تھی..

حضرت عیسیٰ کا وہ سفید مجسمہ تھی جو ریو ڈی جنیرو کی بلند ترین پہاڑی پر ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے..

اگرچہ وہ یہ سب کچھ تھی لیکن ان سب سے افضل تھی کیونکہ وہ زندہ تھی.. اس کا سرخ دوپٹہ ہوا کے زور سے کبھی کبھار پھڑپھڑا کر اٹھتا تھا اور گر جاتا تھا..

"بن سکو تو پہاڑ کی چوٹی بن جاؤ"
یہ ممکن نہ ہو تو پہاڑ کی کھائی میں کھلنے والا ایک زرد پھول بن جاؤ..
ایسا نہ ہو سکے تو ایک چھوٹا سا جھرنا ہی سہی..
اور کچھ بھی نہ بن سکو تو گھاس بن جاؤ..
ایسی گھاس جس پر کسی کے قدموں کے نشان ثبت ہو جائیں..

میں کچھ بھی نہ بن سکا تھا، اس لیے وہ گھاس بن گیا تھا جس پر جیپ کی کھڑکی میں سے تیزی سے گزر جانے والی چٹان پر بیٹھی لڑکی کے نشان ثبت ہو گئے تھے..

منظر کب کا گزر چکا تھا..

سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا..

لیکن اس کے باوجود وہ چٹان وہ لڑکی اس کی چوٹی پر ٹانگیں تہہ کیے بیٹھی گزرتی رہی..

جیسے ایکشن ری پلے ہوتا جائے..

میری مجبور آنکھوں کے سکے پر وہ بار بار ثبت ہوتی رہی...

کہیں بلند پہاڑوں میں...

ایک نوکیلے ہراول جیسے چٹانی مینار پر براجمان.. سرخ لباس والی لڑکی.. تیزی سے جیپ کی کھڑکی کے فریم میں سے گزرتی رہی..

چونکہ ابھی میری مجبور آنکھوں کا سکہ رائج ہے.. اس لیے نقش بھی تازہ ہے.. ابھی ابھی ٹکسال میں ڈھلا ہے۔ اس لیے اسے میں اتنی تفصیل سے بیان کر رہا ہوں..

ایک بلند چٹان.. عرش کی قربت میں.. چوٹی پر ایک لڑکی.. سرخ لبادے میں.. تیزی سے سرکتی.. جیپ کی کھڑکی میں سے گزرتی.. بلندیوں کی جل پری پاؤں تہہ کیے جانے کس کی منتظر..

ہوشے کی شام میں بابائی دھول اڑاتی ایک جیپ کے عین اوپر..

چٹان پر ایک لڑکی...

"ویگن جس میں موسم، بلندیاں اور چند چہرے ٹھہرے ہوئے تھے...... واپسی!"

ویگن خاموشی کے چپ جزیرے میں سے نکلی... سکوت کے [illegible] یکدم... شہر کے شور میں داخل ہو گئی..

لاہور شہر کے شور میں داخل ہو گئی..

ہمارے کانوں کے پردے پھٹنے کو آ گئے.. چہرے شور کی بوچھاڑ سے زخمی ہونے لگے.. ریزے ریزے ہونے لگے، ویگنیں، بسیں اور کتنے شور مچاتے، دندناتے ہمیں روندتے ہماری ویگن کے آس پاس ایک ہولناک قیامت برپا کر رہے تھے.. اور پھر لوگ.. بہت سے لوگ.. شہر کے لوگ.. لاکھوں لوگ بھیڑیوں کے ریوڑ.. لالچ اور حماقت کے ریوڑ ایک سیلاب کی مانند ہماری ویگن کو دھکیلنے لگے..

ہم نے ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا..

دندناتی لہراتی بے ترتیب بے اختیار ہوتی ویگنیں ہمیں کچلنے کے لیے آ رہی تھیں.. بسیں اپنے بانٹ کھولے ہمیں ہڑپ کرنے کو تھیں.. ٹرکوں میں بچے کھچے عفریتوں کی مانند منہ کھولے ہمیں نوالہ بنانے کے لیے ہنہناتے چلے آ رہے تھے.. کاریں صرف ہمیں کچلنے کی خاطر چیختی چلاتی ہماری ویگن کی جانب بڑھتی تھیں.. اور ہم سہمے ہوئے تھے..

ہم بند ہوتے کھڑکی کے کھلے شیشوں میں سے ان آفتوں اور بلاؤں کو اپنے آس پاس چنگھاڑتے ہوئے دیکھتے تھے اور سہمے ہوئے تھے..

ہم مکمل طور پر ایک سٹیٹ آف شاک میں تھے۔۔

ہماری ویگن موٹروے سے اتر کر کالا شاہ کاکو کے قریب گرینڈ ٹرنک روڈ میں داخل ہوئی تھی اور اب لاہور شہر میں پہنچ کر اس کے گھنے بدہیئت شور میں ڈوبتی چلی گئی۔۔۔ہماری ویگن۔۔اگرچہ۔۔۔بلکہ بظاہر ان تمام ویگنوں جیسی اور ان کی شکل کی تھی جو ہارن ہوکتی ہمیں کچلنے کی نیت سے بے تحاشا دوڑتی پھرتی تھیں لیکن شکل سے کیا ہوتا ہے، ہماری ویگن کی روح تو ان سے مختلف تھی۔

اس کا ڈھانچہ اور ماڈل ان جیسا تھا لیکن اس کی روح کچھ اور تھی۔۔

ہماری ویگن کے اندر ابھی تک کچھ موسم ٹھہرے ہوئے تھے۔۔

اور اس ویگن میں جو ہم تھے۔۔۔ہمارے رک سیک۔ پانی کی بوتلیں۔ خیمے۔ جیکٹیں۔ واکنگ سٹکس اور جو ہائکنگ بوٹ تھے ان میں بھی کچھ موسم ٹھہرے ہوئے تھے۔۔بشام کی شام میں شیر دریا سندھ کی لہروں کی گرجوں کو بہاؤ اس میں تھما ہوا تھا۔ اس کی کچھ بھی باقی تھی۔۔

برسین۔۔یا مرزین کی بلند تنہائی کے ہوٹل کے ایک کمرے میں بستر پر بچھی بے شکن چادر کی ایک یاد تھی۔۔

راما کوٹ ٹیلے پر۔۔ مرزا بیگ پورٹر شکور کا چہرہ تھا جو اوپر فیری میڈو سے آیا تھا اور مجھ سے کہتا تھا صاحب۔۔ اوپر چلو۔۔ فیری میڈو تمہیں یاد کرتا ہے۔۔ گلگت کی ایک مست شام تھی۔۔

سکردو روڈ پر سفر کرتے ہوئے اس تنگ درے میں۔۔ اس کی پُرپیچ اٹھان اور اترائی میں دریائے سندھ کی گرج نے جو دل کو روکا تھا اس ویگن میں ابھی تک اس دل کی دھک دھک تھی۔۔

سکردو کی وسعت میں وہ ہلکی بارش تھی جو سندھ کے بہاؤ پر گرتی تھی۔۔

گئی رات وادی شگر کی جانب سفر تھا۔۔ شیوک ابھی تک اس ویگن میں بہتا تھا۔۔ خانقاہ کے تیغ مینار اور ستارے تھے۔ کھرے کا ٹوٹا ہوا پل تھا اور اس کے پار ایک چٹان پر براجمان سرخ لباس والی لڑکی تھی۔۔۔ ہوشے تھا، روندو گند کوردنگ کا ایک پُراذیت سفر تھا۔ شمالی پُل میں اڑتی پتنگ تھی۔۔ دل سنگ پاکی جھیل میں اترتے ہوئے سات گلیشیر تھے اور ہسپاں تھا جہاں لیلے ہماری منتظر تھی۔۔

اس ویگن کے اندر جو ابھی ابھی موٹروے سے جدا ہو کر اس کے سکوت کے قفل توڑ کر یکدم لاہور شہر کے شور میں داخل ہوئی تھی، بہت کچھ باقی اس لیے تھا کہ اس میں کچھ موسم ٹھہرے ہوئے تھے۔۔

اگرچہ دور سے۔۔ بریفنگ کی بھیڑ میں یہ ایک عام سی کوئی سی ویگن لگتی تھی

لیکن اس میں چند موسم۔۔۔ چند بلندیاں اور چند چہرے ٹھہر گئے تھے۔۔

ویگن کے فرش پر ابھی تک کچھ کانٹے تھے۔۔ کسی پہاڑی پودے کے جو کسی کوہ نورد کے بوٹوں سے چپک کر اندر آ گئے تھے اور ہمارے ساتھ ہی شہر کے شور میں چلے آئے تھے۔۔

نشستوں تلے رک سیکوں میں ٹھنسے ہمارے قدموں میں پڑے اس شاپنگ کے ڈھیر ڈبے اور کارٹن تھے اور بیگ تھے جو گلگت کی این ایل آئی مارکیٹ میں کی گئی تھی۔۔ بچوں کے کھلونے، جوگرز، ریشمی زنانہ سوٹ، بجلی کا چولہا، چینی ڈنر سیٹ اور ٹی سیٹ۔ ایک عدد ٹیلی ویژن اور بے شمار کلاک جو بے حد سستے تھے اور اب درجنوں کے حساب سے ٹک ٹک کیے جا رہے تھے۔

اور ہاں۔۔۔ ہماری گندی جرابوں کی بہت ہی بری بو تھی۔۔

ویگن میں میری شاپنگ سب سے مختصر تھی کیونکہ شاپنگ تو عموماً بیٹیوں کے لیے کی جاتی ہے۔۔ اور میری بیٹی ملک سے باہر جا چکی تھی۔۔ اگر ایک بیٹی آپ کے پاس ہو تو کسی بھی شاپنگ سنٹر کے سارے شیلف اس کے لیے خریدے جا سکتے ہیں۔۔ وہ نہ ہو تو وہاں خریدنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا۔۔ اور بیٹے بھی اتنے بڑے ہو چکے تھے کہ میں ان کے لیے تالیاں بجاتے بندر یا بجلی کا بیر نہیں خرید سکتا تھا۔۔

میرے پاؤں میں سینڈل تھے اور ٹریکنگ بوٹ فرش پر پڑے منہ کھولے ہانپ رہے تھے کہ وہ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر تو آسانی سے سانس لے سکتے تھے۔۔ برفباری کے دوران ان کے تسمے کس دیئے سے وہ آرام محسوس کرتے تھے لیکن لاہور کی اس حبس زدہ گرمی میں وہ چڑیا کے بچوں کی مانند منہ کھولے ہانپ رہے تھے اور ان کو سانس نہیں آ رہا تھا۔۔ ویسے وہ یہ جانتے تھے کہ یہ شخص اگر اگلے برس تک صحت مند رہا اور زندہ رہا تو باز نہیں آئے گا اور ہم پھر اس کے پاؤں سے آشنا ہوں گے اور بلندیوں تک جائیں گے۔

ویگن سے باہر ایک ہولناک شور تھا جیسے کوئی ڈائنو سور چکوال یا بلوچستان میں اپنی ہڈیاں جوڑ کر زندہ ہو کر لاہور کے برج مینار سے ڈھاتا شہر میں گھس آیا ہو۔۔ اتنی افراتفری مچی ہوئی تھی۔

اگر مجھے فوراً یہیں کہیں ڈراپ کر دیا جاتا اور کہا جاتا کہ آپ سڑک کے پار چلے جائیں تو میں کبھی بھی ایسا نہ کر پاتا کہ مجھ میں کاروں، ویگنوں اور رکشوں سے بچ کر سڑک پار کرنے کی

حسن منتظر ہو چکی تھی.. میں ایک ہی مقام پر بختی مرغابی کی مانند ٹھٹھرا ہوا رکھتا تھا.. مجھ میں کسی گہری دراڑ کو پھلانگنے یا شمشیر کے بلند راستے کی دھار ایسے کنارے پر چلنے کی صلاحیت تو تھی لیکن اس خودغرض شہر اور روز مرہ گزرتی ٹریفک میں سے بچ کر سڑک کے پار کرنے کی صلاحیت نہ تھی..

میں ابھی تک ہسپاں میں تھا۔

لیلےپیک کی آغوش میں تھا..

میرا چہرہ اور ہاتھ جلے ہوئے تھے.. بلندیوں کے اثر تلے کی پھونک سے زخمت ہوئے تھے.. اگر کوئی میرے پورے بدن کو الفت سے دیکھتا تو وہ کہتا کہ.. یہ کیا ہے کہ تمہارے بدن کے کچھ حصے تو سفید ہیں لیکن تمہارے ہاتھ سیاہ ہیں، چہرہ جلا ہوا ہے اور ناکوں پر سیاہی کے آثار ہیں اور تمہاری جلد اکھڑ رہی ہے.. یہ کیا ہے.. اور میں کہتا کہ یہ بلندی کی ڈائن ہے جس نے میرے بدن کے کچھ حصے سیاہ کر دیے ہیں..

تو پھر کیوں کہیں بلند پہاڑوں میں جاتے ہو؟..

میں نے کہیں اپنے گاؤں کے اس بوڑھے کا قصہ بیان کیا ہے جو ایک بار سانپ سے ڈسا گیا تو پھر ایک خاص موسم میں پھر سے ڈسے جانے کے لیے بے چین اور مضطرب ہو جاتا تھا.. وہاں سانپ کا منتظر رہتا.. اور وہ آتا اور اسے ڈس کر چلا جاتا اور وہ بحال اور ہشاش بشاش ہو جاتا۔

میں بھی وہی بوڑھا ہوں..

ایک خاص موسم میں میں بھی بے چین اور مضطرب ہوتا ہوں اور پھر خود بلندی کی ڈائن تک جا پہنچتا ہوں کہ وہ میرے بدن کے کچھ حصوں کو سیاہ کرے تاکہ میں بھی ہشاش ہو سکوں..

لیکن.. شہر کے اس شور میں وہ سب رونق تھی جس سے فرار ہو کر ہم شمال کو گئے تھے..

ہم سب تھکے ہوئے تھے..

"روانگی کا دن، ڈرائیور نیم حکیم اور کلر کہار میں بریک ڈاؤن"

یہ تو کچھ روز پہلے کی بات ہے..

چند روز پہلے کا قصہ ہے..

جب ہم..

لیکن کتنے روز پہلے؟.. نہ دن یاد ہے اور نہ تاریخ.. اس قصے کو گزرے ہوئے چند صدیاں بھی ہو چکی تھیں..

کیونکہ چند روز میں تو انسان اپنے شہر کو نہیں بھولتا.. اس میں دوبارہ داخل ہونے پر گم نہیں جاتا.. خوفزدہ تو نہیں ہو جاتا کہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں یہ کونسا دیار ہے.. تو یقیناً اس قصے کو چند صدیاں گزر چکی تھیں جب ایک ایسی سویر تھی جب میرے گھر کے دھیمے رنگ کے پھاٹک کے باہر ایک ایسی ویگن کھڑی تھی جس میں میرے کوہ نورد ساتھیوں کے رک سیک اور سامان لوڈ کیا جا رہا تھا.. اور پھر ہم لوڈ ہوئے تھے اک قفس میں گئے تھے کیونکہ ویگن کی چھت پر کیریئر نصب نہ تھا اور ہم اور سامان اس کے اندر ہی بمشکل فٹ ہوئے تھے..

ویگن گلبرگ میں سے نکلی تو ہو دریا کی بجائے ملتان روڈ کی ایک ایسی ورکشاپ کے سامنے جا کھڑی ہوئی جس کے تھڑے ابھی نیند میں تھے اور استاد کے نمودار ہونے میں ابھی بہت وقت تھا کیونکہ یہ تڑکے سویر تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" میں نے حکیم سے پوچھا..

اور یہ حکیم ہمارا ڈرائیور تھا اور عجیب و غریب حکیم تھا.. نہ کچھ پوچھتا تھا نہ کچھ بتاتا تھا.. شاید نیم حکیم تھا.. ہم نے سفر کے آغاز میں اس سے کچھ فرینڈلی ہونے کی کوشش کی لیکن اس نے نہیں

کچھ زیادہ لفٹ نہ کرائی صرف "جی" اور "ہوں" کے ساتھ نبھا دیا۔ ایک بہت ہی طویل سفر کے دوران ڈرائیور کے ساتھ فرینڈلی ہونا پڑتا ہے۔ کسی حد تک اس کی خوشامد کرنا بے حد ضروری ہوتا ہے... کیونکہ شاہراہ قراقرم اور مکروہ روڈ پر آپ ایک ناراض اور ناخوش ڈرائیور افورڈ نہیں کر سکتے..

"ہوں..." اس نے جواب دیا۔

"یار حکیم پلیز بتاؤ کہ کیا پرابلم ہے؟"

"ایئر کنڈیشنر کی بیلٹ آواز دے رہی ہے.. اسے چیک کراتا ہے۔" حکیم نے اونگھتے ہوئے بے حکمت سے کہا۔

"پہلے کیوں نہیں چیک کی.." حسن صاحب ذرا ناراض ہو گئے کہ یہ انہی کا بندوبست تھا۔ "آپ تو کہتے تھے ویگن بالکل برینڈ نیو ہے اور ابھی تک اس کی سیلیں تک نہیں ٹوٹیں۔"

"میں نے ٹھیک کہا تھا.. مالک نے کہا تھا.."

ایک زبردستی بیدار کیا گیا اونگھتا ہوا چھوٹا بچہ اوزار لے کر ویگن کے پیٹ کے نیچے رینگتا ہوا روپوش ہو گیا..

یہ کوئی اچھا شگون نہ تھا..

پاؤلو کوئلو کہتا ہے کہ شگونوں پر ہمیشہ دھیان دو...

لیکن ہم نے اس کا کہنا نہ مانا کہ سفر کا آغاز اچھا نہ تھا۔ ایئر کنڈیشنر کی بیلٹ کا آواز دینا ایک برا شگون ہو سکتا تھا۔ ہم اس شگون پر دھیان دیتے تو سفر کا ارادہ ترک کر دیتے۔ چنانچہ ہم نے آس پاس دیکھنا شروع کر دیا۔

اور آس پاس ملتان روڈ کا وہ علاقہ تھا جہاں شاہ نور سٹوڈیو واقع تھا.. شاہ نور جس میں شوکت حسین رضوی اور نور جہاں دونوں مر چکے تھے لیکن ان کا سٹوڈیو ابھی زندہ اور بارونق تھا۔ اس کے آس پاس اور قربت میں ایسے "ادارے" اور "اکیڈمیاں" تھیں جو ہیرو بننے گلوکاری میں کمال حاصل کرنے کے خواہش مندوں کے لیے بنائی گئی تھیں..

ہر جانب مختلف "پرفارمنگ آرٹس" کی اکیڈمیوں کے بورڈ تھے جو یقیناً ان بلند پایہ اداروں کے پرنسپل حضرات نے خود اپنے ہاتھوں سے لکھ کر وہاں لٹکائے تھے..

"شاہانی بینڈ باجہ.. پوپ سانگ کے ایکسپرٹ.. یاد ہو گی۔"

"رنگل ڈانس اکیڈمی.. استاد اچھے خان ولد مستری بندہ علی جموں خان۔"

"ناچ ناچ گھر.. ہر قسم کے ناچ کی ٹریننگ.."

"ملٹری بینڈ سروس.. یہاں انگلش باجا بھی سکھایا جاتا ہے۔"

"ہائی فائی کوکنگ اکیڈمی.."

"بھائی گل حسین بھائی بینڈ والے کو گٹار سکول.. اور باکسنگ روم۔"

ہم یہ سائن بورڈ پڑھتے رہے.. اور بار بار گھڑیاں دیکھتے رہے کہ آٹھ بج چکے تھے اور ابھی تک ہمارا سفر شروع نہیں ہوا تھا۔

اور شیڈول کے مطابق ہمیں آج شام... بشام میں ہونا تھا..

بشام... سندھ کے کنارے.. ایک ناممکن آرزو ہو رہی تھی..

ویگن کے نیچے روپوش ہونے والے پہلے چھوٹے کے بعد ایک اور چھوٹا آکر نیند میں جھولتا آیا اور اس نے اپنی مردانگی ظاہر کرنے کے لیے شلوار میں ہاتھ ڈال کر ایک کھجلی کی حالانکہ فی الحال دس برس کی عمر میں وہاں کھجانے کے لیے بہت مجبور تھا اور وہ بھی ویگن کے نیچے لیٹ کر سرکتا ہوا غائب ہو گیا..

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ایئر کنڈیشنر کی بیلٹ تبدیل ہوئی.. حکیم نے حکمت سے سر ہلایا اور ہم ہوڑے کے مسافر ہو گئے.. بجانب اسلام آباد...

اس برس بھی ہر فن مولا وہی آزمودہ چہرے تھے جو ہر برس میرا ساتھ دیتے تھے... یہ وہ لوگ تھے جن کی طفیل میں ہر برس شمال کو جا سکتا تھا... یہ میرا خیال رکھتے تھے.. میرا سہارا بنے تھے۔ البتہ ایک چہرہ ایسا تھا جو ایک مدت کے بعد ہمارے سفر میں شریک ہوا تھا..

یہ عامر کے ٹو تھا..

عامر کے ٹو اس لیے کہ ایک عامر ہمارے ہمراہ ناراض ناراض سا ہوا "سنو لیک" کے ٹریک میں چلا تھا۔

آن عامر سے اس عامر کو الگ کرنے کے لیے یہ کے ٹو تھا جو میرے پہلے بڑے ٹریک میں... "کے ٹو کہانی" میں میرا ساتھی تھا..

عامر کے ٹو فیشن کا پرانا تھا لیکن ہر برس شدید خواہش کے باوجود اپنے کاروباری جھمیلوں کے جال میں پھنس کر رہ جاتا تھا اور ہمارا ساتھ نہ دے سکتا تھا..

اس برس بھی ہمیں یقین نہ تھا کہ وہ آخری لمحوں میں فرار ہو کر آئے گا.. لیکن...

یہ وہی تھا جس نے بیافو کی برفوں کے آغاز میں واقع کوروفون کیمپنگ میں یہ خواہش کی تھی کہ تارڑ صاحب ہم کسی نہ کبھی یہاں سے کنکورڈیا جانے کی بجائے اوپر بیافو پر جائیں گے اور سنولیک تک پہنچیں گے لیکن وہ نہ جا سکا تھا۔۔ اور آج جا رہا تھا۔۔ اپنی یکتا حس مزاح۔۔ اور دنیا کے بارے میں ایک الگ نکتہ نظر رکھنے کی اہمیت اور دل کو خوشی دینے والی اپنی شخصیت کے ہمراہ۔۔ ہمارے ساتھ جا رہا تھا۔

مجھے صرف یہ قلق تھا کہ ایک اور نہایت بلند پایہ جگت باز خان سلیم ہمارے ساتھ نہ تھا۔۔ شاید ایک میان میں دو تلواریں۔۔ عامر اور سلیم نہیں سما سکتی تھیں۔۔

ایک چہرہ سلمان کا تھا جسے میاں صاحب ہمیشہ سلمان کہتے تھے۔۔

سلمان میرے ہمراہ دیوسائی کو عبور کر چکا تھا۔ "سنولیک" پر کمنڈی اڑانے کی کوشش کر چکا تھا لیکن پھر وہ آسٹریلیا چلا گیا۔ وہاں کے باسیوں کے علاوہ وہاں کے کنگروؤں نے بھی اسے بے حد پسند کیا۔ وہ بنجر زمینوں سے بھی پیار کشید کر لینے والا ایک کولوہو بچہ تھا۔ پھر وہ آسٹریلیا سے امریکہ سدھارا اور وہاں سے واپس آیا تو سیدھا اس بشام جانے والی ویگن میں آ بیٹھا۔۔ بنیادی طور پر وہ ایک بچہ جاسوس تھا جو میری ہر حرکت پر کڑی نظر رکھتا تھا کہ سر جی اگر آپ ایسا کریں گے تو میں واپس جا کر بھرجائی کو رپورٹ کر دوں گا۔۔ بتا دوں گا کہ آپ پہاڑوں میں جا کر اپنی جان کی پروا نہیں کرتے۔۔ مسخریاں کرتے ہیں۔۔

عامر کے ٹوور سلمان کے علاوہ اس برس ہمارے درمیان پہلی بار ایک اور نہایت اجنبی اور ناقابل بیان سا چہرہ بھی تھا۔ بس یوں جان لیجیے کہ یہ چہرہ ایسے مجرمانہ خدوخال کا حامل تھا کہ اس کی تصویر کسی بھی تھانے میں آویزاں ہو سکتی تھی اور اس کے نیچے "موسٹ وانٹڈ" کے علاوہ دس لاکھ روپے کے انعام کی نوید "زندہ یا مردہ" کے عنوان سے درج ہو سکتی تھی۔ لیکن اس چہرے پر آپ اتنی معصوم نرمی اور الفت بھی دیکھ سکتے تھے کہ وہ شخص ایک کوئل کے لیے۔۔ سندھ کے اوپر پرواز کرتے ایک راج ہنس۔۔ برف کے ایک ذرے اور نیلی میڈو میں کھلنے والے ایک پھول کے لیے بھی پگھل کر بہہ جاتا تھا۔۔

یہ "مجرم" ڈاکٹر عباس برمانی تھا۔۔

ایک زمانے میں وہ اپنی جناتی ہینڈ رائٹنگ میں مجھے اپنے نہایت مجرب سفروں کی داستانیں لکھا کرتا تھا۔۔ اور ایسے انداز میں کہ میری خواہش تھی کہ وہ چھوٹے چھوٹے کتابی صورت میں بھی

لکھے۔۔ پھر ہماری ملاقات ہوئی تو ایک شخص، ایک دوست میں بدل گیا۔۔ اس نے میری فرمائش پر "کیلاش کتھا" اور "میرا سندھ جو سائیں" ایسے کمال کے سفرنامے لکھے۔۔ لیکن اس میں ایک بہت بڑی خامی تھی۔۔ وہ نہایت نامناسب انداز میں اتنے دھیمے اور سرگوشی سے بھی کم دھیمے پن میں بولنے والا ہے کہ سننے والا صرف نہایت تگ و دو کرنے کے بعد ہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس ڈاکٹر نے کیا کہا ہے۔۔ کیا برمانی نے یہ کہا ہے کہ مارکس کا فلسفہ اقتصادیات اب بھی اہمیت رکھتا ہے۔۔ یا یہ کہا ہے کہ سائیں آپ جہنم میں جاؤ، مجھے نیند آ رہی ہے۔۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔

ایک ایسا شخص جو بیک وقت ایک سفید چوٹی اور ایک سفید گھوڑی کے عشق میں مبتلا ہو، اس کے بارے میں کیا پتہ چل سکتا ہے۔۔

باقی رہی، آزردہ، سالخوردہ۔۔ اور ساتھ دینے والے چہرے تھے۔ حسن، شاہد، میاں صاحب! حسن کو اپنی بیگم سے جدا ہوئے ابھی دو گھنٹے نہ ہوئے تھے کہ وہ ان کے لیے اداس ہو گئے اور اتنی بے قراری سے کوئی پی سی او تلاش کرنے لگے جتنی بے قراری سے کوئی نہایت دباؤ میں آیا ہوا شخص ٹائلٹ تلاش کرتا ہے۔

شاہد صاحب۔۔ سیاہ چشمے اور سرخ پی کیپ میں اپنے گنج گراں مایہ کو چھپاتے جاسوس بنے بیٹھے تھے اور حسب سابق ٹیم کے حساب کتاب کے انچارج تھے۔۔ ٹیم کا کل کیش ان کی بیلٹ کے بٹوے میں پھولا ہوا تھا اور وہ اس کی حفاظت اس طرح کرتے تھے جیسے کروسیڈز کو جانے والا کوئی شکی نائٹ اپنی بیوی یا محبوبہ کی کمر کے ساتھ ایک "چیسٹٹی بیلٹ" باندھ کر اسے مقفل کر کے اس کی چابی اپنی زرہ بکتر میں سنبھال کر ساتھ لے جاتا تھا کہ بیوی یا محبوبہ اس کی غیر موجودگی میں گلچھرے نہ اڑانے لگے۔

یہ الگ بات کہ گلچھرے پھر بھی اڑ جاتے تھے۔۔

میاں صاحب حسب معمول چھریرے دو چھیرے۔۔ اور اپنے لاہوری لہجے میں "ڑ" کو "ڈ" سے بدلتے اور "ڈ" کو "ڑ" بولتے۔۔ یعنی چھریڑے دو چھیڑے۔۔

گھر کی باری چڑھائی آئی تو ویگن ڈگمگانے لگی۔۔ ہچکیاں لینے لگی اور کھڑی ہو گئی۔۔

"اب کیا ہوا ہے؟"

"پتہ نہیں۔" ٹیم حکیم نے کہا۔۔

اس نے ریڈی ایٹر کا ڈھکن کھولا تو اس میں سے ابلتا ہوا گرم پانی ایک فوارے کی مانند

بلند ہوا۔ سرد اور گرم کی اطلاع کرنے والی سوئی گرم کے سرخ نشان سے بھی اوپر لرز رہی تھی۔ نیم حکیم بھی ریڈی ایٹر کے ڈھکن کو سونگھتا کبھی سر ہلاتا اور کبھی کہتا کہ گیس بن رہی ہے اور خارج ہو رہی ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔

ہم ویگن سے باہر کڑی دھوپ میں بے آسرا کھڑے رہے۔ تاکہ گیس بنتی رہے اور خارج ہوتی رہے۔

ہمارے سفر کی شروعات اچھی نہ تھیں۔ شگون برے تھے۔

آغاز سفر کی تھکاوٹ اور تھکن کے بلبلے جو آج سویرے ہمارے تن بدن میں سے پھوٹ رہے تھے۔ ہر بلبلا کسی ایک منزل کی نوید دے رہا تھا۔ ہشام، بلتت، سکردو، ہوشے... تو یہ سب بلبلے کلر کہار کی دھوپ میں ایک ایک کر کے پھٹتے جاتے تھے، معدوم ہوتے جاتے تھے۔ پہلے ایئر کنڈیشنر کی بیلٹ بدلنے کے باوجود ہمیں اس کی سرد راحت نصیب نہ ہوئی اور اب یہ ریڈی ایٹر جس کا گرم پانی ڈھکن پر زور لگاتا چھلکتا تھا اور وہ: مسٹر نیم حکیم بس اس ڈھکن کو سونگھتا تھا اور کہتا تھا "ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

"تم نے تو کہا تھا کہ گاڑی بالکل پرفیکٹ ہے۔"

"میں نے نہیں، انھوں نے کہا تھا۔"

میں نے بے دھیانی میں وہی سوال پھر سے کر دیا اور اس نے وہی جواب دیا جو وہ پہلے دے چکا تھا۔

کلر کہار کی ڈھلوانوں پر، موٹر وے کے لیے تراشے گئے سرخ پہاڑوں کے درمیان، کاریں رینگ رہی تھیں۔ ٹرک اور بسیں چڑھائی پر بے بس تھے اور ساکت لگتے تھے... زور لگاتے مگر ساکت لگتے تھے۔

ایسی چڑھائیوں پر مجھے سب سے زیادہ ترس لدے ہوئے ٹرکوں اور ٹرالوں پر آتا ہے جو لاچار نظر آتے ہیں۔ ایک زخمی کوڑھے کی مانند بے چارے رینگتے ہیں، زور لگاتے ہیں اور ان کے پھیپھڑے پھٹنے کو آتے ہیں۔

ہم تو رینگ بھی نہیں رہے تھے کڑی دھوپ میں کھڑے تھے۔

کلر کہار سے ہشام آن انڈس ایک دوری کی آواز تھی۔ ہمیں آج شام تک... رات گئے تک بھی اس آواز تک پہنچنا تھا ورنہ کوہ نوردوں کا پورا شیڈول درہم برہم ہو جانے کا خدشہ تھا۔ پھر کسی کو

ایمرجنسی فون کا خیال آیا جو موٹر وے کے کنارے پر دکھائی دے رہا تھا... سلمان اور برہانی نے نزدیکی فون تک کوئیک مارچ کی اور امداد کی درخواست کی... اور ہمیں بے حد خوشگوار حیرت ہوئی جب چند لمحوں بعد نہایت سمارٹ اور مددگار قسم کی پولیس موقع واردات پر پہنچ گئی۔

"تارڑ صاحب ہم آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اسلام آباد پہنچا دیتے ہیں... ویگن بعد میں آتی رہے گی۔"

"شکریہ... لیکن یہ ویگن آتی نہیں رہے گی کیونکہ اس کی موٹی صحت اچھی نہیں ہے اور ڈرائیور بھی نیم حکیم ہے... اس ویگن میں ہم سب کے گھر اور ان کی آرائش کے سامان ہیں... اور ہمیں صرف اسلام آباد نہیں بہت آگے جانا ہے۔"

بالآخر فیصلہ ہوا کہ ایئر کنڈیشنر آف کر دیا جائے... خاموشی اختیار کر لی جائے... دعاؤں کا ورد کیا جائے... اور ویگن کو ہولے ہولے چلایا جائے... ہر دو چار کلومیٹر کے بعد جب پانی زیادہ ابلنے لگے تو اسے روک کر ٹھنڈا ہونے کا موقع دیا جائے... چند کلومیٹر تک موٹر وے پولیس ہمارے آس پاس منڈلاتی رہی اور پھر ہماری سست روی سے تنگ آ کر ہمیں سیلیوٹ کر کے اباؤٹ ٹرن ہو گئی۔

"راولپنڈی میں استاد زاہد کی ورکشاپ تک پہنچ جائیں تو وہ اسے ایک دن میں پھر سے چالو کر دے گا۔" نیم حکیم نے خوش خبری دی۔

یعنی آج رات راولپنڈی میں ہو جائے گی... کہاں ٹھہریں گے... کیا کریں گے... اور کوہ نوردوں کا شیڈول...

اور راولپنڈی میں نالہ لئی کے کناروں پر ایک اداس گرم اور موبل آئل سے تھڑی اور کاروں کے ڈھانچوں سے مزین ایک ورکشاپ میں ہماری ویگن ہولے ہولے ہانپتی اتری۔

جہاں نالہ لئی میں حالیہ سیلاب کی تباہ کاریاں، دروازوں اور دیواروں پر اپنے نشان چھوڑ چکی تھیں اور اس ورکشاپ کے تھڑے، اوزار، چھوکروں کے چہرے یہاں تک کہ دھول بھی موبل آئل سے سیاہ تھی۔

استاد زاہد ذرا صحت مند موٹاپے والا ایسا کہ جو تھوڑا سا تحرک دکھا جانے والا کہ وہ بھی کبھی اسی ورکشاپ میں ایک "چھوٹو" تھا۔ ریڈی ایٹر کا ڈھکن اٹھا کر اسے سونگھتے ہوئے بولا "ریڈی ایٹر فٹ ہے۔ صرف اس ڈھکن کے پیچ کھسکے ہوئے ہیں اور ہوا لیک ہوتی ہے... بس ڈھکن بدل

ویں تو ویگن فٹ ہے جناب۔ تارڑ صاحب آپ اس کے مسافر نہ ہوتے تو ہم اس کا انجر پنجر کھول لیتے سارا دن لگا کر.. اور پھر چپکے سے ویگن بدل دیتے.. لیکن آپ تو ہمارے پاپا جی ہیں.. فٹ ہے۔"

"کیا گلگت تک جانے کے لیے بھی فٹ ہے؟"

"بادشاہو اسے بے شک لندن لے جاؤ.. فٹ ہے۔"

"فٹ ہے.." ٹیم ممبران نے نعرہ لگایا..

"بشام کی شام۔ برسین کی سویرا اور چلاس کا انصاف"

ویگن.. ٹیکسلا اور ایبٹ آباد سے گزرتی جا رہی تھی..

اور ہم سب دم روکے بیٹھے تھے.. چپ تھے کہ کہیں ویگن کی ایئر پھر سے نہ اُبل پڑے لیکن ویگن واقعی فٹ تھی..

ہم نے جو دم روکا ہوا تھا اس دم کو لینے کے لیے ہم حسن ابدال میں رکے.. وہاں ستانے اور باقاعدہ فروکش ہو کر کھانے کی بجائے ہم نے وہاں کے نہایت خستہ پکوڑے اور مچھلی خریدی.. گرم روٹیاں حاصل کیں اور پھر سے رواں ہو گئے کہ ہنوز بشام دور است..

ہری سنگھ کا ہری پور.. ایبٹ کا ایبٹ آباد.. مان سنگھ کا مانسہرہ.. اشوک اعظم کے پتھروں پر کندہ فرامین.. اور پھر "بٹل خنجراب" گزر جاتے.. دیکھ کر اکثر سیاح اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ بس اب تو درۂ خنجراب کہیں آس پاس ہی ہے جب کہ وہ ابھی تین روز کی مسافت پر ہوتا ہے.. بٹل.. چھتر پلین.. چائے کے باغ.. جنگل منگل..

اور جنگل منگل میں شام ہونے لگی..

ہم ابھی تک دم روکے بیٹھے تھے.. یوں تھے کہ سامان بھی گفتگو سے پرہیز کر رہا تھا کہ کہیں ویگن کے میکانکی نظام میں کوئی اور خلل رونما نہ ہو جائے..

شام کے بعد ظاہر ہے رات اُتری اور گہری ہوتی گئی.. اور اس کی گہرائی میں ہمارے دل ڈوبتے گئے..

پھر ایک پہاڑ کا اکا شور ہمارے کانوں میں اُترا.. یہ ہمارے کانوں کے لیے موسیقی تھا.. بیتھوون، موزارٹ کی کسی سمفنی سے بڑھ کر مترنم تھا کہ یہ شیر دریا کا آرکسٹرا تھا جو ہمارے کانوں

میں جیتا آ رہا تھا..

ٹھاکوٹ کا پل.. رات کی تاریکی میں ویگن کی ہیڈ لائٹس سے روشن ہوا اور ہم تیرتے تھے جو اس کے پار جاتے تھے..

بشام دور نہ تھا.. سندھ کے پار ہوئے تو بشام دور نہ تھا..

ہمیں سفر نے تو نہیں اس ذہنی اذیت نے تھکا دیا تھا جو ویگن کی خرابیوں نے ہم پر مسلط کر دی تھی..

ہم ابھی تک چپ تھے.. ہم روٹھے ہوئے تھے اور تب ہم نے دریائے سندھ کے اوپر بہت بلندی سے نیچے دریا کے کنارے ایک ایسے تاج محل کو دیکھا جس کی روشنیاں پانیوں میں ٹمٹماتی تھیں..

پی ٹی ڈی سی موٹل بشام.. کمرہ نمبر ۲۲..

بہت سے لوگ اپنے آپ کو خوش نصیب تب گردانتے ہیں جب وہ ایک سکوٹر سے اتر کر ایک مرسیڈیز میں بیٹھ جائیں.. موچی دروازے کے گھر سے ڈیفنس کے بنگلے میں منتقل ہو جائیں.. شیدا قلفیاں والا کی بجائے ترقی کرتے ہوئے ملک آئس کریم پارلر کی ایک ملک گیر چین کے مالک ہو جائیں.. لال کھوہی والے فیجے حلوائی کی بجائے رفیق سویٹ ہاؤس کی لاجواب برفی کے پروپرائٹر ہو جائیں یا اپنی خالہ زاد بیوی خورشید بانو کی بجائے.. بلکہ اس کے بعد آپ ایشوریا رائے جیسی کسی خاتون کے شوہر ہو جائیں.. لیکن میری خوش نصیبی کے پیمانے ذرا مختلف رہے ہیں..

میں اپنے آپ کو خوش نصیب تب گردانتا ہوں جب.. شاد گوری مجھے اپنا گورا بدن دکھا دے اور اس کی برفوں پر میری نظروں کے بوسوں کے نشان ہوں.. جھیل کرومبر کے پانی مجھے آغوش میں لے لیں.. یا.. بشام موٹل میں مجھے کمرہ نمبر ۲۲ مل جائے.. جی ہاں.. یہ کمرہ نمبر ۲۲ میرے لیے ایک بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس کی بالکونی سندھ پر یوں کھلتی ہے کہ اس کی سفید آہنی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے یہ دریا.. یہ اتنا آپ کے نیچے بہتے ہوئے بہتا ہے اور یوں بہتا ہے کہ اس کے پار جو پہاڑیاں ہیں ان کے کھیتوں میں جو اِکا دُکا جھونپڑے ہیں اور ان میں سے کسی ایک جھونپڑے میں اگر ایک لالٹین روشن ہے تو اس کی روشنی دریا کی سطح پر پڑتی ہے.. دریا بہتا چلا جاتا ہے لیکن اس لالٹین اس ایک دیے کی روشنی وہیں ایک ہی مقام پر ٹھہری رہتی ہے..

یہ منظر ایسا ہے کہ بے شک آپ کے ایئر کنڈیشنر کی چابی خراب ہو جائے.. ریڈی ایٹر ابلنے لگے.. آج دوپہر آپ راولپنڈی میں استاد زاہد کی موبل آئل سے لتھڑی ورکشاپ میں ناامید اور مایوس بیٹھے ہوں.. تو آپ یہ سب آفت بھلا دیتے ہیں اور کمرہ نمبر ۲۲ کے پیچھے.. سندھ کی سلیٹی چادر کو سرکتے.. گزرتے.. دیکھتے جاتے ہیں اور سب کچھ بھول جاتے ہیں.. گئی رات تھی اور کمرہ نمبر ۲۲ کی بالکونی تھی..

میرے ہمراہ حسن اور بہاولی سفید آہنی کرسیوں پر براجمان تھے اور وہ بھی بھول چکے تھے کہ آج ہمارے ساتھ کیا کیا ظلم ہوئے تھے.. اگر ہوئے تھے تو کن زمانوں میں ہوئے تھے.. کیا یہ آج کی سویر تھی جس میں ہم شاہ نور سٹوڈیو کی قربت میں بیٹھے باجوں اور ڈانس اکیڈمیوں کے اشتہار پڑھتے تھے..

اور گمر کبار میں وہ قہر انگیز دھوپ جو ہماری بے بسی کو جھلساتی تھی.. وہ آج دوپہر کی بات ہے.. وہی گمر کبار جس کے آس پاس ننداکا وہ قلعہ تھا جہاں محمود غزنوی کے سپاہیوں کی قبریں تھیں اور جہاں بیٹھ کر البیرونی نے زمین کا گھیر ناپا تھا.. جہاں محض ایک ڈھکن کی خرابی کے باعث ہم بے بس اور غمگین اور لاچار ہوئے تھے.. یہ تو کسی اور صدی میں ہوا تھا..

یہ قصہ تو جانے کن زمانوں کا ہے..

ہم سب کچھ بھول چکے تھے اور کمرہ نمبر ۲۲ کی بالکونی میں بیٹھے.. گئی رات تک بیٹھے دریائے سندھ کی چادر پر کسی ایک لالٹین.. کسی ایک دیے کی روشنی کو اس پر منعکس ہوتے دیکھتے رہے۔

اور جب سویر ہوئی.. بشام میں سویر ہوئی تو میں اپنی مختصر نیند کے بعد جاگا تو میں نے دیکھا.. بالکونی میں آ کر دیکھا کہ سندھ کے پار جو پہاڑیاں تھیں وہ گہری دھند میں گم تھیں..

میں کمرہ نمبر ۲۲ سے نکل کر.. نیچے دریا تک چلا گیا..

ابھی سویر تھی اور سندھ پر دھند تھی..

میں بہت بار اس کنارے پر اترا تھا.. پچھلے بیس بائیس برسوں میں شاید پندرہ سولہ بار.. لیکن ہر بار یہی کنارہ تھا.. یہی دریا تھا.. یہ ہمیشہ کسی اور منظر میں ہوتا تھا.. یہ ہمیشہ مجھے ایک الگ سی خوشی دیتا تھا..

وہاں وہ بڑا پتھر تھا جس پر بیٹھ کر.. بمشکل بیٹھ کر کئی برس پہلے سلمیٰ نے تصویر کھنچوائی تھی..

تنکاں پر میرے بیٹے نے میری چپل کو سندھ میں پھینکا تھا کہ ابو وہ بوڑھا انتظار کر رہا ہوگا.. اور ایک پتھر ایسا بھی تھا جس پر ایک نا آسودہ تمنا براجمان تھی..

میں نے اس نا آسودہ تمنا سے دریافت کیا کہ تم کون ہو؟

تو اس نے کہا" میں ازل سے ہوں.. کمرہ نمبر ۲۲ کی بے شکن چادر کی ایک سلوٹ بنا چاہتی ہوں... میں شیر دریا سندھ کی روانی کو تکتی تمہارا انتظار کر رہی ہوں.. میں ازل سے ہوں اور ابد تک رہوں گی.."

اور کون ابد کا انتظار کرتا ہے..

بشام سے اگلا سٹاپ ظاہر ہے داسو کے پُل کے پار ناشتے کے لیے برسین ہوٹل میں تھا۔ دریائے سندھ کے اوپر، شاہراہ قراقرم سے اوپر ایک ویران تنہائی میں معلق یہ برسین..

سلمان جو مکمل طور پر آسٹریلوی ہو چکا تھا.. اور اپنے تن و توش کے حوالے سے نکھرو ہوا تھا اور نہ کوالا بیئر.. اپنے نئے وطن کی یاد میں جذباتی ہو کر کہہ رہا تھا" سر جی یہ برسین ہے یا برزبین.."

"برزبین؟"

"جی سر جی.. ایک تو آپ کا جغرافیہ بڑا کمزور ہے.. سر جی آسٹریلیا کا بڑا مشہور شہر ہے... میں ایک مرتبہ وہاں گیا تھا.. وہاں بڑے زبردست رنگا رنگ خطے ہوتے ہیں.. آبشاریں اور زرد پھول ہوتے ہیں.."

"ہوں گے.." میں نے بیزار ہو کر کہا" لیکن تمہارا برزبین میرے برسین سے بہتر نہیں ہو سکتا.. کیا وہاں بھی میرے سندھ ایسا کوئی دریا ہے..؟"

"دریا تو نہیں سر جی.. لیکن.. کچھ ندیاں ہیں جذباتی قسم کی.." وہ ایک بھالو کی مانند جو کہ وہ تھا ناراض ہو گیا..

اس برسین میں.. یا برزبین میں ہم نے حسبِ روایت.. پچھلے دو جنوں برسوں کی روایت کے مطابق ناشتہ کیا.. اور اسی روایت کی پیروی میں.. میں نے ہوٹل کے ایک کمرے میں جا کر کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور پر تنہا کیا..

اور اس تنہائی میں بشام کے سندھ کنارے اس پتھر پر براجمان نا آسودہ تمنا نے اپنی

چپ دکھائی اور چلی گئی.. میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ دریائے سندھ کے اوپر ایک پتھر لیے بنجر علاقے میں برسین کا جو ہوٹل ہے اس کے کسی ایک کمرے کی تنہائی مجھے اپنا تمنائی کیوں کر لیتی ہے.. اس کمرے میں ایک اچھے ہوٹل کی تمام سہولتیں میسر ہیں.. صاف ستھرا باتھ روم ہے تولیے ہیں، فرش پر قالین اور بستر پر چادریں ہیں اور خوراک بھی مناسب مل جاتی ہے.. اور یہ کمرہ ایک ویرانے میں ایک پتھر لیے ویرانے کی بلندی پر دنیا جہان سے کٹا ہوا ہے.. شاید یہی وجہ ہے کہ میں ایک سہولت آمیز زندگی بھی چاہتا ہوں اور ایک ویرانہ بھی.. نہ میں مکمل سہولت آمیز زندگی میں خوش رہتا ہوں اور نہ مجھ میں ویرانے کی سختیاں برداشت کرنے کا حوصلہ ہے تو برسین کا یہ کمرہ میری ان دونوں خواہشوں کو یکجا کرتا ہے.. شاید اس لیے.. برسین سے آگے گئے تو چلاس میں ایک وقفہ ہو گیا..

چلاس میں بہت کم لوگ رکتے ہیں.. رکتے ہیں تو مجبوراً رکتے ہیں۔ اس میں جہاں اس کے گرم، ویران اور چٹیل ہونے کا عمل دخل ہے، وہاں اس کے باشندوں کے کھردرے پن اور باہر سے آنے والوں کے لیے ایک ناپسندیدگی کا عنصر بھی شامل ہے.. یوں بھی چلاس شہر شاہراہ سے اوپر کہیں واقع ہے اور اس بستی کی کوئی ایک عمارت بھی شاہراہ سے نظر نہیں آتی.. سوائے ایک بورڈ کے جو آپ کو اطلاع کرتا ہے کہ چلاس کہیں اوپر چٹانوں کی آغوش میں ہے..

چنانچہ جو کوئی بھی رکتا ہے، مجبوراً رکتا ہے.. کھانے کے لیے.. چائے کے لیے یا پٹرول یا ڈیزل حاصل کرنے کے لیے..

ہم بھی اپنی ویگن کا پیٹ بھرنے کے لیے سب سے پہلے.. ایک پولیس چوکی کے سامنے واقع پٹرول پمپ میں ڈیزل حاصل کرنے کے لیے رکے..

پٹرول پمپ کا انچارج ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹا ہوا ہمیں پمپ کے اندر آتے ہوئے ناپسندیدگی سے دیکھتا تھا کہ میں آرام کرنے کے موڈ میں ہوں اور یہ کہاں سے آ گئے ہیں۔ اس نے ایک چھوکرے کو آواز دی اور وہ چھوکرا جو بہت ہی چھوٹا تھا نہایت بڑی بڑی شکلیں بناتا آیا۔ پینڈل کو ٹنگ سے اٹھایا اور ویگن کی ٹینکی میں فٹ کر کے اسے دبا دیا.. ہم سب نے فوراً نوٹ کیا کہ میٹر زیرو پر نہیں تھا بلکہ 17 کے ہندسے پر تھا.. ہم نے احتجاج کیا کہ بھائی آپ میٹر کو زیرو پر نہیں لائے تو وہ چھوکرا خفا ہو گیا اور کہنے لگا.. زیرو کیا.. زیرو کیا.. اور ہم نے بھی خفا ہو کر کہا نہیں کیا نہیں کیا.. اتنی دیر میں انچارج صاحب اپنے بدن کے مختلف حصوں میں خارش کرتے آ گئے اور انہوں نے بھی چھوکرے کا ساتھ دیا.. ہم نے چپکے سے ادائیگی کر دی۔ تقریباً تین سو روپے زائد ادائیگی

صرف اس لیے کر دی کہ ہم بحث نہیں کرنا چاہتے تھے... یہاں چلاس ایسی جگہ پر لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہتے تھے... اپنا سفر کھوٹا نہیں کرنا چاہتے تھے... لیکن یہ سراسر بے ایمانی تھی اور ہمیں بہت دکھ ہوا... اور جلتی پر انچارج صاحب نے تیل یہ چھڑکا کہ ہمیں بے ایمان کہتے ہو... جاؤ جا کر پولیس کو رپورٹ کرو... ہم نے سوچا یہاں کے پولیس والے بھی انہی کے بھائی بند ہیں... ہو سکتا ہے ہمیں الٹا اندر کر دیں لیکن ہم بھی تاؤ کھا گئے اور سامنے پولیس کی چوکی میں جا کر فریاد کر دی... ڈیوٹی پر موجود پولیس والے نے حیرت انگیز طور پر ہماری بات تحمل سے سنی اور پھر ایک سادہ کاغذ پر اس واقعے کی تفصیل لکھنے کو کہا جو ہم نے لکھ دی...

"آپ جاؤ، ہم کارروائی کرے گا اور تم کو اطلاع کرے گا۔"

کونسی کارروائی اور کونسی اطلاع... ہمارے لبوں پر ایک حقارت آمیز تبسم تھا... اس سفر سے واپسی پر... ایک مہینے کے بعد لاہور میں مجھے تین سو روپے کا ایک منی آرڈر وصول ہوتا ہے جس کی سلپ پر لکھا ہے۔ "آپ کی رپورٹ پر استغاثہ مرتب ہو کر عدالت میں پیش کیا گیا تھا جہاں سے ملزم کو مبلغ ایک ہزار روپے جرمانے کے علاوہ آپ کی زائد رقم کی وصولی بھی ہوئی تھی جس کو آپ کی خدمت میں بھیجا جا رہا ہے... از طرف... عبدالسعید... ایس ایچ او تھانہ چلاس۔ ضلع دیامر۔"

میرا خیال ہے میری شدید شرمندگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے...

یہ انصاف وہاں سے ملا تھا اور ملا تھا جہاں سے ہمیں اس کی امید نہ تھی... کم از کم پنجاب پولیس میں تو یہ تجربہ کم کم ہی ہوا ہوگا...

میں چلاس پولیس کا گرویدہ ہو گیا ہوں اور آئندہ جب کبھی ادھر سے گزروں گا تو ایک عدد "تھینک یو چلاس پولیس" کا سلیوٹ کر کے گزروں گا۔

"رائے کوٹ جہاں دل رکتا ہے... شکور سے ملاقات"

چلاس کے بعد ویگن نے بہر طور رائے کوٹ پل پر رکنا تھا اور اس کے ساتھ میرے دل نے بھی رکنا تھا کہ اوپر فیئری میڈو تھا...

اور نیچے شنگریلا کے متروک شدہ ہوٹل کے آس پاس اوپر جانے والی جیپیں تھیں۔ پورٹر اور گائیڈ تھے... اور شکور تھا... رزق روزگار کی آس میں بیٹھا سرخ بالوں والا شکور جو آج سے کتنے برس پیشتر... اٹھارہ برس... بیس برس... جانے کتنے برس پیشتر مجھے فیئری میڈو میں ملا تھا... پھر جب میں اپنے خاندان سمیت اوپر گیا تھا تو وہ مجھے سلجوق اور سمیر کو نانگا پربت کے بیس کیمپ تک لے کر گیا تھا اور واپسی پر زخمی سلجوق کو کندھوں پر اٹھا کر لایا تھا... اور پچھلے برس رحمت نبی کی کیمپنگ سائٹ میں وہ پھر مجھے خاص طور پر ملنے آیا تھا اور فیئری میڈو والی فلم کا ایک اہم کردار ہوا تھا...

وہ بوڑھا ہو چکا تھا اور اس کا سرخ بالوں والا سر لرزش میں تھا... چہرے کی جھریاں گہری ہو چکی تھیں... وہ ایک آئینہ تھا اور میں اس میں اپنے آپ کو دیکھ سکتا تھا... مجھے وہ شام یاد آئی جب کئی برس پہلے وہ اپنی رائے کوٹ شمشیری بڑی میں آشد گا کے کوارٹر تھا اور وہ جواب دے گئی...

"والدہ کیسی ہیں؟"

والدہ وہ میری بیوی میمونہ کو کہتا تھا... اور ان دنوں میمونہ نے والدہ کے بلانے پر بے حد مائنڈ کیا تھا کہ یہ بڈھا کس حساب میں مجھے والدہ کہتا ہے تو اس نے کہا تھا، بیگم صاحب میں تو آپ کے پیارے بچوں کے حوالے سے ان کی والدہ کہتا ہوں... ماں ہونے کی حیثیت سے ماں کہتا ہوں...

"بچہ لوگ کیسا ہے صاحب؟"

میرے ذوق مہک میں صرف ایک آنچ ہوتی.. خنجی کی شادی کی.. اس کے برابر میں ظاہر ہے ان کا ردا بابا لال پر احسان تھا اور وہ کیں بابا کی آنکھوں اور ضمیر کھٹکتے تھے..

"اچھا.." شکور کا منہ حیرت سے کھل گیا "بتی تو بہت چھوٹا تھا، ابھی سے اس کا شادی ہاں.."

"سب چھوڑو تھا شکور.. پھر وہ ڈاکٹر ہوگیا تو شادی بنا دیا۔"

شکور نے خنجی کو بے شمار دعائیں دیں جو سب کی سب میں نے سنبھال لیں اور پھر لاہور واپسی پر انٹرنیٹ پر اس کی چیٹ کرتے ہوئے.. اسے آئرلینڈ، امریکہ میں پنجابیوں کے فیئری سیٹ بھائی شکور دراسے کوٹ بلی پر بیٹھا تمہارے لیے یہ دعائیں کر رہا تھا...

"چناران میں رحمت نبی کا نزول اور.. محبت کے شگوفے"

کئی شام ہم گلگت میں تھے..

حسب روایت اور یہ روایت نئی نہ تھی ہم چناران میں تھے.. اور وہاں کرم الٰہی دینر ایک بھائی کی مانند میری خدمت کرتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ صاحب آزو کا موسم ختم ہوگیا ہے ورنہ ضرور پیش کرتا.. مجھے معلوم ہے آپ گلگت کے آزو نمک کے ساتھ بہت پسند ہیں.. ندیم تھا.. نیرستان کا تجربوں بھرا فرخ، رشید چہرہ تھا اور میری آمد کی خبر گلگت کی شب میں یوں پھیلی کہ اکرام بیگ اور فضل صاحب اپنی تمام تر مصروفیتیں ترک کر کے میرے پاس آگئے.. اور چناران میں دوستی اور خلوص کے شگوفے پھوٹنے لگے.. اور پھر میں ایک عجیب سے احساس سے دوچار ہوا.. میں جس کمرے میں تھا وہ کمرہ میری یادداشت کی دھند میں سے ابھر آ کر کچھ شناسا لگتا تھا.. یہ چناران کے اولین.. اور تنگ اور بند سے کمروں میں سے تھا.. جب یہ نئی تعمیر ہوا تھا تو یہ کمرہ اب سے تھا.. یہ وہی کمرہ تھا جس میں چھبیس کتنے برس پیشتر "ہنزہ داستان" کے زمانوں میں رات کے ایک بجے شاہراہ قراقرم پر اپنے پہلے سفر کے بعد تھکن اور ڈر سے شکستہ.. داخل ہوا تھا.. سلجوق کے ہمراہ اترا تھا.. اور سلجوق جو آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا اور وہ عالم ڈائننگ ہوا تھا کمرے میں داخل ہوتے ہی باتھ روم میں گھس گیا تھا نہانے کے لیے.. اور اندر سے آواز دیتا تھا کہ ابا اس کا نلکا تو لیک کرتا ہے.. اور وہ نلکا اب بھی لیک کر رہا تھا.. اسی کو روایت کا تسلسل کہتے ہیں..

کئی رات جب ہم سب.. حسن، برہانی اور میں نیند میں مدہوش تھے..

ایک دستک ہوئی..

"کون ہے؟" میں نے نیم غنودگی اور بیزاری کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

دروازہ کھلا اور ایک مشتبہ سا سایہ اندر داخل ہوا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی برمانی کے پاؤں پکڑ لیے۔ "تارڑ صاحب.."

برمانی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ "سائیں کون ہو تم.."

"سوری.." سائے نے کہا اور آگے بڑھ کر حسن صاحب کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔ "مرشد.." حسن صاحب بھی گھبرا گئے۔ "بھائی جان کس کو ملنا ہے؟" اور ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔

"سوری" سائے نے پھر معذرت کی اور پھر میرے قریب آ کر پہلے جھک کر اطمینان کیا کہ یہ میں ہوں اور پھر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ "مرشد میں سلام کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں.. سوری ڈسٹرب ہو.."

یہ فیبرز سیدا کا رحمت نبی تھا... جو صبح کے دو بجے نازل ہو گیا تھا۔

"اب میں جاتا ہوں تارڑ صاحب.. صرف سلام کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا۔"

"نیند جگا کر اب کہاں جاتے ہو.. بیٹھو.."

"میں بھی بیٹھنے ہی آیا تھا۔" وہ بیٹھ گیا۔

تمام روشنیاں آن کر دی گئیں.. برمانی اور حسن اپنے اپنے بستروں پر چوکڑیاں مار کر بیٹھ گئے۔ ویٹر کرم الٰہی کو جگا کر ان سے درخواست کی گئی کہ تازہ سالاد کی ایک طشتری اور مشروبات لے آئے اور محفل جم گئی..

اور ابھی جمی تھی کہ کھڑکی کے پردوں میں سے صبح کے آثار روشن ہونے لگے.. اور کھڑکی کے باہر جو سیب کا ایک درخت تھا اس کی شاخوں میں پتوں اور سیب سورج کی پہلی کرنوں سے زرد ہونے لگا..

"کوہ ہراموش کی سفید سستی"

جیسے شاہراہ قراقرم پر درجنوں بار سفر کرنے سے واقفیت تو ہو جاتی ہے لیکن.. اس کی عادت نہیں ہوتی..

اس شاہراہ کی بلند خطرناکی کی عادت نہیں ہوتی۔ بے شک یہ آپ کا چالیسواں پھیرا ہو.. ہندو بھائی اور ہندو بہن جی اگر ایک آگ کے گرد صرف سات پھیرے لگا لیں تو ان کی شادی ہو جاتی ہے.. یہاں عمر بھر پھیرے لگاتے رہیں تو کچھ نہیں ہوتا.. ہوتا ہے تو پھر کوئی حادثہ ہی ہوتا ہے..

تو جیسے شاہراہ قراقرم کی عادت نہیں ہوتی..

ایسے سکردو روڈ کی بھی عادت نہیں ہوتی...

چاہے آپ ادھر درجنوں بار ہی کیوں نہ آئے ہوں.. اس کے پھیرے پہ پھیرے کیوں نہ لگاتے ہوں.. اور یقین کیجیے سکردو روڈ میں پھیرے بھی بہت ہیں.. آپ کی ویگن دریائے سندھ کے اوپر ایک تنگ درے میں.. جس کی چٹانیں بس اب گریں کہ اب گریں کی دھمکی کے انداز میں جھکی ہوتی ہیں.. پھیرے لگاتی رہتی ہے.. ایک دو تین اور گھوم جاؤ.. ایک دو تین اور.. یعنی دائرہ رقص کے تمام سٹیپس یہاں موجود ہیں.. لیکن رقص تو آپ نہیں کرتے آپ کی ویگن کرتی ہے اور اگر ایک بھی سٹیپ غلط پڑ جائے تو آپ سیدھے نیچے سندھ میں پڑے ہوں اور ایسے پڑے کہ بحیرۂ عرب تک آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا کہ یہاں کیوں پڑے.. یہاں تک کہ اندس ڈولفن بھی نہیں پوچھے گی کہ وہ آپ کو قریب سے دیکھتا ہوا کچھ بھی نہیں سکتی گھومتے گھماتے آپ بھی گھوم جاتے ہیں اور پھر لاپرواہ اور مست ہو جاتے ہیں کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا..

مگر روڈ کو درج کی چٹانوں میں پہلی بار دل سستی میں نظر آتی ہے..

یہ بستی.. ایک بے آب و گیاہ چٹانی صحرا میں جانے کہاں سے بھٹکتی ہوئی آ نکلتی ہے..

اور یہ بستی بھی بے خبر ہے..

کیونکہ میں یہاں سے جتنی بار بھی گزرا ہوں میں نے سوائے ایک چھوٹی سی آبشار کے.. مٹی کے چند سرسبز کھیتوں اور کچھ درختوں کے سوا کبھی کسی ذی روح کو نہیں دیکھا..

صرف ایک ذی روح ہے اس بستی کے عین اوپر سانس لیتا برف سے سفید ہوتا..

آسمان کی نیلاہٹ میں بلند ہوتا.. اور وہ ہے کوہ ہراموش!

بادلوں اور دھند کا ایک ڈھیر جو سکردو روڈ سے بستی کے مقام پر چھایا نظر آتا ہے..

ہراموش تک میں جانا چاہتا ہوں..

یہ میرے مستقبل کے کوہ نوردی کے منصوبوں میں ترجیح اول ہے..

بڑھتی عمر اور گھٹتی ہمت پر تو میرا اختیار نہیں.. منصوبے بنانے پر تو میرا اختیار ہے.. سکردو روڈ پر سینکڑوں ایسے یکدم موڑ آتے ہیں جن پر مڑتے ہوئے اگر غیر متوقع طور پر سامنے سے ایک اور ویگن یا بس آ جائے تو.. اگر آپ اس لمحے محض سگریٹ کا ایک کش لگانے کے لیے سگریٹ منہ تک لے جا رہے ہیں تو بس اتنی دیر میں یا تو آپ اور یا سامنے سے آنے والی ویگن نیچے سندھ میں ہوں گے.. اور پھر باقی رہے نام اللہ کا.. یا کچھ عرصے کے لیے دریائے سندھ کا..

ایک مقام باغیچہ ڈوئی بھی راستے میں پڑتا ہے..

اور کیا باغ و بہار قسم کا مقام ہے جہاں اکثر کم باد و باراں بھی ہے.. ہرا بھرا ہے اور سرخ اور زرد رنگ کے پھول کھلا ہے... یہ دوبارہ بچہ.. یعنی باغیچہ اطفال ہے جس میں سکردو روڈ کے سہمے ہوئے بے خبر خوف کے مارے ہوئے بے خبر مسافر داخل ہوتے ہیں تو ہرے بھرے ہو جاتے ہیں..

دریا کے پار کبھی کوئی کچی پوست کا روگاؤں نظر آتا ہے۔ چٹانوں سے گرتے کسی سفید ریشمی آبشار کے دامن میں.. چند گھر.. کچھ کھیت.. پہاڑ میں کوہ کے ایک مجھ ہیرا اور یہ آبشار ایک نالے کی صورت اختیار کرتا نیچے سندھ میں گرتا ہوا.. گاؤں تک ایک پل سے سندھ کے آر پار.. کبھی تو سکردو روڈ ترک کر کے نیچے اتر کر اس پل کے پار اس گاؤں میں جانا چاہیے.. اس آبشار کی پھوار سے بھیگ کر کسی ہرے بھرے کھیت میں خیمہ لگانا چاہیے اور وہاں سے یہ دیکھنا چاہیے کہ سکردو روڈ پر شاید کوئی ایک ویگن.. بلکہ ہماری ویگن کتنی بیوقوف لرزتی ہوئی اور بے مقصد لگتی ہے۔

وہ کتنا ہے ہر شام نکلتا ہے.. منظر وسیع ہوتا ہے اور سکردو نکلتا ہے..

سندھ جو اکثر شاخوں میں بٹا.. ریتلے ٹیلوں اور جزیروں میں خاموشی سے بہتا ہے.. ان دنوں پورے جوبن پر ہے.. ٹیلوں اور جزیروں کو ڈبو کر تا رواں ہے.. بھرا ہوا ہے.. ہم از حد تھکے ہوئے ہیں..

کم از کم میں تو سب سے زیادہ تھکا ہوا تھا.. کہ مجھے لاہور میں اگلی صبح کے آغاز سفر کی فکر مندی نے سونے نہ دیا.. بشام میں شیر دریا کی لہریں میری نیند میں بھٹکتی رہیں اور جگلوٹ کی شب رحمت بی بی نے مجھے جگائے رکھا.. رات بھر طالع بیدار نے مجھے سونے نہ دیا.. اس لیے میں سب سے زیادہ تھکا ہوا تھا۔

اور دل کے کسی کونے میں چھپ کر اپنے اس سفر کو بھول کر ایک آرام دہ بستر پر ڈھیر ہو جانا چاہتا تھا..

"کیوں؟"

"آپ ہوشے سے مشابرم کے بیس کیمپ میں زیرہ دن میں پہنچ جائیں گے.. اور وہ ایک تنگ جگہ ہے.. مشابرم کی چوٹی راستہ روکے کھڑی ہے اور بس.. ایک دن میں واپس ہوشے آ جائیں گے تو کُل دو حائی دن کی ٹریکنگ کیا ٹریکنگ ہوئی۔"

میں کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ وہ کیا پنجابی گیت ہے جگجیت سنگھ کا کہ.. ڈھائی دن نہ جوانی چلدی.. تے کُرتی ململ دی.. تو ڈھائی دن کی کوہ نوردی بھی بہت ہوتی ہے لیکن میں نے کہا یہ کہ.. مشابرم بیس کیمپ نہ جائیں تو کہاں جائیں؟....

اس سوال کا جواب کیا آیا یہ بتانے سے پہلے میرا ابھی جی چاہ رہا ہے کہ میں آپ کو اس گیت کے بارے میں ایک اور مزیدار واقعہ بتاؤں۔ ایک شب.. ایک گئی شب جب میں اپنا سنڈی مینل پر بیٹھا جھک رہا تھا میں کوئی اس قسم کا سفرنامہ لکھ رہا تھا اور گرمی سے نڈھال اور پسینے سے شرابور تھا تو ایک ٹیلی فون آیا.. پس منظر میں خوب شور شرابہ تھا اور شور اتنا تھا جتنا شرابہ تھا کیونکہ اس میں شراب کی آمیزش تھی.. کوئی صاحب اس آمیزش میں ڈوبے بولے "تارڑ جی.. ہم تو آپ کے پجاری ہیں.. چرن چھونا چاہتے ہیں.. ادھر آپ کے لاہور میں مشرقی پنجاب سے آئے ہیں ایک کانفرنس کے سلسلے میں تو چرن چھونے آ جائیں؟ ویسے آپ آ جائیں تو بھاگ جاگ جائیں ہمارے.. ہم کسی شاہ نور سٹوڈیو کے قریب رنگ جمائے بیٹھے ہیں.. پرویز مہدی گا رہے ہیں.."

"شکریہ بہت بہت.. لیکن رات کے اس پہر ذرا مشکل ہے.. ویسے آپ اپنا تعارف تو کروا دیجیے کہ کیا کرتے ہیں.. کون ہیں؟"

"او جی.. ہمیں تو پورا امریکہ جانتا ہے.. پورا یورپ جانتا ہے.. پورا افریقہ جانتا ہے.. آپ نے جگجیت سنگھ کا وہ گیت نہیں سنا.. ڈھائی دن نہ جوانی چلدی.. تے کُرتی ململ دی.. سنا ہے؟"

"بالکل سنا ہے اور متعدد بار سنا ہے۔"

"تارڑ جی.. وہ گیت آپ کے اس پجاری نے لکھا ہے.. سناؤں؟"

اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہتا ان صاحب نے یہ گیت الاپنا شروع کر دیا اور پس منظر میں جو شور شرابہ تھا وہ مزید شراب ہو گیا.. اور گیت کے درمیان رُک کر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے.. او سے تارڑ جی ڈھائی دن نہ جوانی چلدی.. تو ذرا ہے گل کُرتی ململ دی ہے کہ نہیں.. نہیں تو میں پہنچ ہوں..

مجھے افسوس ہے کہ میں اس شب اس عظیم گیت نگار کے درشن نہ کر سکا اور اپنی سنڈی میں ہی قید رہا۔

بہرحال یہ قصہ ململ کی کُرتی یہاں تمام ہوتا ہے اور وہ لمحہ آتا ہے جب میں نے چنگیزی کے دفتر میں بیٹھے ہوئے پوچھا کہ.. بیس کیمپ نہ جائیں تو کہاں جائیں؟

"آپ جانتے ہیں کہ 93ء تک کے ٹو بیس کیمپ اور کنکورڈیا جانے والے کوہ نورد وہاں پہنچ کر واپس اُلٹے قدموں اسی راستے سے لوٹ جاتے تھے.. اسی گورو، اردوکس اور پائیو اور گورو فون سے واپس اسکولے جاتے تھے.. لیکن پھر ایک نیا راستہ دریافت ہو گیا.. کے ٹو بیس کیمپ سے کوہ نورد اب مشابرم گلیشیئر کو کراس کرتے ہیں.. وہ گوندوگورو کو عبور کرتے ہیں اور ہوشے میں آ نکلتے ہیں تو آپ جائیں گوندوگورو.. جسے گوراوگ گوندوگوروِلا کہتے ہیں.."

"کیا گوندوگورو کا اسلام سے جناب عالی" میاں صاحب مجھ سے بولے اور بڑی مشکل سے بولے کیونکہ سگریٹ کے زور سے ان کا جو کچھ بول رہا تھا وہ بند ہو چکا تھا..

"آپ اسے انگریزی میں نہ بولیں" سلمان نے صلاح دی۔ "اردو میں ذرا تیز سے بولیں.."

"ہوشے سے گوندوگورو بیس کیمپ تین دن کی مسافت پر ہے.. راستے میں ذل منگ پا ہے جس کا مطلب ہے پھولوں کا کھیت.. بیس کیمپ سے آپ ہائی کیمپ جائیں گے اور پھر وہاں سے آپ اٹھارہ ہزار فٹ بلند گوندوگورو کی شاندار چوٹی فتح کریں گے۔"

"میں میں بھی فتح کر لوں گا.. اس عمر میں؟"

"ہاں.. اسے کسی بھی عمر میں فتح کیا جا سکتا ہے.. ستر برس کے گورے بھی اس کے اوپر پہنچ جاتے ہیں.. آپ کی عمر تو ایک دو برس کم ہی ہو گی.."

"کیسے.. جلدی سے بتاؤ کیسے؟"

"آپ ہائی کیمپ سے رات بارہ بجے نکلیں گے اور اوپر چڑھنا شروع کر دیں گے۔ ٹارچوں کی روشنی میں.. برف ابھی سخت ہو گی اور آپ کے بوٹوں کے ساتھ کریمپون ہوں گے تو آسانی سے چلیں گے.. تقریباً پانچ بجے آپ چوٹی کے دامن میں پہنچ جائیں گے اور جب آپ سر اٹھا کر اوپر دیکھیں گے تو آپ گھبرا جائیں گے کہ وہاں چوٹی تک ایک برف کی سیدھی دیوار بلند ہوتی ہے لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں، وہاں ہوشے کے کچھ ہائی پورٹر مستقل طور پر قیام پذیر ہیں

اور انہیں RESCUE ٹیم کہا جاتا ہے۔ انہوں نے چوٹی تک رسے باندھ رکھے ہیں۔ وہ فی کوہ نورد تین سو روپے چارج کریں گے اور پھر آپ ان پورٹروں کی مدد سے رسوں سے لٹکتے برف کی دیوار پر چڑھتے صبح چھ بجے کے قریب چوٹی پر پہنچ جائیں گے۔"

"اور اگر رسہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو کیا ہوتا ہے؟"

"وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے صاحب... لیکن ادھر چوٹی پر پہنچتے ہیں تو صاحب وہاں سے کیا منظر ہے۔"

"کیا منظر ہے؟" عامر نے پر اشتیاق ہو کر پوچھا۔

"وہاں سورج نکل رہا ہوتا ہے اور آپ کے نیچے سے کہیں برفوں میں سے طلوع ہو رہا ہوتا ہے... اور اس لئے چوٹیلیزا مشابرم اور کے ٹو نظر کے سامنے ہوں گی۔"

"یعنی نظر کے سامنے جگر کے پار" سلمان چہکنے لگا۔

"ہاں جی... آپ کچھ دیر ٹھہریے... تصویریں اُتاریئے... لیکن زیادہ دیر نہیں کیونکہ نیچے کو ہوں کی ایک لائن لگی ہوتی ہے کہ آپ اُتریں تو وہ اوپر جائیں... تو آپ انہی رسوں کو تھام کر نیچے آجائیں گے... دیر کریں گے تو برف نرم ہو جائے گی۔"

ایک بار تو مجھ ایسے یورپ کی سب سے بلند چوٹی، موں بلانک سے بھی دو ہزار فٹ مزید بلند چوٹی کو فتح کرنے کے امکان نے میری ٹیم کے تن مردہ میں ایک نئی کبڑا اور ایڈونچر کی روح پھونک دی... وہ بے حد ایک اتحد ہو کر ان مینڈکوں کی طرح ٹرانے لگے جو ایک طویل خشک سالی کے بعد بارش کی پہلی بوچھاڑ میں بھیگتے ہی پھر سے زندہ ہو جاتے ہیں اور ٹرا ٹرا کر جینا وبال کر دیتے ہیں...

"فتح کریں جی مشابرم کو... چوٹی فتح کریں۔"

"مرے تو باہر کے لوگ ہیں جی، ہمارے قبیلے سے باہر کے لوگ... تو یہ ہم سے ہمیشہ پوچھتے ہیں کہ تم جو پہاڑوں پر جاتے ہو تو وہاں جا کر ذرا پربت اور کے ٹو پر کیوں نہیں چڑھ جاتے... انہیں فتح کیوں نہیں کرتے... انہیں تو معلوم نہیں کہ کوہ نوردی اور کوہ پیمائی میں فرق ہوتا ہے تو ایسے لوگوں کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کرنے کے لیے یہ گولڈن چانس ہے... ہم اس... کیا نام بتایا ہے چوٹی کا... جو کچھ بھی ہے تو ہم اس پر چڑھ ہی جائیں... واپسی پر بیان دے دیں گے کہ کے ٹو پر چڑھ کر آئے ہیں۔"

"ویسے مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن..." میاں صاحب پھر بولے۔ "چوٹی کا نام ذرا مختلف ہے... اب یہ چنگیزی کا آدمی اسے بار بار گانڈو گورو کہہ رہا تھا۔"

"میاں صاحب آپ مہربانی کر کے بجائی گیٹ لاہور سے نکل کر بلتستان میں آجائیے پلیز... ہر تہذیب اور ہر زبان کی صدائیں اور لہجے الگ الگ ہوتے ہیں۔" میں نے لیڈر کی حیثیت سے انہیں ڈانٹا۔ اگرچہ میں بھی نام کے بارے میں ذرا فکرمند تھا... چوٹی کا نام کچھ اور ہوتا تو ذرا بہتر ہوتا...

"ہائی لیڈر..." اور یہ ادبیات طرز تکلم شاہد کا ہی ہو سکتا تھا جس نے اپنا سیاہ جاسوسی چشمہ ایک مدت کے بعد آنکھوں سے الگ کیا اور چندھیائی ہوئی نا خیالانہ نظروں سے سب کو دیکھتے... بلکہ شاہد دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرے رک سیک میں اتفاق سے ایک پاکستانی پرچم موجود ہے جو میں گنڈو گورو کی چوٹی پر لہرا کر پاکستان اور اسلام کا نام روشن کروں گا... ایک مدت سے پاکستان اور اسلام کا نام روشن کرنے کی ایک خواہش دیرینہ دو پارینہ میرے اندر موجزن ہو رہی تھی... ہائی لیڈر... چڑھ جائیں چوٹی پر..."

یہ "چڑھ جائیں چوٹی پر" اس نے "چڑھ جا سولی پہ" کے انداز میں کہا تھا۔

کم گو اور شدید مجبوری کے تحت بات کرنے والا ہر انی بھی بولا "سائیں آپ تو جانتے ہو کہ میرے خیالات میں کتنی روانی بہت ہے... میں تو لیٹے لیٹے کسی پکنک کو بھی دلہن کے روپ میں خوابوں میں دیکھتا ہوں اور صبح شرمندہ ہوتا ہوں تو ایک بلند برفانی چوٹی پر چڑھنا میرا خواب ہے... مجھے چڑھ جانے دیں۔"

میں نے پہلے اپنے آپ کو دیکھا... اس طرح دیکھا جیسے باتھ روم کے قدِ آدم شیشے میں نہانے سے پیشتر اپنے آپ کو دیکھتا ہوں اور جو کچھ میں نے دیکھا اسے پسند نہ کیا اور پھر سلمان کے تن و توش پر نظر کی... ہمارا اشتر گرنہ کی ہنگ الگ ہو چکی ہے اتنا تھا کہ اول تو وہ برف کی دیوار میں نصب رسے ہمیں سہار نہیں سکتے تھے اور اگر ہم گرتے پڑتے چوٹی پر پہنچ جاتے تھے تو پوری چوٹی ہمارے وزن سے مسمار ہو سکتی تھی... اس کے علاوہ بلندی کے مسائل بھی تھے کہ ہم دونوں زیادہ سے زیادہ سترہ ہزار فٹ اونچائی کو بمشکل برداشت کر سکتے تھے... اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اگر اوپر چڑھتے ہوئے پھسل جاتے ہیں... گر جاتے ہیں تو پھر گر جاتے ہیں۔" اگرچہ وہاں رسے نصب ہیں لیکن انہیں صبح کی نیم تاریکی میں برف کی دیوار کے ساتھ تھامنا اور اوپر چڑھنا تو ہم نے ہے... تو کیا ہم

ہی اتنی ہمت ہے... اور ہمارے پاس آکسیجن بھی نہیں... کریمپون بھی نہیں جن کے بغیر ہم چوٹی تک نہیں جا سکتے۔" میں نے احتیاطاً خطرے کی گھنٹی آہستہ آہستہ بجائی۔

"تارڑ صاحب یہ سب کچھ آپ کو ہائی کیمپ میں مل جائے گا۔" چنگیزی کا اسسٹنٹ نہیں... گنڈوگورو کی چوٹی پر پہنچنے پر تلا ہوا تھا۔ شاید کہیں شرط لگا کر آیا تھا کہ میں تارڑ کو گھسیٹ کر وہاں تک پہنچا کر رہوں گا۔ "ویسے کیا آپ نے کبھی کوئی چوٹی سر کی ہے؟"

"برفانی چوٹی تو نہیں۔"

"تو پھر آپ نہیں جانتے کہ پچھلے بیس برسوں کی کمزوری ایک طرف اور... کسی بلند ترین برفانی چوٹی پر ایک قدم رکھنا ایک طرف۔"

"یعنی مرنے کے سامان تیار ہیں۔"

"مرنے... موت کا ایک دن معین ہے... اور آپ تو عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں ان کا امکان لگا رہتا ہے... چلتے ہیں سر... دیکھا جائے گا۔" یہ بیان جانے کس نامراد نے دیا تھا مجھے یاد نہیں... کیونکہ پوری ٹیم سرخوشی کی برفانی مسرت سے سرشار تھی۔ چنانچہ آزادی جو ہوکر زمانہ آ گیا تھا... شاید ہم بیس کیمپ کا سفر ترک کر کے پائیں اور گنڈوگورو کو منزل بنا لیا گیا... البتہ میں نے ایک شرط رکھ دی۔ "ہم گنڈوگورو کے بیس کیمپ پہنچ کر یہ فیصلہ کریں گے کہ کیا ہم نے وہاں سے ہائی کیمپ اور پھر چوٹی تک جانا ہے یا نہیں۔"

"کیوں نہیں جانا ہمارے لیڈر... چوٹی وہاں سامنے موجود ہو اور ہم نہ جائیں... پاکستان اور اسلام کا پرچم اس پر نہ لہرائیں... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"شاہد صاحب... عمران بیٹے کو بچا لیں۔" سلمان تنہا جو بے شک بہت فرمانبردار بچہ تھا لیکن بہت بدتمیز بچہ بھی تھا، اس کا قصور نہ تھا... انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں جس نے بھی چند برس گزارے ہوں اس کے لیے زندگی میں باتمیز ہونا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ "آپ اگر گنڈوگورو کی چوٹی پر نہیں پہنچے تو ہم وہاں پر ڈیکلیئر کر دیں گے کہ پہنچ گئے تھے... جیسا کہ آپ نے کنکورڈیا سے واپسی پر اعلان فرما دیا تھا کہ ہم لوگ کے ٹو کے بیس کیمپ میں جا پہنچے اور پھر میری آنکھ سے آنسو ٹپکا... ٹپکتے ہی برف میں بدل گیا اور اس برف میں کے ٹو کی تصویر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گئی... حالانکہ تارڑ صاحب نے "کے ٹو کہانی" میں اقرار کیا ہے کہ آپ لوگ کے ٹو بیس کیمپ نہیں پہنچے تھے۔"

"اے نادان بچہ..." شاہد صاحب نے نہایت الفت سے سلمان کو دیکھا۔ "تم ابھی

بچے ہو... تمہارا تو صرف ابھی نکاح ہوا ہے... تم تو نے والی کا بھاؤ کیا جانو... ہم سے پوچھو... جتنا عرصہ ہمیں شادی شدہ ہوئے گزرا ہے اس کے بعد ایک تخیل جنم لیتی ہے... آپ کو... جو کچھ نظر آنے لگتا ہے جو نظر نہیں آتا... اور ان تخیل میں اگر کے ٹو بیس کیمپ نہیں بھی پہنچے تو پہنچ جاتے ہیں... یہ تو تخیل کی پرواز کے کرشمے ہیں... اب یہ ہمارے لیڈر صاحب ہیں۔ ایسے ایسے منظر بیان کرتے ہیں جو ہمیں تو نظر نہیں آتے... صرف انہیں نظر آتے ہیں۔"

"جناب مجھے شادی شدہ ہوئے آپ سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے اس لیے میرے تخیل کی پرواز آپ سے بھی اونچی ہے... برائے کرم اپنی لڑائی لڑیں اور مجھے معاف رکھیں۔"

"اب سمجھ آئی؟" شاہد نے فاتحانہ انداز میں سر ہلایا۔

"بالکل سر۔" نادان بھانجے نے سر جھکا لیا۔ "چلیں گنڈوگورو کی چوٹی پر چلیں لیکن دھیان رکھیں کہ راستے میں کہیں میں لڑھک ہی نہ جاؤں۔"

"سکردو بے وفا ہو جاتا ہے اور چلو چلو چلو چلو..."

کے ٹو ہوٹل نہ صرف فل تھا بلکہ اس کے برآمدوں میں بھی ایسے ملکی اور غیر ملکی سیاح تھے کہ کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ تھی۔

ہم نے اگرچہ گلگت سے فون پر اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی لیکن استقبالیہ صاحب نے نہایت احترام سے عرض کیا کہ جناب فون کس نے اٹینڈ کیا تھا.. ہوٹل میں ایک کمرہ بھی خالی نہیں ہے.. بلکہ یہ جو دو گورے مجھ سے الجھ رہے ہیں، ان کی بکنگ ہونے کے باوجود ان کے لیے بھی گنجائش نہیں کیونکہ کچھ مہمان جو رخصت ہونے تھے، فلائٹ نہ ہونے کی وجہ سے رخصت نہیں ہو رہے اور کمرے خالی نہیں کر رہے.. سوری سر..

باہر ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی اور ہوٹل کے ڈائننگ روم سے ایک ایسا منظر نظر آ رہا تھا جس پر بادل اترے ہوئے تھے اور شام کو ہم ٹریک کرتے تھے... یہ منظر ہمیں خوشی دیتا اگر ہمیں رہائش مل جاتی اور رات ہم اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھتے لیکن اب یہ ہمارے لیے اداسی اور اذیت تھا کیونکہ ہم بے گھر تھے..

ہنزہ کے ریاض صاحب جن سے ایک مدت سے آشنائی تھی، ان دنوں یہاں منیجر تھے.. میرے بچوں سے دوستی تھی کہ گلگت میں ہوٹل کے لان میں واقع سیب کے درخت پر بنفس نفیس چڑھ کر ان کے لیے سیب اتارتے تھے.. لیکن وہ سکردو سے باہر تھے.. اندر بھی ہوتے تو شاید تب بھی مجبور ہوتے کہ ہوٹل بھرا پڑا تھا..

البتہ واپسی پر ریاض صاحب نے ساری کسر نکال دی.. خپلو سے نکل کر ہم تھوڑی دیر کے لیے سکردو رکے تو ہم پر باقاعدہ نچھاور ہو گئے.. ہم سب کے لیے لنچ کا بندوبست کیا اور ہر پانچ

منٹ کے بعد کہتے" تارڑ صاحب.. آج صبح پنجے سندھ کے کنارے سیر کرتے ہوئے پورے چھ بجکر چودہ منٹ پر میں نے آپ کو بہت یاد کیا.. اپنی بدقسمتی پر تاسف کیا کہ ہائے ہائے تارڑ صاحب آئے اور میں موجود نہ تھا.. پورے چھ بجکر چودہ منٹ پر.." پھر سر ہلاتے اور مرغے کی ایک ٹانگ کو چٹکی میں پکڑ کر کہتے "رزق میرے ہاتھ میں ہے تارڑ صاحب.. پورے چھ بجکر چودہ منٹ پر.. آج صبح میں نے آپ کو یاد کیا... کے ٹو ہوٹل میں جو اضافے ہو رہے ہیں، ہم ان کمروں کے نام ان شخصیات کے نام پر رکھ رہے ہیں جنہوں نے شمال کے لیے بہت کام کیا ہے... انشاء اللہ ایک ونگ آپ کے نام پر ہوگا.. اور تارڑ صاحب آج صبح پورے چھ بجکر چودہ منٹ پر.. ہوٹل کے برآمدوں میں آپ کے ٹریکس کے بارے میں جو کورڈ اور پوسٹر وغیرہ چسپاں ہیں، کئی انگریز انہیں سوونیر کے طور پر خریدنا چاہتے ہیں لیکن یہ تو ہماری پہچان ہیں تارڑ صاحب.. ویسے آج صبح چھ بجکر چودہ منٹ پر.."

لیکن ریاض صاحب کی یہ محبت تو ہمیں واپسی پر ملی..

ابھی تو ہم بے آسرا تھے اور ہلکی بارش ہو رہی تھی..

استقبالیہ صاحب نے یہ پیشکش بھی کی کہ آپ جیپ میں سدپارہ چلے جائیں وہاں ہو سکتا ہے کمرے مل جائیں گے.. لیکن اس میں کچھ سخت مقام آئے ہیں۔ اب شام ہو چکی تھی سدپارہ جانے کے لیے جیپوں کا بندوبست کریں، اپنی ویگن یہیں کہیں چھوڑ دیں.. کل صبح پھر واپس سکردو آئیں.. نہیں اس میں خرخشہ بہت تھا..

"سر آپ شیر علی ہوٹل کو ذرا چیک کر لیں شاید وہاں جگہ مل جائے.."

"شیر علی تو ہمارا شیر ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا اور ہم کے ٹو ہوٹل سے باہر آ گئے..

لیکن کنکورڈیا ہوٹل میں بھی یہی حالات تھے اور شیر علی یوم آزادی کے سلسلے میں کھیلے جانے والا ایک فٹ بال میچ دیکھنے گیا ہوا تھا اور ہوٹل میں اس کا ایک "چچا" انچارج تھا جو بے حد مددگار ثابت ہوا۔ "تارڑ صاحب ہوٹل بالکل ہی فل ہے.. لیکن فکر نہ کریں میرے پاس ایک نمکی کمرہ ہے وہ حاضر ہے.. ہمارا نیا پولیس ریسٹ ہاؤس ہے وہاں ایک کمرے کا بندوبست ہو جائے گا.. اور اگر بارش زیادہ نہ ہوئی تو بے شک لان میں ٹینٹ لگا لیجیے.."

شیر نے یہ ہوٹل کے ٹو ہوٹل کے سامنے ہی دریائے سندھ کے اوپر بنایا تھا..

عجیب سکردو کی شام تھی جس میں بارش کی اداسی اتری تھی اور ہم بے گھر تھے.. رات سر پر تھی..

"غرناطہ کے ایک اندھے فقیر کو دیکھ کر کسی نے کہا تھا کہ اے عورت.. اس فقیر کو خیرات دو کہ غرناطہ جیسے خوبصورت شہر میں اندھا ہونا.. اس سے بڑی بدقسمتی کوئی نہیں.. تو کسی شام سکردو میں اندھا سر پر چھت نہ ہونا.."

نامکمل کمرے کا باتھ روم بھی نامکمل تھا.. اور کچھ بو بھی تھی..

پولیس ریسٹ ہاؤس کا کمرہ تھا تو اطمینان بخش لیکن مجھے بے آرامی کی دوری تھی.. بارش کا کچھ پتہ نہ تھا کہ تیز ہو جائے اس لیے خیمے نصب کرنا بھی دانشمندی نہ تھی.. اور ہم میں ہمت بھی نہیں تھی خیمے نصب کرنے کی..

"یس سر..." کنگ روزیا کا چھوٹا واقعی میرے لیے فکرمند تھا۔ "ایک بات بتاتا ہوں.. ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ تو اپنی ویگن لے کر آئے ہو تو آپ خپلو کیوں نہیں چلے جائے۔ ادھر تو نیا ہوٹل بنا ہے اور زبردست ہے.. اور خالی ہے.."

میں نے اس نئے ہوٹل کی تعریف سن رکھی تھی.. لیکن خپلو؟...

"آٹھ بج رہے ہیں اور رات ہو چکی ہے تو... لیکن کیا ہماری ویگن خپلو جا سکتی ہے؟ رات کو اس روڈ پر ٹریفک چلتا ہے؟"

"ادھر تو اب ٹریلر اور فوجی ٹرک بھی جاتا ہے سر.. ادھر خپلو جائے گا تو اور کدھر جائے گا.. سیاچن کا راستہ ہے ناں.. ادھر تو دنیا کا ٹریفک چلتا ہے۔"

"کیوں حکیم؟" میں نے باہر آ کر حکیم سے رجوع کیا جو بار بار اپنا ازار بند ازسرتا پہلی بار سکردو کی رات میں بے سدھ ہو کر حیرت سے تکتا تھا۔ "خپلو چلیں۔"

"جی؟" وہ چونک گیا۔ "کدھر چلیں؟"

"خپلو.."

"یہ کوئی اور ہوٹل ہے؟"

"نہیں۔ یہاں سے ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر ایک وادی ہے.. راستہ تقریباً میدانی ہے اور روڈ پر ٹرک بھی چلتے ہیں.. یہاں تو رات گزارنے کے لیے کوئی بندوبست نہیں.. وہاں تو چلیں؟ تم تھک تو نہیں گئے؟"

"تھک گیا ہوں.." اس نے فوراً اقرار کر لیا۔ "سکردو روڈ بہت خطرناک ہے سر... بہت تھک گیا ہوں۔"

"حکیم تھک گیا ہے؟" عامر کے اندر خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ "ہم دو صاحب تھکے ہوئے ڈرائیور کو کبھی مزید ڈرائیونگ کے لیے مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ ٹھیک ہے حکیم تم تھک گئے ہو تو کہیں جا کے آرام کرو.."

"یہ تو آرام کرے عامر لیکن ہم کہاں آرام کریں.."

"ہاں یہ مسئلہ بھی قابلِ غور ہے.."

"حکیم.." میں نے لاہور سے چلنے کے بعد پہلی بار ویگن کے لیے ادا کیے جانے والے مبلغ ڈھائی ہزار روپے روزانہ.. چاہے وہ ایک ہی مقام پر ہفتہ بھر کھڑی رہے، پھر بھی ڈھائی ہزار روپے روزانہ.. پلس ڈیزل کا خرچہ، پلس ڈرائیور کے روٹی، پانی اور رہائش کا خرچہ.. ان سب خرچوں کے خرچ کرنے والے کو جتنا حق ملنا چاہیے اس کا مطالبہ کر دیا اور آرڈر دے دیا کہ... حکیم راستہ آسان ہے.. خپلو چلنا ہے.. چلو!"

حکیم نے جس ذہنی کچھ بدتمیزی اور بیزاری کا مظاہرہ کیا وہ قابلِ دید تھا۔ "یہ خپلو ہے.. اور سیاچن کی طرف ہے تو راستے میں برف تو نہیں ہے؟"

"نہیں.. سیدھا اور سوکھا راستہ ہے.. ہموار اور مستقیم ہے... تم بے فکر چلے چلو.. چلو۔"

میں اس سے پیشتر دو مرتبہ خپلو... یعنی خپلو جا چکا تھا. پہلی بار نگار اور سلیقہ مجوبی کے ہمراہ اور دوسری مرتبہ اپنے خاندان کے ساتھ.. اور راستے میں کیسے کیسے سبز گاؤں آتے تھے جہاں دو منزلہ چوبی گھر اور گندم کے پکے ہوئے گولڈن فیلڈز تھے... وہ مقام تھا جہاں تبت سے آنے والا شیر دریا.. اس سے بڑے دریا شیوک کو اپنی آغوش میں لے کر مدغم کر لیتا تھا..

"بھگت کبیر اور میرابائی خپلو کے موٹل میں"

ہم اُسی رات خپلو پہنچے..

راستے میں حکیم بخشو لطف کرتے رہے.. سکھوں کے لطیفے سناتے رہے.. ان کی خوشامد اس طرح کرتے رہے جیسے وہ کوئی فوجی حکمران ہو.. اس کی بے مثل ڈرائیونگ اور نشیلی آنکھوں کی تعریف کرتے رہے تاکہ... وہ اکتا نہ جائے.. ہمیں اللہ کے حوالے نہ کر دے..

خپلو پہنچے اور پی ڈبلیو ڈی کے نئے موٹل میں داخل ہوئے.. تو ششدر رہ گئے..
سناٹے میں آ گئے..

خپلو جہاں کچھ عرصہ پہلے تک باہر سے آنے والوں کے لیے ایک دو کمروں کا پرانا ریسٹ ہاؤس تھا اور بازار میں بوسیدہ اور حشرات الارض سے رینگتے چند گندے کمبل اور بچھے فرشوں کے ایک دو ہوٹل تھے، وہاں اب خپلو میں ایک ہوٹل تھا.. جدید فن تعمیر اور مقامی روایت سے جڑا ہوا ایک ایسا ہوٹل تھا کہ ہم ششدر رہ گئے..

لیکن انعام صاحب.. جو اس ہوٹل کے منیجر تھے اور میرے قدیمی دوستوں میں سے تھے اور میں انہیں ان کی سادگی اور ہمدرد خصلت کی وجہ سے قدرت کا انعام کہا کرتا تھا.. وہ یہاں نہیں تھے.. مجھے ہشام سے ہی اطلاع مل گئی تھی کہ انعام کے بال بچے گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے ان کے پاس خپلو آئے تھے.. وہ اسلام آباد واپس جانے کے لیے سکردو سے ایک نئی اور تابناک ائیرکنڈیشنڈ بس میں سوار ہوئے اور مانسہرہ کے قریب اس بس کا ڈرائیور اونگھ گیا..
حادثے میں انعام کی اہلیہ ہلاک ہو گئیں اور بیٹے شدید زخمی ہو گئے.. انعام اپنی اہلیہ کو دفن کرنے کے لیے اور ہسپتال میں پڑے اپنے بیٹوں کی دیکھ بھال کے لیے وطن جا چکے تھے.. خپلو میں نہیں

تھے.. ہشام سے یہاں خپلو تک میں سوچتا رہا تھا کہ انعام ایسے نفیس شخص کو یہ کیا انعام ملا.. لیکن اس کی رضا کے آگے سر جھکانے کے علاوہ کیا کیا جا سکتا ہے..

انعام کے اسسٹنٹ ارشاد موٹل کے معاملات کی نگہبانی کر رہے تھے..

ریسپشن ہال میں خپلو میں تعینات ایک کرنل صاحب کے شہری بچے.. غالباً اسلام آبادی بچے بوریت کے شدید عالم میں.. بیزاری کی ایک لاجواب کیفیت میں.. کہ ایک شہری بچے کو اگر زبردستی پدرانہ شفقت کے زور پر خپلو ایسی دور افتادہ وادی میں ایکسپورٹ کر لیا جائے تو اس کا یہی حال ہوگا.. یہ بچے صوفوں پر نیم دراز ریموٹ ہاتھ میں لیے ٹیلی ویژن کے چینل بدلتے تھے اور والد صاحب کو ناراض نظروں سے دیکھتے تھے.. کرنل صاحب ہمیں دیکھ کر نہایت خوش ہوئے، بے شک کرنل تھے لیکن بچے تھے اور باہر کی دنیا سے آنے والوں سے مل کر خوش ہوئے..

موٹل دریائے شیوک کے کناروں پر ایک شالیمار کی مانند تختہ بہ تختہ اٹھتا تھا اور سب سے اوپر والے تختے پر عمارت کے کمرے تھے.. ہم ان شاندار کمروں کی بلند چھتوں اور لکڑی کے بھاری شہتیروں اور آہنی گرفت والی چھتوں کے نئے نویلے کنوارپن کی مہک والے کمروں میں داخل ہوئے تو سکردو روڈ کے خوف اور حکیم بخشو کے ایک جھٹکے سے اکتاہٹ اور پھر وہاں سے رات کی سیاہی میں جو ایک طویل تھکاوٹ کا سفر تھا اسے بھول بھال گئے..

جیسے کوئی چوٹی پر پہنچ جانے والا کوہ پیما... برس ہا برس کی ٹریننگ کی مشقت.. اپنے ملک سے اسلام آباد، پھر سکردو... پھر اسکولے.. پائیو.. اردوکس.. گورے، کنکورڈیا.. بیس کیمپ سے اوپر جو برفانی... جس میں اور بلندی پر جو سانس اکھڑتا ہے اور کبھی واپس کر دیا جاتا ہے اور کبھی کسی دراڑ میں جھٹکا دیا جاتا ہے اور اس کا نام "گلکی میموریل" کی چٹان پر کسی سلور کی تھالی پر کھود کر اس کا کتبہ لگا دیا جاتا ہے تو وہ اگر کے ٹو کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے تو یہ سب کچھ بھول بھال جاتا ہے..

ایسے ہم بھی بھول بھال گئے..

جیسے برفوں میں منجمد کسی پرندے کو آگ کے سامنے رکھنے سے اس میں جان پڑنی شروع ہو جاتی ہے.. ایسے ہم بھی زندہ ہونے لگے اور چہکنے لگے..

"یہاں تو جشن ہونا چاہیے تارڑ صاحب" حسن صاحب شرماتے ہوئے بولے کہ وہ برمالی کے ہمراہ میرے ہم کمرہ تھے..

"حسن جی.. ہم آج سویرے گنگت سے چلے تھے.. یقین تو نہیں آتا کہ گنگت سے چلے

تھے۔ تقریباً پندرہ گھنٹے ہو گئے ہیں مسلسل سفر کرتے... تو آپ تھکتے نہیں، ہونہہ جائیں؟"

"مرشد... ہو گئے تو گئے... ذرا تھکاوٹ اتارتے ہیں... چکن سے روسٹ چکن اور چپس منگواتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ میرا معدہ کمزور ہے۔ میں مقامی پانی نہیں پی سکتا تو لاہور سے لایا ہوا منرل واٹر پیتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں..."

"تارڑ صاحب اس بارے کی بھی کوئی گزارش سن لیں۔" برمانی جیسے ایک ریچھ کی مانند اپنی سرمائی نیند سے بیدار ہوا... حسب عادت سرگوشیوں میں گویا ہوا۔ "مشہور نہیں... محض گزارش ہے... یہ جو دو شے ہے اور گندہ گردوغبار ہے سائیں تو اس کو فراموش کر دیں... ہمیں اسی ہوٹل میں چند روز قیام کرتے ہیں... اس کے شالیمار تختوں میں آپ کے پسندیدہ زرد پھول کھلے ہیں اور سائیں مرد وہ ان میں جھومتے جاتے ہیں... اور ذرا کمرے کی بالکونی میں جا کر دریائے شیوک کے نظارے دیکھئے اور اس کے پار پہاڑوں کی برفوں میں دھیرے دھیرے حرکت کرتے بادل دیکھئے... ہمیں اور کیا چاہیے..."

"برمانی۔ تمہیں رات کے اس پہر... جبکہ آدھی رات کے سے دریا پار برفوں میں دھیرے دھیرے حرکت کرتے بادل کیسے نظر آ گئے..."

"سائیں میں پہلی بار آپ کی ہم میں شامل ہوا ہوں... اور میں نے نوٹ کیا ہے کہ آپ وہ کچھ بھی دیکھتے ہیں جو ہوتا نہیں... تو سائیں آپ کا شاگرد ہوں، مجھے بھی اس بالکونی کے پار وہ کچھ نظر آ رہا ہے جو پتہ نہیں ہے کہ نہیں... ہم بارش زدہ کبھی ویرانوں اور صحراؤں کے باسی ہونے کے ناطے سے بادلوں اور برفوں کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔"

"برمانی میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں..... کسی بھی مقام پہنچ کر ہم وہی کچھ دیکھتے ہیں جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ وہاں ہے یا نہیں اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ہم خود غرض لوگ ہوتے ہیں... ساری آبشاریں، فیری میڈو، جھیلیں، جھرنے اور بلندیاں ہمارے اندر ہوتے ہیں... ہم گھر سے نکل کر اگر بے گھر ہوتے ہیں تو محض ان کے ثبوت تلاش کرنے کے لیے..."

"ننگت کبیر کے درویش بھی یہی کہتے ہیں اور میرا بابائے تنجن بھی یہی سرگوشی کرتے ہیں کہ جو کچھ ہے وہ تمہارے اندر ہے..."

"یہ جگت کبیر اور میرا بائی خپلو میں کہاں سے آ گئے برمانی..."

"یہ تو ہمیشہ سے یہاں ہیں سائیں... مرشد آپ نے خود ہی تو ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ

ایک زوار کر دیہ جان جاتا ہے... اس کو اس بات کا عرفان ہو جاتا ہے کہ اس کا سچ ہی آخری سچ نہیں ہے... اس کا عقیدہ اور سچ ہی واحد سچائی نہیں... اور بھی سچ ہیں... تو جگت کبیر اور میرا بائی بھی سچ ہیں اور خپلو میں ہیں..." برمانی اپنی سیاہ آنکھوں کے ساتھ ہنسنے لگا اور اس کی ہنسی میں ایک ہتھیار رکھوا لینے والی معصومیت تھی...

ایک اور معصومیت حسن کے چہرے پر تھی...

اگرچہ ہمارے وحشی، بے مہار جذبے تبھی تسکین پاتے تھے جب ہم راستوں اور آبادیوں کو چھوڑ کر پہاڑوں کے اندر اپنے قدموں پر سفر کرتے تھے لیکن... وہاں تک پہنچنے میں جو منزلیں آتی تھیں... بشام، گلگت اور آج خپلو ان میں بسر کی ہوئی شامیں بھی ایک انتخاب تھیں... ایسی شامیں بھی نصیب والوں کے نصیب میں ہوتی ہیں۔ خپلو کی رات میں کمرے کی بالکونی کے پار... ایک چپ تاریک بہاؤ میں گم شیوک کے پار... اگر برمانی کو برف پوش بلندیوں کے گرد بادل نظر آ رہے تھے تو یہ اس کا استحقاق تھا کہ...... مجھے بھی دکھنا تھا جو وہاں نہ تھا...

اور میں... وہاں وہ کچھ بھی نہیں دیکھ پا رہا تھا جو... وہاں تھا...

ہاں یہ ہوا کہ دریائے شیوک کے بہاؤ کی آواز رات گزرنے سے بلند ہوتی گئی...

ہمارے کمرے پر دستک دینے لگی...

کہ اب تو سو جاؤ...

ہم شیوک کو کیسے انکار کرتے...

ہم سو گئے۔

"وہ ڈاکخانہ جہاں سے میرے لیے ایک خط پوسٹ ہوا تھا"

سلمان نے چپلو کے بازار سے دوشے جانے کے لیے ایک جیپ ہائر کر لی تھی۔۔

لیکن دوشے تک کے لیے نہیں۔۔ کاندے کے گاؤں تک۔۔ اس لیے کہ اس سے آگے کاندے نالے کا پُل سیلاب سے بہہ چکا تھا۔۔ دوشے تک براہ راست جیپ نہیں جا سکتی تھی۔۔ اور شنید تھی کہ اس نالے کے اوپر مقامی لوگوں نے چند شہتیر رکھ دیے ہیں جنہیں پار کرنے پر دوسرے کنارے پر دوشے کے لیے جیپیں میسر ہو سکتی تھیں۔۔

ہم آج تھگسی مسجد کی زیارت کر چکے تھے۔۔

اس بلتستان کی سب سے قدیم تقریباً چھ سو برس پرانی چٹانوں پر ایک گھونسلے کی مانند بنا جہاں مسجد میں گیان دھیان کے لیے ایک ایسی کوٹھڑی تھی جس میں کئی برس تو شتر بان نے دنیا کو ترک کر دینے کی آرزو کی تھی۔۔ محض رومانوی ہو کر۔۔ ہم دنیادار لوگوں کی آرزوئیں بھی کھوٹ ہوتا ہے۔

ہمیں کاندے سے جانے والی جیپ سے دو بجے ہوٹل کے صحن میں پہنچنا تھا۔۔ ابھی کچھ وقت تھا۔۔

اتنا وقت تھا کہ میں اوپر چپلو کے بازار میں چند لمحے گزار سکتا۔۔

دنیا کی طرح چپلو کا بازار بھی بدل چکا تھا۔۔

میرے ذہن میں جو تصویر تھی اس میں ایک بلند کوہستانی بستی کی ڈھلوان پر چند کچی پکی دکانیں تھیں اور ان پر بادل اترے ہوئے تھے۔۔ وہاں کے باسی ایک اجنبی کو دیکھ کر ٹھہر جاتے تھے۔۔ ہوا بے حد سرد تھی۔۔ چونکہ اوپر بازار تک کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی اس لیے بہت کم لوگ اوپر

جاتے۔ کبھی کوئی جیپ نیچے شیوک کے کناروں سے اوپر آ جاتی۔۔۔ البتہ ایک بڑا نالہ جو شیوک میں گرتا تھا، رات کے وقت جب تیز ہو جاتا تو اس کے پانی سڑک پر آتی تندی سے بہتے کہ ریسٹ ہاؤس اور اوپر چپلو کے بازار کے درمیان رابطہ منقطع ہو جاتا۔۔

چپلو کا وہ بازار پرانے قصے کہانیوں میں گمشدہ ایک خواب سا بازار تھا۔۔ اور یہ بازار جس میں میں آ نکلا تھا اسے میں قطعی طور پر نہیں پہچانتا تھا۔ کوئی ایک دکان کوئی ایک عمارت ایسی نہ تھی جو شناسا لگتی ہو۔۔ یہاں تک کہ جو بھی منظر میرے ذہن میں تھا وہ اس سے الگ ہی کوئی منظر تھا۔۔ دکانوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ جیپیں دندناتی پھرتی تھیں۔۔ بے شمار لوگ تھے۔۔ یہاں تک کہ ٹریفک پولیس بھی تھی۔۔

مجھے صرف اپنے ڈاکخانے کی فکر تھی۔۔

ہر ڈاکخانہ میں نے بہت دنوں سے اپنے اندر کھول رکھا تھا۔۔ جوانی میں انسان اداسی اور رومان کی ایک غیر حقیقی فضا میں تنہا ہونا چاہتا ہے۔ یونہی اپنے آپ پر ترس کھانے کے لیے کہ کوئی مجھ سے پیار نہیں کرتا۔ سب لوگ میرے خلاف ہیں اور گزر جاتا ہے۔۔ عمر ڈھلتی ہے تو وہ بہت سے احساسات اور رشتوں سے الگ ہوتا جاتا ہے۔۔ بیزار اور چڑچڑا ہو جاتا ہے اور یوں تنہا ہونا چاہتا ہے۔ اس دوسری قسم کی تنہائی کے لیے ایک دور افتادہ ڈاکخانہ بے حد کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ آپ سب سے کٹ کر اس میں ایک پرانے بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں اور پوسٹ کارڈوں اور لفافوں پر مہریں لگنے لگتے ہیں۔۔ ان پوسٹ کارڈوں اور لفافوں میں آپ کی حسرتوں اور محبتوں کی تحریریں ہوتی ہیں۔۔

اس لیے مجھے اپنے ڈاکخانے کی بہت فکر تھی۔

میں نے اس ڈاکخانے کو چپلو سے پہلی ملاقات کے دوران دریافت کیا تھا۔ شیوک سے بلند وادی کی ڈھلوان پر بازار کی جو چند کچی دکانیں تھیں وہاں ایک کچی چھت کی بوسیدہ شہتیروں والی ایک کوٹھڑی تھی جس کے باہر دو ایسی باتھ سے لکھا ہوا ایک بورڈ جھولتا تھا جس پر "ڈاکخانہ چپلو" کی عبارت تھی۔ اس کی چوکھٹ کے اندر جاتے ہوئے ذرا جھکنا پڑتا تھا اور اندر نیم تاریک سردی میں ایک دو ٹانگوں والا بنچ تھا ایک چھوٹا سا کاؤنٹر تھا۔۔ ایک ماٹھر دو آتی جھکے کے عقب میں ایک تختی بندھا نہایت دھیرج اور اطمینان سے چند پوسٹ کارڈوں پر مہریں لگا رہا تھا۔۔ وہ ایک پوسٹ کارڈ پر مہر لگاتا اور پھر اسے بہت غور سے دیکھ کر اطمینان کر لیتا کہ مہر پر

تاریخ اور ڈاکخانہ چھاپ کے الفاظ واضح ہیں یا نہیں.. اگر اس کی تسلی نہ ہوتی تو وہ ایک اور مہر نہایت احتیاط سے اس پر ثبت کرتا..

اس پوسٹ ماسٹر کے چہرے پر جو اطمینان تھا.. وہ ایک ایسے شخص کا تھا جو زندگی سے بے حد مطمئن ہو..

شاید وہ یہیں پیدا ہوا تھا.. یہیں رہتا تھا.. آج تک اس چوکھٹ سے باہر نہیں گیا۔ ایسا لگتا تھا..

"دن میں کتنے خط آتے ہیں؟"

"صاحب کبھی کبھار دو تین بھی آ جاتے ہیں.. ایک دو تو ہر روز ہی آ جاتے ہیں۔"

"آپ ٹکٹیں بھی فروخت کرتے ہیں؟"

"ہاں صاحب.. لفافے، پوسٹ کارڈ اور رجسٹری کے لفافے بھی.. ڈاکخانہ ہے.."

"کوئی ڈاکیہ بھی ہے؟"

"ہاں ناں... میں خود ہی ڈاکیہ ہوں.. یہاں سے فارغ ہو کر ڈاک بانٹتا ہوں لیکن جانے سے پہلے ڈاکخانے کو تالا ضرور لگاتا ہوں.. لوگ ہنستے ہیں کہ ایسا کیوں کرتے ہو بلتستان میں تو چوری چکاری کا رواج نہیں.. اس لیے تالے بھی کم فروخت ہوتے ہیں تو میں کہتا ہوں ہم نہیں سمجھ سکتے یہ گورنمنٹ کا مال ہے اس کی حفاظت ضروری ہے۔"

اس کچی کوٹھڑی سے باہر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا.. اس لیے بھی مسجد کی بلندیوں سے اترنے والے بادل بازار میں سفید ہونے لگے اور ان کی ہلکی دھند ڈاکخانے میں دھیرے دھیرے داخل ہونے لگی.. کچے فرش پر پھیلنے لگی اور پوسٹ کارڈوں اور لفافوں پر درج پتوں کو گیلا کرنے لگی..

وہ ڈاکخانہ میرے اندر رہ گیا.. اسی حالت میں.. کچے فرش اور اس پر چھلکتی دھند اور تنہائی اور سکون کے ساتھ.. میرے اندر منتقل ہو گیا اور لگتے کتنے دن تک میں اس کچی ڈیوڑھی کی جگہ بیٹھ کر مہریں لگاتا رہا.. اس لیے مجھے اپنے اس ڈاکخانے کی فکر تھی..

"ادھر ڈاکخانہ کدھر ہے؟" میں نے ایک خوانچے والے کو روک کر پوچھا.

"ادھر اوپر ہے۔"

"لیکن وہ تو یہاں تھا.. اس بازار میں.."

"وہ تو پرانا ڈاکخانہ ہوا کرتا تھا صاحب.. اب تو ترقی ہو گیا ہے سیاحوں کی وجہ سے.. اس کی جگہ نیا مارکیٹ بن گیا ہے.. اور ورکشاپ بن گیا ہے.. اوپر نیا ڈاکخانہ بنا ہے.. بالکل شہروں کے موافق... اس میں پی ٹی او بھی لگا ہے.. بے شک امریکہ فون کرو.. آپ نے کہیں فون کرنا ہے؟"

"نہیں۔"

"ڈاک کا لفافہ وغیرہ بھی ادھر جاتا ہے لیکن اب خط کون لکھتا ہے صاحب.. یا فون کر لیتا ہے یا ادھر سامنے کمپیوٹر پر بات کر لیتا ہے.. ترقی ہو گیا ہے۔"

ہر شخص کی زندگی میں سکردو کے پرانے ڈاکخانے کے ماحول ایسا کوئی ایک گوشہ ہونا چاہیے جس میں وہ الگ ہو کر پوسٹ کارڈوں اور لفافوں پر مہریں لگا سکے.. ایک مہر میرے بدن پر یوں ثبت ہوئی جیسے گھوڑے کی پشت پر سرخ جلتے ہوئے لوہے کے ساتھ ملکیت کا نشان لگاتے ہیں اور گوشت کے جلنے کی بو آتی ہے....

"باقی رہ گئے چھ... واپسی"

ہمیں راوی کے پار جانا پڑتا..

جب سے پرانے تعمیر کردہ پل مخدوش قرار دیا جا چکا تھا اور اس پر سے صرف تانگے اور پیدل گزر سکتے تھے..

اس پل کے پار تخت لاہور تھا..

ہم اس تخت لاہور سے بیس کیمپ تک جانے کے لیے نکلے تھے اور کہاں آ گئے؟

کہاں پہ کہاں سے ہو گئے..

شہر کا شور چبھ رہا تھا..

ہم جب وہاں پہنچے تھے.. یقین نہ کر سکتے تھے کہ صرف دو ہفتے پیشتر اس شہر پرشور کے باسی تھے اور یہیں سے نکلے تھے..

ایسے اذیت ناک شور میں ہم کیسے رہتے تھے.. اور اب کیسے رہیں گے۔

ہم تخت لاہور سے نکل کر پہاڑوں کے تخت کی جانب گئے تھے اور ان کے چرنوں میں بیٹھے تھے کیونکہ بیس کیمپ پہاڑوں کے چرن ہی تو ہوتے ہیں.. ہم نے ان کو مرشد مانا تھا، ان کی مریدی اختیار کی تھی.. ان کی بیعت کی تھی..

تو کیا ہمیں نروان ہوا.. کوئی انعام ملا..

نہیں نروان کبھی نہیں ملتا.. یہ تو ایک مسلسل عمل ہے.. ہر برس پہاڑوں تک جانا پڑتا ہے.. قدموں میں بیٹھنا پڑتا ہے.. ہر برس نئی بیعت ہوتی ہے.. بدھ!! آپ نصیب والے تھے کہ ایک بار برگد کے سائے میں ٹک کر بیٹھ رہے، تپسیا کی اور نروان پا گئے..

اور ہم تو پچھلے بیس برس سے لگاتار جانے کتنے برگدوں کے سائے میں بیٹھے تھے.. گیان دھیان میں گم رہے لیکن کچھ بھی نہ ملا.. کے ٹو.. ایک سرائے.. نانگا پربت اور سنو لیک ایسے عظیم برگدوں تلے دھونی رمائی.. ایسے برگد جن کی شاخیں برف کی تھیں جن کے تنوں میں جھیلیں مرا ہوتی تھیں اور جن کی شاخوں میں مردہ ہوائیں شکتی تھیں اور موت زندگی کی پہریدار تھی.. کچھ بھی نہ ملا..

راوی روڈ کی ایک ورکشاپ کے قریب میاں صاحب اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے "مجھے یہاں اتار دیں.. میرے ایک عزیز کی ورکشاپ ہے.. یہاں سے میں اپنے بیٹے کو فون کروں گا وہ مجھے لینے آ جائے گا.. پتہ نہیں بیگم کی طبیعت کیسی ہے.. شوگر لیول کا کیا حال ہے۔"

میاں صاحب اپنا رک سیک گھسیٹتے.. گلگت کی شاپنگ کا چینی ٹیلی ویژن اٹھائے.. کچھ کیتلیاں اور برتن سنبھالتے اتر گئے..

باقی رہ گئے چھ!

لاہور کی گھٹن زدہ ٹریفک میں ایک ویگن پہاڑوں سے واپس آئی ہے اور اس میں ابھی تک موسم ٹھہرے ہوئے ہیں.. اور چھ کے چھ ذرا پاگل ہو چکے ہیں.. گرمی ناقابل برداشت ہے..

"مچلو میں دل مچلو مچلو.. چھیڑ خوبانیوں سے چلی جائے اسد.."

ہم بہ تاکی بوسٹے دراس..

نہیں..

ہم بہ قاکی بوش دراس... دوشے کو جاتے تھے..

خپلو سے.. جہاد کے ٹرج محل ہوٹل سے ایک کھٹارا جیپ میں بمشکل سوار... بلکہ میں اور حسن تو بآسانی سوار کہ ہم دونوں اگلی نشست پر براجمان تھے اور بقیہ ممبران پچھلے حصے میں کوہ نوردی کے سامان اور رک سیکوں میں پھنسے ہوئے.. بیک وقت بمشکل سوار... دوشے کو جاتے تھے..

دریائے شیوک کے کنارے کنارے..

اس کے دوال پانیوں کی خاموشی دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ یہ ازل سے یونہی بہتے آئے ہیں.. اور یونہی بہتے چلے جائیں گے..

وادیٔ خپلو کے دامن میں بہتا اس دریا میں ایک عجب لاپروا شاہانہ بہاؤ ہے..

یہ اس ندیا کی مانند ہے جس سے مخاطب ہو کر کہا جاتا ہے کہ.. میرے سیاں جی اتریں گے پار ندیا دھیرے بہو.. یہ دھیرے بہتا ہے.. آپ اس کی بہاؤ کو دور سے دیکھئے تو یہ آپ کو اپنے ساتھ بہا کر نہیں لے جاتا بلکہ آپ کے ہونے کے مطابق اپنا بہاؤ دھیما یا تیز کر لیتا ہے..

شیوک سندھ کی مانند نہ تو آپ کو ڈراتا ہے اور نہ ہی ایک قدیم تہذیب کے دھارے کے طور پر تکبر ہوتا ہے.. بس بہتا چلا جاتا ہے..

مجھے راستہ یاد آ رہا تھا.. کیونکہ میں خپلو سے دوشے جا چکا تھا.. اس لیے مجھے راستہ یاد آ رہا تھا کہ اب اس مختصر آبی جزیرے اور جھاڑیوں کے دوسری جانب شیوک کے پار جانے والے

مسافروں کے لیے ایک ایسی کشتی ہوگی جو ہزاروں برس پیشتر ایجاد ہوئی تھی.. زندہ کی کھال کو.. ایک مشکیزے کی طرح.. اس میں تو پانی بھرتے ہیں لیکن اس میں اپنے پھیپھڑوں پر زور لگا کر ہوا بھر کر پھلا کر.. متعدد کھالوں میں ہوا بھر کر ان کھالوں کو باندھ کر ایک کشتی تیار کی جاتی ہے جس کے ڈوبنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا.. جسے "اندس رافٹ" کہا جاتا ہے.. ایک ایسی کشتی ہوگی..

پچھلی بار میں نے اس کے ملاح سے باتیں کی تھیں جو مسافروں کا انتظار کرتا تھا.. لیکن جب ہم اس مختصر آبی جزیرے اور جھاڑیوں کے دوسری جانب گئے تو وہاں جہاں میں نے دس برس پیشتر اندس رافٹ کو تیرتے دیکھا تھا وہاں کچھ بھی نہ تھا.. کیا اب لوگ شیوک کے پار نہیں جاتے؟

"حسین.." میں جیپ ڈرائیور سے مخاطب ہوا جو ایک ہانی جو کرتا تھا... وہ چپ رہا..

"حسین.." میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ذرا بلند آواز سے کہا..

"صاحب.. میں حسین نہیں ہوں یوسف ہوں.. حسین میرا بھائی ہے اور وہ پیچھے بیٹھا ہے.."

"سوری.. ہمیں سب بلتی ایک جیسے لگتے ہیں.. تو یوسف یہاں ہمیشہ مشکیزوں والی ایک کشتی ہوا کرتی تھی شیوک کے پار جانے کے لیے.."

"ہاں صاحب ہمارے بچپن میں ہوتی تھی.. پھر ترقی ہو گیا.. سیاچن کا ٹریفک شروع ہو گیا تو اب ادھر پار جانے کے لیے پل بن گیا ہے تو اس کا ضرورت نہیں ہے.."

"تو وہ ملاح اب کیا کرتے ہیں جو مشکیزوں کی کشتیاں کھے کر روزی کماتے تھے، ہزاروں برسوں سے کماتے تھے.."

"کیا پتہ صاحب.. ادھر بازار میں مزدوری کرتا ہوگا.. یا مر کھپ گیا ہوگا.."

وادیٔ خپلو کی مشکیزوں کی اس کشتی کا تذکرہ قدیم ترین سفرناموں میں بھی ملتا ہے.. یہ ہزاروں برسوں تک جب سے شیوک تھا تب سے یہ اس کے پانیوں پر رواج کرتی چلی آتی تھی.. لداخ سے آنے والے بدھ بھکشو بھی اس پر سوار ہو کر پار اترتے ہوں گے.. شاید ہمایوں نے بھی اس پر سفر کیا ہوگا.. پار اترے ہوں گے.. یہاں تک کہ میں نے بھی دس برس پیشتر ان کے ملاح سے گفتگو کی تھی اور اب وہ کشتی وہاں نہیں تھی.. ایک قصۂ پارینہ ہو گئی تھی کیونکہ.. ترقی ہو گئی تھی.. سیاچن کی جنگ کی وجہ سے..

اور تقریباً وہیں جہاں اس "اندس رافٹ" کا گھاٹ ہوا کرتا تھا وہاں پر ایک شاندار پل تعمیر ہو چکا تھا اور ہم اس کے پار چلے گئے۔

پار تو چلے گئے لیکن ایک زاکان اور ایک مشکیزوں والی کشتی پیچھے رہ گئی۔۔

شیوک کے پار ہوئے، سالنگ کے گاؤں میں سے گزرے تو ہمیں کاندے کے نالے کا جو پل سیلاب میں بہہ گیا تھا، اس کی چنتا شروع ہو گئی۔ کیا ہم نالے پر ایستادہ چند شہتیروں کے پل پر سے گزر جائیں گے، اگر گزر جائیں گے اور پار جائیں گے تو کیا وہاں سے ہمیں ہوشے کے لیے جیپ مل جائے گی۔۔

اس لیے مشابرم کی برف پوشی نے ایک جھلک دکھا دی اور ہم اس کے دیدار میں گم ہو گئے کہ ہم نے اس چوٹی کے بیس کیمپ تک جانا تھا۔ اور پھر فوراً ہی خیال آیا کہ نہیں جانا۔۔ ہم نے تو سکردو میں اپنا پروگرام تبدیل کر دیا تھا اور اب ہم گنڈوگورو کی چوٹی پر بقول شاہد پاکستان اور اسلام کو سربلند کرنے کے لیے اسے فتح کرنے کو جا رہے تھے۔۔

سالنگ کے بعد ایک ویرانہ آیا۔۔ کچھ چڑھائی آئی اور پھر کھپلو نظر آنے لگا۔۔

کھپلو ایک عجیب وادی تھی۔۔ پچھلے پہر کی دھوپ میں اُٹھتی۔۔ جرمنی کے عظیم گوتھک فن تعمیر کے کلیساؤں کی مانند۔ زرد دھوپ میں اُٹھتی چٹانوں کے دامن میں۔۔ شیوک سے بلندی پر ایک ہرا بھرا، گندم سے بھرا ایک عجیب گاؤں تھا۔ جس کی خانقاہ کا تحتی مینار اور اس پر اٹکا ایک ستارہ دنیا کی بلند ترین چٹانوں کے پس منظر کے ساتھ ڈھلتی دھوپ کی زرد نگاہوں میں آیا ہوا ایک ایسی خوابناک تصویر تھا جو عہدِ موجود میں نہ تھی۔ بہت اور لداخ کے گئے زمانوں میں تھی۔۔

اسے زیادہ دیر تک دیکھنا ممکن نہ تھا۔۔

یہ خانقاہ بھی ترقی کا شکار ہو چکی تھی۔۔ اسی مقام پر ایک سینکڑوں برس پرانی خانقاہ کی عمارت تھی جسے ڈھا کر موجودہ خانقاہ کو نئی بنیادوں سے اٹھایا گیا لیکن کرم یہ کیا گیا کہ اس کا طرزِ تعمیر جوں کا توں رکھا گیا۔۔ اس کے باوجود مجھے اس کا نیا پن کھلتا تھا۔۔

"یوسف۔۔"

"میں حسین ہوں سر۔۔ یوسف پیچھے چلا گیا ہے آرام کرنے کے لیے۔۔"

"تو حسین۔ تم ظاہر ہے تمام بلتیوں کی مانند شیعہ ہو۔۔"

"نہیں جناب۔" اس نے احتجاج کیا۔ "میں نوربخشی ہوں۔"

"کچھ فرق ہوتا ہے؟"

"بہت فرق ہوتا ہے سر۔۔"

"مثلاً۔۔"

"مثلاً یہ کہ سر ہم سفر میں بھی روزے رکھتے ہیں۔۔ نمازیں ملا ملا کر نہیں پڑھتے، الگ الگ پڑھتے ہیں۔ اور ہم عبادت بہت کرتے ہیں۔۔ درویش لوگ ہوتے ہیں سر۔"

"تو کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ آپ لوگ کھپلو کی خانقاہ کو جوں کا توں رہنے دیتے۔ ایک تاریخی یادگار کے طور پر اور نئی خانقاہ کسی اور مقام پر تعمیر کر لیتے۔۔"

"نہیں صاحب۔۔ ہم اللہ کے لوگ۔۔ ملا لوگ کہتا ہے کہ خانقاہ کا مقام نہیں بدل سکتا۔۔"

کھپلو کے بارے میں میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اسے دیکھ کر دل مچل مچل جاتا ہے، اس لیے اس وادی کو کھپلو کہا جاتا ہے۔۔ کیونکہ مچلنے کے عمل میں ایک شور ہے۔ ایک اتھل پتھل ہے جب کہ اس وادی کو دیکھ کر انسان شانت ہو جاتا ہے۔۔

ایک پہاڑوں کے زینے سے اُترتا تہہ در تہہ گاؤں، سنہری کھیت۔ خوبانیوں کے باغ، خوبصورت لوگ، بھولے لوگ۔ نہایت قدیم تختی باب جیسے وہ بڑی شکر میں بھی ملتے ہیں اور اسکولے میں بھی۔۔ کچھ جھکی ہوئی دیوانی روحیں۔۔ خوبرو لڑکیاں جن کے رخسار خوبانیوں سے سجے ہوئے تھے اور جن کی آنکھوں میں نیلے شیوک بہتے تھے۔۔ گڑیوں ایسے کھلونے بچے۔۔

ایک میری عمر کے بابا جی اپنی کمر پر گندم کا تقریباً آدھا کھیت اٹھائے۔۔ جھکے ہوئے مگر پھر بھی ہمیں دیکھ کر مسکرانے سے باز نہ آئے۔۔ مشقت میں جتے ہونے کے باوجود ایک مسکراہٹ اور ایک سلام عطا کر کے گزر گئے۔۔ خوش باش اور اپنے حال میں مست سادہ اور پیارے پیارے لوگ۔۔ شمال میں کئی وادیاں ایسی ہیں جن کے باشندوں کے چہروں پر جو خوشی اور مسرت مسلسل چھلکتی ہے، ہم تہذیب یافتہ روحوں کو اس کی سمجھ نہیں آتی۔۔ ایک انسان کے پاس نہ ٹیلی ویژن ہے۔۔ نہ فریج یا فلیٹ میں گھر ہے۔ گھر میں ایئر کنڈیشن کتا نہیں ہے تو وہ انسان کیسے خوش رہ سکتا ہے۔۔ کمر پر گندم کا آدھا کھیت اٹھائے پھرتا ہے۔۔ رات کے کھانے میں شاید اسے چند خوبانیاں اور ایک روٹی ملے۔۔ ایک بھی مرد کو گھڑی میں ملے۔ پھر بھی وہ خوش ہو تو یقیناً ذرا فاتر العقل ہو گا۔۔ مجھے وادی کیلاش کے کافروں کی بے پناہ خوشی بھی سمجھ میں نہ آتی تھی۔۔

اور مجھے وادی کھپلو کے مسلمانوں کی بے پایاں مسرت بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔۔ یہ وہ ٹیلی ویژن اور ایئر کنڈیشن کے مالکوں کے چہروں پر بھی ایسی خوشی نہ ہوتی تھی۔ ایک منظم اور تجبش شدہ خوشی ہوتی تھی۔۔

چلاؤ کے ساتھ یہ بے مدد زیادتی تھی کہ ہم اس میں سے سرسری گزرتے جاتے تھے اور ایک نسبتاً خشک اور بے روح گاؤں ہوشے کی جانب صرف اس لیے جا رہے تھے کہ وہ مشابرم کے دامن میں تھا.. کنکورڈو کے راستے میں تھا..

بس یہی وہ کھیل ہے جسے نصیب کہا جاتا ہے..

ایک دو بڑے لوگوں کے ماتھوں پر بھاگ نہیں ہوتے اور کرموں والیاں چناب میں ڈوب جاتی ہیں اور جو بکل والی نہیں ہوتیں وہ پار اتر جاتی ہیں.. یہی وہ کھیل ہے جسے نصیب کہا جاتا ہے۔

اگر آپ نانگا پربت کے زیریں چہرے کے راستے میں تو شنگ کا گاؤں ہیں.. فیئری میڈو کے چہرے کے آغاز میں تاتو ایسی خشک اور واہیات بستی ہیں تو ہر کوئی آپ کو جانتا ہے۔ کے ٹو کی پہلی منزل ہیں تو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ مشابرم کے سامنے بن ہیں تو فرق رہ جاتے ہیں.. راکاپوشی کے راستے میں مناپن ہیں تو آپ کی دھوم ہے..

لیکن اگر آپ پر کسی بلند اور مشہور چوٹی کا سایہ نہیں تو بے شک آپ چلاؤ ہی کیوں نہ ہوں، تلسی اکیری یا چھپا ہی ہوں تو آپ کو کوئی نہیں پوچھتا.. لوگ آپ میں سے سرسری گزر جاتے ہیں۔

ہم بھی اگرچہ سرسری گزرنے کے لیے گزرنے کو تھے لیکن ہمیں مجبوراً چلاؤ میں رکنا پڑا کیونکہ مخالف سمت سے آنے والی ایک جیپ کی کچی پنیں چلاؤ میں سے گزرنے والی کچی جیپ روڈ کے درمیان میں آ کر جواب دے گئیں اور وہ جیپ ہمارے سامنے ایک بے بس مردہ حالت میں کھڑی تھی اور ہمارا راستہ روکے ہوئے کھڑی تھی.. چنانچہ ہمیں بھی مجبوراً رکنا پڑا..

یہ ہمارا ڈرائیور حسین تھا.. یا شاید اس کا بھائی یوسف تھا جو حیدر کے بازار میں جیپوں کا شہرۂ آفاق مکینک تھا.. فوری طور پر اپنی جیپ سے اترا اور خراب شدہ جیپ کے نیچے سرک کر اس کے پیٹ کا تفصیلی معائنہ کرنے لگا..

ہم کیا کرتے.. جیپ سے اتر کر ادھر ادھر بکھر گئے..

چلاؤ کے کھیتوں میں کام کرتے کسان.. چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں اور خواتین ہمارے ارد گرد ہو گئے اور ہمیں اپنی مسکراہٹوں اور مسرتوں سے جگمگانے لگے.. یہ سب کے سب.. جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں یونہی بے وجہ خوش تھے.. چہرے گلنار کیے خوش تھے.. میں نے

ایک نہایت غیر جانب دار تجزیہ نگار کی حیثیت سے درجنوں چہروں کا بغور مطالعہ کیا اور ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس کا منہ لٹکا ہوا ہو... ہماری طرح اس کی بتی بجھی ہوئی ہو...

ایک دوشیزہ کمر پر شہتوت کی ٹہنیوں سے بنی ہوئی خرمانی کی ٹوکری بوجھ کئے.. جھکی ہوئی کہ ٹوکری تروتازہ پکی خوبانیوں سے لبریز تھی، حیرت بھری اور بچوں کی معصومیت ایسی کھلی کھلی آنکھوں کے ساتھ ہماری جیپ کے قریب ٹھہری تو حسین صاحب خواہ مخواہ شرمانے لگے..

"حسین صاحب میں کچھ خوبانیاں خرید لوں.. یہ لوگ ناراض تو نہیں کریں گے؟"

"یہ لوگ تو ناراض نہیں کریں گے کہ ہماری طرح بنیاد پرست نہیں ہیں اور ان کے ہاں بھی ہماری طرح کوئی کھوٹ نہیں ہے لیکن آپ کی بیگم ناراض ہو جائیں.."

"نہیں جی... میں تو صرف خوبانیاں خریدنا چاہتا ہوں۔"

"پلیز گواہ بنیں... بلکہ میں آپ کی تصویر اتار دیتا ہوں تاکہ سند رہے اور بیگم کو بدگمان کیا جا سکے.."

اب صورت حال کچھ یوں ہوئی کہ حسن صاحب شرماتے ہوئے اس دوشیزہ کی جانب بڑھے.. ادھر دوشیزہ نے بھی جواباً شرمانا شروع کر دیا، مبصرین کا خیال ہے کہ اس شرماہٹ کے مقابلے میں حسن صاحب کہیں آگے نکل گئے تھے..

"حسن صاحب.." میں کیمرے کے لینز میں دیکھتا دیکھتا تھک چکا تھا۔ "خدا کے لیے اب خوبانیاں خرید بھی لیجیے.."

حسن صاحب نے اشاروں میں اس دوشیزہ کو بتایا اور ایک دو خوبانیاں اٹھا کر اسے سمجھایا کہ میں یہ.. خریدنا چاہتا ہوں۔

دوشیزہ کی آنکھوں کی چڑیاں حیرت اور جھولیں سے بڑی ہو گئیں.. وہ ایک اتنی معصوم روح تھی.. آلودگی اور بری نظروں سے یکسر ناواقف کہ وہ ارتی.. اپنے رخسار مزید سرخ کرتی.. مسکراتی ہوئی کبھی سر کو جھکاتی کبھی حسن صاحب کو دیکھتی، ایک ناسمجھی کی کیفیت میں کھڑی رہی.. حسن نے اس کی جھکی کمر پر دھری ٹوکری میں سے خوبانیوں کی مٹھیاں بھر بھر کر اپنی پی کیپ کو بھرا اور پھر دس روپے کا ایک نوٹ قیمت کے طور پر اس کی جانب بڑھا دیا۔

وہ دوشیزہ اس نوٹ کو دیکھ کر ایسے خوفزدہ ہوئی جیسے وہ ایک زہریلا بچھو ہو جو اسے ڈس لے گا اور سہم کر پیچھے ہو گئی..

دور یاد رہے کہ گجاؤ کے بہت سے الگ... ہماری جیپ کے ارد گرد کھڑے ہوئے الگ... بچے... بوڑھے اور جوان اور خواتین اس خوبانی تماشے کو دیکھ رہے تھے اور خوب انجوائے کر رہے تھے...

دوشیزہ سہم کر پیچھے ہو رہی تھی...

ہم سب نے مشترکہ طور پر ایک بابا جی سے درخواست کی... یہ بابا جی گندم کا ایک گٹھا اٹھائے اُدھر آ رہے تھے اور اب ایک پیڑ تلے ستا رہے تھے... کہ بزرگو اس بچی سے کہو کہ خوبانیوں کی قیمت وصول کر لے...

بابا جی بھی ہاتھ نچاتے اور سر ہلاتے ہوئے نہیں نہیں... کہنے لگے... اور ان کی مسکراہٹ میں کوئی کمی نہ آئی۔

"یوسف..."

"جی میں حسین ہوں... یوسف تو خراب شدہ جیپ کے پیچھے ہے۔"

"تو حسین پلیز اس لڑکی سے کہو کہ ہم ان خوبانیوں کی قیمت ادا کرنا چاہتے ہیں۔"

"اُدھر رواج نہیں ہے سر... آپ مہمان ہیں۔"

"نہیں یوسف... میرا مطلب ہے حسین... پلیز سفارش کرو۔"

حسین نے اس دوشیزہ اور مقامی لوگوں سے طویل مذاکرات کیے اور تب جا کر نہایت جھجکتے ہوئے دوشیزہ نے دس روپے کا نوٹ قبول کیا... اور یوں قبول کیا کہ اس کی مسکراہٹ رکی تھی اور ان کے بخشیری معصومیت والے سپید چہرے پر خوبانوں جیسی اور شہتوت کی سرخی لپک جاتی تھی... جیسے خوبانیوں سے پٹی جاتی ہو... شنید تھی کہ نیچے میدانوں سے لوگ آتے ہیں اور ایسے چیری چہروں اور خوبانی رخساروں کو بیاہ کر لے جاتے ہیں... میرے بیٹے بھی اگر شادی بیاہ کے معاملے میں میرے بس میں ہوتے تو میں انہیں یہیں لے کر آتا...

ہماری جیپ کے پیچھے ایک اور جیپ آ رکی...

اس جیپ کی پچھلی نشست پر دو نہایت بے مروت صاف ستھرے پنڈی کے نوجوان براجمان تھے... سیاہ چشموں میں... نیلی جینوں اور شوخ ٹی شرٹوں اور مہنگے جوگرز میں... انہوں نے ہم دیہی کوہ نوردوں سے ماورا ہم ہو جانے کو اپنے لیے منصب نہ جانا... اور وہ یقیناً اپنے سیاہ چشموں کے عقب سے ہم پر ایک چشم حقارت ڈالتے تھے... وہ اپنی جیپ سے باہر آ کے آپس میں

انگریزی میں تبادلۂ خیال کرتے ہوئے اور ہمارے ڈرائیور سے نہایت رعب سے پوچھا کہ... اوئے تم نے ہمارا راستہ کیوں روک رکھا ہے... جیپ آگے کیوں نہیں لے جاتے... یوسف جو ابھی ابھی خراب شدہ جیپ کے نیچے سے بے حد خراب شدہ حالت میں برآمد ہوا تھا ان کی اونچی ہواؤں میں قیام کرنے کو بالکل خاطر میں نہ لایا اور نہایت بدتمیزی سے کہنے لگا "سامنے کا جیپ کا کچ پلیٹ فری ہو گیا ہے... جب تک وہ نہیں چلے گا تو ہم کیسے چلے گا... آپ کو جلدی ہے تو اپنا جیپ آگے لے جاؤ..."

پنڈی کا خوش لباس ستھرے نوجوان نے اپنی جیپ کے ڈرائیور کو حکم دیا کہ آگے لے جاؤ...

ان کے ڈرائیور نے جواب دل جانے کیا کہا اور مقامی زبان میں کہا کہ... دونوں نوجوان ٹھنڈے ہو گئے...

یہ دونوں اپنے تئیں فیشن ماڈل نوجوان ہنزہ کے باشندے تھے اور گائیڈ تھے... اور دیگر وادیوں... جیسے... دیامیر... ڈولی یا استان کے باشندوں کو اسی چشم حقارت سے دیکھتے تھے جو انہوں نے ہمارے لیے وقف کر رکھی تھی...

ان میں سے ایک نوجوان خاصا چھیلا اور نسوانی تھا... اگر امریکہ میں ہوتا تو کسی "گے" تحریک کا بڑی کشش کا حامل ایک نمائندہ ہوتا... وہ بولتا تو ایک آدھ فقرہ انگریزی بولتا۔

بالآخر خراب شدہ جیپ جس کے سٹارٹ ہونے کے امکان معدوم ہو گئے تھے اسے دھکیل کر ایک کھیت میں اتار دیا گیا... راستہ صاف ہو گیا... ہم نکلے اور گجاؤ سے نکلے...

سفر پھر شروع ہو گیا...

"وادیٔ تلس جو مچلو کی چھوٹی بہن تھی"

"مچلو... بہت ہرا بھرا اور زرخیز ہے۔" میں نے حسین سے یا یوسف سے کہا۔
"ہاں صاحب... ادھر پانی بہت ہے ناں... اور تلس اس سے زیادہ خوبصورت وادی ہے لیکن ادھر پانی کم ہے... فصل کم ہے... گندم کم ہے۔"
تلس آیا تو وہ بھی مچلو کی ایک مچلتی ہوئی بہن تھی۔
ویسے ہی سوہنے اور خوش و خرم باشندے... وہی معصومیت اور وہی مسکراہٹ آمیز موسم...
گھروں کی کچی دیواروں پر دھرے گملے تھے... گھی کے خالی ٹین تھے جن میں بنفشی پھول کھلے تھے اور بالکونیوں میں مٹی ڈال کر وہاں پیلے پھولوں کی کیاریاں بہار دیتی تھیں...
بلتستان میں پھول ایک کمزوری ہیں... باتیں کرتے جیسے بھوک لگی ہے، پیاس محسوس ہوتی ہے، ایسے پھولوں کی بھی طلب ہوتی ہے۔ انہیں یاتی لوگوں کو... اگر کسی خطرناک ڈھلوان کے دامن میں کوئی ایک خوش رنگ پھول نظر آ جائے تو وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس تک پہنچتے ہیں اور اسے اپنی ٹوپی میں سجا لیتے ہیں۔ غریب ترین کچے گھروں میں بھی ایک آدھ ٹوٹا ہوا ڈبہ جس پر پھول لگتے ہیں... صرف ادھر بلتستان میں ہی نہیں پورے پاکستانی شمال میں یہ دیوانگی ہے... زوبل میں... جھیل کرومبر کے کناروں پر... بروکت کے قصبے میں... چترال اور اسکولے میں... ہر جگہ گاؤں میں رنگ بکھرے بادِ بہار چلتی ہے... ہمارے کراچی، لاہور یا اسلام آباد کے گھروں میں... نہایت سجے اور شاندار گھروں میں بھی آرٹیفشل فلاورز کے گلدان ہوں گے لیکن تازہ پھول صرف اسی صورت میں سجائے جاتے ہیں جب کوئی مہمان ان کو لے کر آ جائے...
یہ شاید تہذیب کا فرق ہے...

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر نقل بہ مطابق اصل ہے... اور نقل بہت برس چلتی ہے نہ مرجھاتی ہے اور نہ اس کی شکل میں فرق پڑتا ہے تو پھر اصل کا اپنے گلدانوں میں سجانے سے فائدہ... جو ایک دو روز میں مرجھا جاتی ہے اور اس کی مہک تمام ہو جاتی ہے... ہم لوگ گھاٹے کا سودا کرنے والوں میں سے نہیں ہیں...
میں نے کچھ گھروں میں ہر قسم کے نقلی پھولوں پر ان کی اصل کے مطابق جو قدرتی خوشبو مہک ہوتی ہے اس کا چھڑکاؤ ہوتا دیکھا ہے...
بس یہی... تہذیب کا فرق ہوتا ہے...
تلس کے بعد... جہاں پانی کم تھا اور بقول حسین یہ وادی مچلو سے بھی زیادہ پرکشش تھی، چڑھائی شروع ہو گئی... دریا کے پُرآب ہوتے دریا کا کنارا تھا، ہوش ربا بلند چٹانوں کی ایک مسلسل دیوار تھی جو ان کی قربت میں تھی... ان چٹانوں میں پوشیدہ وادیوں اور برفانی تودوں میں سے اترنے والے نالے تھے جو دریا میں شامل ہو رہے تھے...
یکدم یہ لینڈ سکیپ آشنا ہو گئی، اپنی ہو گئی... یہ کبھی دیکھی ہوئی ہوگی...
اس برس پہلے قلب علی کی عنایت کردہ جیپ میں ہوشے کو جاتے ہوئے... اپنے خاندان کے ہمراہ سفر کرتے ہوئے میں اسی لینڈ سکیپ میں سے گزرا تھا... ادھر ایک ڈھلوان کی گھاس پر بیٹھ کر میرے تصویر اتروائی تھی... سلجوق نے ایک پھول دریافت کیا تھا... سمیر نے ایک مینڈک پکڑا تھا...
ویسے میرا سفر ابھی شروع نہیں ہوا تھا...
میں ہوشے تک جا چکا تھا... جب اس کے آگے ایک قدم اٹھے گا تب میرا سفر شروع ہوگا...
سورج ڈھل رہا تھا... دریا پار کی چٹانیں اپنے رنگ بدل رہی تھیں...
ہوا میں بلندیوں کی خنکی اور ان جھاڑیوں کی مہک تھی جو ایک خاص بلندی کے بعد جنم لیتی ہیں...

"کاندے گاؤں.. جسے سیلاب بہا لے گیا. ٹوٹا ہوا پل..."

اور پھر یکلخت کاندے آ گیا..

ایک مختصر سا گاؤں.. چند گھر. ایک ہوٹل کا سائن بورڈ اور جیپ کھڑی ہو گئی..

آگے پتھروں کی دنیا کا ایک انبار تھا اور اس میں کہیں وہ نالہ ہو رہا بہتا تھا جس پر کوئی شہتیر تھا. شاید وہ شہتیر تھے جو پل تھے.. جن پر سے گزر کر پار جاتے تھے.. لیکن یہاں سے جہاں ہماری جیپ رکی تھی نہ کسی دریا کی آواز آتی تھی اور نہ کوئی شہتیر نما پل دکھائی دیتا تھا..

جیپ کھڑی ہوئی تو اس کاندے ہمارے گرد ہجوم ہو گئے.. اتنے زیادہ ہو گئے کہ میرے ساتھی ان میں گم ہو گئے.. نہ کوئی بند دروازہ اور نہ کوئی بند دروازہ.. کاندے کی آبادی.. وہ جتنی بھی تھی ہم پر یلغار کر رہی تھی.. ہمیں ملاحظہ کر رہی تھی اور قدرے حیران ہو رہی تھی کہ یہ بھلا لوگ ادھر کیسے آ گیا ہے.. اور فوراً گورا لوگ آ رہا تھا.. کئی لوگ تقریباً بیک آواز ہو کر ہمیں طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے سوال کر رہے تھے.. دو ایک مانگ رہے تھے یا پورٹر کے طور پر ساتھ چلنے کا کہہ رہے تھے.. رات گزارنے کے لیے وہ عمدہ ہوٹلوں کی موجودگی کی اطلاع بھی فراہم کر رہی تھی..

ڈینڈی بفر ہو ادران ہم سے پہلے پہنچ چکے تھے اور پتھروں کے انبار کے آگے جا کر نالے اور پل کو جائزہ لے کر واپس آ رہے تھے..

انہوں نے مجھ سے کچھ کلام نہ کیا لیکن میں نے آگے بڑھ کر ان سے کلام کیا۔ "یہ فرمائیے کہ آگے نالے پر جو پل ہے اس پر سے گزرا جا سکتا ہے؟"

چکیلی کمر والے گوبیٹ نے ذرا مڑ کر پلک کر نہایت غیر ملکی لہجے میں انگریزی میں جواب دیا۔ "پل تو نہیں ہے۔ دو شہتیر رکھے ہوئے ہیں نالے کے اوپر اور وہ اس کو چھاڑ سے گیلے اور

پھسلن والے ہو گئے ہیں.. نیچے نہ دیکھئے کہ کیا گزر رہا ہے اور نہ پھسلئے تو آپ بھی پار جا سکتے ہیں. لیکن ڈر گئے ہیں ہم ارز صاحب.. تو پھر بھی گر جاتے ہیں.. نیچے پانی بہت تیز ہے۔"

اس نے "تارڑ صاحب" کہا تو میں چونکا۔ "آپ مجھے جانتے ہیں؟"

"جی.."

"لیکن آپ نے پہلے تو ہمیں لفٹ نہیں کروائی.. بہرحال آپ تجربہ کار ہیں۔ آپ کا کیا مشورہ ہے؟"

"مشکل تو نہیں.. لیکن پھسلتے ہیں تو بہ جاتے ہیں.. ویسے نالے کے پار وہ تین جیپیں کھڑی ہیں ڈوشے جانے کے لیے.."

اس دوران اقبال آ گیا..

وہ ذرا دیر سے آیا تھا کیونکہ اقبال تھا.. ایک سکول ٹیچر تھا..

"تارڑ صاحب آپ نے آگے جا کر کیا کرنا ہے.. یہاں رات کریں.. کل میں آپ کو دریا کے پار ہوشے اور تنگ ماشی وادیوں میں لے کر چلتا ہوں.. وہ جو نالہ دریا میں گرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اوپر.. وہ ون کا سفر ہے اور اس سفر کے دوران آپ کے اوپر چڑھتے ہوں گی وہ اتنی قریب ہوں گی کہ ان میں بیٹی ہوئی دکھائی دیں گی۔ پھر ایک پڑاؤ آئے گی جو گوندوگورو اور مشابروم کے بیس کیمپ سے ہزار گنا زیادہ خوبصورت ہے۔ پڑاؤ کے اوپر ایک چوٹی ہے جہاں سے کے ٹو اور مشابروم دکھائی دیتی ہیں اور میں نے بقلم خود اس چوٹی کو اپنے نام پر "اقبال ٹاپ" کا نام دیا ہے.. چلیں گے؟"

"نہیں.. میں نے اس سے پیشتر مشابروم ترک کر کے گوندوگورو کا ارادہ کیا ہے اب میرے پروگرام میں مزید تبدیلی نہیں ہو سکتی.."

"تو پھر میرا یہ کارڈ رکھ لیجیے اگر کبھی موڈ بنے تو میں آپ کو لے کر جاؤں گا۔"

کارڈ پر لکھا تھا "اقبال تو دری۔ ماؤنٹین گائیڈ اور باورچی.. وائس چیئرمین یونین کونسل خپلو... گاؤں کاندے۔ ڈاکخانہ تھاگس۔ تحصیل مشابروم۔ ضلع گانچھے۔ سکردو، بلتستان، پاکستان.."

"اور صاحب آپ نے اگر ہوشے سے گوندوگورو جانا ہے تو آپ کو پورٹر درکار ہوں گے، وہ کہاں سے لیں گے؟"

"ہوشے سے.."

"دوشے میں تو گندم اور جو کی کٹائی ہو رہی ہے۔ لوگ گھاس جمع کر رہے ہیں وہاں سے تو آپ کو ایک پورٹر بھی نہیں ملے گا... یہاں کاندے سے لے کر جائیں۔ ویسے بھی دوشے والے اچھے لوگ نہیں تنگ کرتے ہیں... ہم اچھے لوگ ہیں بالکل تنگ نہیں کرے گا۔"

اقبال نے اتنا کہا اور ہمارے گرد جو ہجوم تھا وہ اقبال کے اسی اتنا کہنے کا منتظر تھا کہ پورٹر یہاں کاندے سے لے کر جائیں... جوانوں، بچوں، بوڑھوں نے مجھے زبردستی اپنے شناختی کارڈوں کی نمائش کا بیان شروع کر دیے... ان شناختی کارڈ کی کاپی ایک ثبوت ہے کہ یہ شخص جینوئن ہے اور مقامی ہے...

"مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن یہاں سے پورٹر لے جاؤں تو کہیں دوشے والے فساد نہ کر دیں کہ کاندے سے پورٹر کیوں لائے ہو... یہاں سے کیوں نہیں لیے۔"

شمال میں یہ تماشا بھی اکثر ہوتا رہتا ہے...

ناتجربہ کار کوہ پیما... کنکورڈیا جانے کے لیے سکردو سے پورٹر لے لیتے ہیں تو راستے میں شگر والے دنگا کرتے ہیں کہ پورٹر ہمارے ہوں گے... شگر سے پورٹر لیں تو اسکولے میں ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے...

"نہیں صاحب میں گارنٹی دیتا ہوں کہ دوشے والے اعتراض نہیں کریں گے۔"

"تو پھر میں یہاں سے چار پورٹر لیتا ہوں... اگر دوشے میں پرابلم ہوا تو واپس کر دیں گے۔"

"پرابلم نہیں ہوگا... یہ میرا چاچا ہے اسے ضرور لے کر جاؤ... بہت اچھا چاچا ہے۔"

یہ چاچا بے دانت کا بوڑھا چاچا تھا... میں ساتھ لے گیا...

کاندے گاؤں میں ایک سو بیس گھرانے ہیں اور آبادی صرف آٹھ سو بیس افراد پر مشتمل ہے... 1997ء اور پھر 2000ء میں ایک تباہ کن سیلاب نے تقریباً پورے گاؤں کو برباد کر دیا۔ نالے کا پل بہہ گیا اور لوگوں نے یہاں سے دور کیندا اس تھنگ میں ایک بستی آباد کر لی... وہ بستی جہاں پانی نہیں ہے... پانی حاصل کرنے کے لیے گاؤں کی خواتین ایک گھنٹہ سفر کر کے پیچھے دریا تک پہنچتی ہیں جس کا پانی بے حد گدلا ہے اور مختلف بیماریوں کا باعث بنتا ہے... [illegible] ان لوگوں کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھے لیکن اب وہ نئے گھر بنانے اور پانی کے حصول میں اتنے مصروف ہو گئے ہیں کہ سیاحوں کے ہمراہ پہاڑوں میں نہیں جا سکتے اور اسی لیے مقروض ہو چکے ہیں... یہ

معاونت ایک اور سکول ٹیچر نذاکت حسین بخوبی فراہم کر رہے ہیں...

ہم نے اقبال کی معرفت اپنا سامان پل کے پار لے جانے کا ٹھیکہ تین سو روپے میں کیا...

یہاں سے جہاں ہم نے حسین و یوسف کی جیپ چھوڑی تھی یہاں سے کاندے کا نالہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آگے پتھروں کی ایک دنیا تھی۔ اور اس کے اندر سے ایک آبی شور ابھر رہا تھا اور ہم آہستہ آہستہ چلتے اس کے قریب ہو رہے تھے... سامان پار لے جانے والے پورٹر اچھل اچھل کر پتھروں کو پھلانگتے ہمارے آس پاس ہرنوں کی طرح اچھلتے جا رہے تھے...

اوپر کہیں بلند پہاڑوں سے کاندے کے سیلاب کے دوران جو ہزاروں بڑے بڑے پتھر آئے تھے ہم ان میں راستہ بناتے نالے کے قریب ہو گئے...

اور اس نالے پر وہ پل تھا...

اور کیا پل تھا...

دو شہتیروں والا ایک پگڈنڈی پل۔ اور دونوں شہتیر پانی کی بوچھاڑ سے اتنے بھیگ چکے تھے کہ ان پر پاؤں کا ٹھہرنا محال لگتا تھا۔ اور شہتیروں کے نیچے جو نالہ تھا بلکہ یہ نالہ تھا اس میں بھی پتھر لڑھکتے تھے اور اس میں جو گر گیا وہ گیا... نیچے دریائے شیوک میں یا دریائے دوشے میں اور پتھروں کے پاٹوں میں پستا گیا۔ گیا ہی گیا...

میں نے فوری طور پر بہادری اور جرأت کے جو چند ذرے مجھ میں تھے انہیں سات سلام کیے اور بنا سہارے اس پر قدم رکھنے سے انکار کر دیا...

ایک نوجوان پورٹر جو ان دو شہتیروں پر سرکس کے بازی گروں کی طرح کرتب دکھا رہا تھا وہ آیا اور ہاتھ آگے کر دیا...

اس کے سہارے کے باوجود یہ ایک ٹانگوں کے غوطے میں کھلبلی مچا دینے والی کراسنگ تھی... اگلا قدم اٹھانے کے لیے شہتیروں کو دیکھتے تھے تو نظر ان کے نیچے باؤلے کتے کے منہ سے نکلنے والی جھاگ پر جمی جاتی تھی جو کاندے نالے کے پانی تھے... سامنے دیکھتے تو پھسلنے کا خدشہ ہوتا تھا۔

اس "پل" کے پار ہو کر پھر پتھروں کی ایک دنیا تھی جس میں راہ بناتے ہم آگے ہوئے تو آگے درختوں کے ایک جھنڈ میں چند خیمیں گڑی تھیں...

"مولا جٹ کی جیپ میں.. کنیداس کا چٹانی گاؤں"

ایک ریٹائرڈ حوالدار کی نہایت ہی ریٹائرڈ جیپ تھی جو ہمیں دوشے تک لے جا رہی تھی.. جیپ میں ہمارا سامان اور کاندے کے دو پورٹرز جنہیں ہم نے ہائر کیا تھا، لدے ہوئے تھے تو نادر میرے پاس آیا۔ "تارڑ صاحب.. دونوں ہنزہ گائیڈ.. درخواست کر رہے ہیں کہ ہمیں اپنی جیپ میں دوشے تک لے جائیں۔ ان میں سے ایک اکرام بیگ کا کزن ہے.."

یہ کیسا حسین اتفاق تھا کہ دونوں نوجوان اب تک منہ چڑھے اور متکبر رہے تھے.. ہم سے بات کرنا بھی مناسب نہ سمجھتے تھے اور اب اکرام بیگ کے عزیز ہوئے جاتے تھے.. ویسے تو آدھا ہنزہ بیگ کا کزن ہے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اپنی ذاتی جیپ کاندے میں چھوڑنے کے بعد یہاں سے دوشے تک ایک جیپ ہائر کر کے اپنی جیب ہلکی نہیں کرنا چاہتے تھے اور ایک فری رائیڈ کے متمنی تھے..

شمال کی جیپ کی ایک باکمال خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک چھوٹے موٹے گاؤں کا کل سامان اور بیشتر باشندے آسانی سے سما جاتے ہیں۔ اگر ڈرائیور کی مرضی ہو تو..

"دے آر ویلکم.."

کاندے سے دوشے تک ایک گھنٹے کی مسافت بتائی جاتی تھی..

جیپ سٹارٹ ہوئی تو میں پرسکون ہو گیا.. مجھے شدید خدشہ تھا کہ شاید ہمیں کاندے میں ہی رکنا پڑے.. لیکن اب ہم دوشے کو جاتے تھے اس لیے میں پرسکون ہو گیا..

حوالدار ادھر کا نہیں، نیچے سیلنگ کا رہنے والا تھا.. ادھر ایک خیمے میں فروکش تھا.. کاندے اور دوشے کے درمیان اپنی شخصیت کے زور پر جیپ چلاتا تھا ورنہ اس کی جیپ میں اتنا دم خم نہ تھا

کہ اپنے زور پر چلتی۔ فی پھیرا بارہ سو روپے چارج کرتا تھا.. اتنے پھیرے لگاتا تھا کہ اس کی روزانہ آمدنی کا حساب اگر ڈالروں میں بھی لگایا جائے تو بھی قابل رشک تھی.. البتہ جیپ کے پچھلے حصوں میں سے احتجاج کی دبی دبی آوازیں آ رہی تھیں.. اس لیے کہ وہاں متعدد پورٹروں کے علاوہ وہ ہنزہ گائیڈ بھی بچ بچا کر جگہ حاصل ہونے کی کوشش کر رہے تھے.. ہمارے سامان کے علاوہ وہاں پانچ کنستر ایسے تھے جن کی موجودگی بہت جگہ گھیرے میرے ساتھیوں کی ٹانگوں کا اچیرن کر رہی تھی کہ وہ ان میں پھنسے ہوئے تھے..

"حوالدار صاحب.. ان کنستروں کو تو اتار دیجیے.. میرے ساتھی نہ بیٹھ سکتے ہیں نہ کھڑے ہو سکتے ہیں.."

"صاحب انہیں ہو کر تو بڑا گزارا کرا.. آگے کنیداس کے علاقے میں کاندے کے سیلاب میں تباہ ہونے والے لوگ گھر بنائے بیٹھے ہیں اور ادھر پانی نہیں ہے.. میں یہاں سے ہر پھیرے میں ان کے لیے پانی کے کنستر لے جاتا ہوں. تھوڑا تکلیف ہو گا لیکن ان کے پاس پینے کو بھی پانی نہیں ہوتا۔"

یہ علاقے امداد باہمی کی بے مثال مثال ہیں۔

ایک جیپ ڈرائیور اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اگر چند کاسیز دور لوگ پیاسے بیٹھے ہیں تو وہ ان کے لیے پانی لے کر جائے.. اس طرح راستے میں کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ جیپ دیکھ کر روڈ پر آتے اور حوالدار کی جانب پلاسٹک کی بوتلیں اچھالتے جو وہ ایک ہاتھ سے کیچ کرتا جاتا..

"صاحب یہ کاندے کے لوگ ہیں.. گھروں سے دور کھیتوں میں کٹائی کرتے ہیں تو مجھے اپنا بوتل دیتے ہیں۔ میں ادھر آگے جا کر ان کے گھروں میں سے چائے ڈلواتا ہوں اور واپسی پر اسی طرح ان کی بوتلیں کھیتوں میں پھینک دیتا ہوں.."

درخت اور جھاڑیاں کم ہو گئیں.. راستہ بے حد گرد آلود ہو گیا.. یہاں ایک مدت سے بارش نہیں ہوئی تھی..

پھر بائیں جانب بڑی بڑی چٹانوں کے ایک نہایت ہی خشک اور صحرائی سلسلے میں کچھ پتھریلے گھر نظر آئے.. وہ نئے تھے کہ جن پتھروں سے وہ تعمیر ہوئے تھے ان پر تیشے کی تازگی کی سفیدی تھی.. کچھ تو چٹانوں کی کوکھ میں سے جنم لے رہے تھے اور باقی ویرانے میں بکھرے ہوئے تھے، انہی چٹانوں کو توڑ توڑ کر ان کے پتھروں سے یہ آبادیاں تعمیر کی گئی تھیں۔ چنانچہ کی جا میں

ایسی تھیں جو کچی بھی اور بدن برید تھیں.. ایک نیا سکول بھی اس ویرانے میں نمایاں تھا.. یہی کیونکہ اس خشک تھا جو ایک دشت تھا جہاں پانی کی ایک بوند نہ تھی.. نہ کوئی چشمہ تھا اور نہ کوئی ندی نالہ.... دشتے دریا پنے ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع تھا اور اس کے پانی بھی پینے کے لائق نہ تھے..

"ان لوگوں نے اس ویرانے میں گھر کیوں بنائے.. راستے میں کئی ہرے بھرے میدان تھے جہاں پانی تھا.."

"صاحب ادھر دشت کا زمین کم ہے.. اگر کھیتوں میں گھر بنا لیتے تو زمین کم ہو جاتا.. کھائے کہاں سے.."

حوالدار نے کنید ان کے گاؤں کے قریب جیپ روکی.. پچھلے حصے میں پڑے پانی کے کنستر اٹھا کر روڈ کے کنارے رکھے اور پھر جیپ سٹارٹ کر دی..

ان گھروں میں سے چند افراد نکلے... کچھ بچے روڈ کی جانب بھاگنے لگے.. ایک بوڑھی عورت جو بھترو زدہ تھی اپنی سنگ پاشی کو ترک کر کے تھوڑی جھجک کر چادر سنبھالتی ادھر کو آنے لگی..

ہماری جیپ بہت آگے نکل چکی تھی جب میں نے عقبی آئینے میں دیکھا کہ وہ لوگ... بچے اور وہ بوڑھی عورت خوش خوش کنستر اٹھاتے ہیں اور اپنے پیاسے گاؤں کو لے جاتے ہیں.. اور ہاں اس لیے میں نے کاندے کے بے گھر لوگوں کی اس نئی بنائی بستی میں بلند ہوتی اس چٹان کو نہ دیکھا جو نئے گھروں میں سے نکل کر ان سادہ لوگوں سے ہم کلام ہوتی تھی.. آسمان کے رخساروں پر بوسہ دینے کے لیے بلند ہوتی تھی اور جس پر ایک سرخ جوڑے میں ملبوس لڑکی ایک جل پری کی مانند ٹانگیں تیتے بیٹھا جان تھی.. جو میرے ذہن پر.. میری یادداشت پر ایک مہر کی طرح.. ایک سادہ دھات پر ثبت ہو جانے والی مہر کی طرح ہوا سے تمام دھات سے ہٹ کر کہ اسے بدل کر ایک سکہ بنا دیتی ہے... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوام بخش دیتی ہے۔ ہوری آنکھوں کا سلسلہ بے شک خاک در خاک ہو جائے لیکن وہ مہر قائم رہتی ہے.. لیکن میں نے نہ اس چٹان کو دیکھا اور نہ اس جل پری کو... کہ میں نے یہ منظر اپنی واپسی پر اسی حوالدار کی جیپ کی کھڑکی میں سے دیکھا تھا.

شاید ابھی وہ چٹان یہاں موجود نہ تھی.. اس کا ظہور نہ ہوا تھا.. جتنی مدت میں نے دشتے سے آگے کہیں بلند پہاڑوں میں بسر کی اس دوران یہ چٹان زمین میں سے ایک بوٹے کی مانند پھوٹی.. ابھری تھی.. اور اپنی زیبائش کے لیے ایک سرخ لباس والی لڑکی کو اپنی چوٹی پر

بٹھایا تا کہ واپسی پر میں اسے دیکھوں اور زندگی بھر بھول نہ پاؤں.. اس کا نقش ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جائے..

"حوالدار صاحب.. ادھر دشتے کے راستے میں ہمارے دوست چنگیزی کی جیپ ایک حادثے کا شکار ہوئی تھی.. کسی گہری کھڈ میں گر گئی تھی.. چنگیزی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور اس کے ہمراہ جو جاپانی کوہ نورد تھی وہ ہلاک ہو گئی تھی تو آپ جانتے ہو کہ ان کی جیپ کہاں گری تھی.."

"یہ کس برس کی بات کرتے ہو صاحب؟"

"تقریباً تین برس پہلے کی.."

"تب تو میں ادھر نہیں تھا.."

"کدھر تھا؟"

"آپ کے پنجاب میں تعینات تھا.. اور.. میں تو آدھا پنجابی ہو چکا ہوں.. کی حال اے سوہنیو.. خواں آیاں ایں سوہنیاں!"

اگر یہ بلتی حوالدار "مصطفیٰ قریشی" کے "مولا جٹ" کے ڈائیلاگ اتنے شستہ لہجے میں بول سکتا تھا تو پنجابی میں اس کی قادر الکلامی میں کوئی شک نہ تھا.. مجھے کچھ خفت سی ہوئی کیونکہ دوران سفر میں نے اس کے تن و توش کے بارے میں اپنے ساتھیوں کو محظوظ کرنے کی خاطر پنجابی میں کچھ فقرے کہے تھے.. جو ظاہر ہے اس تک پہنچے تھے لیکن وہ چپ رہا تھا..

"بڑا چنگا حال اے سوہنیو.." میں نے ہنس کر شرمندگی میں ہنس کر جواب دیا۔

"آپ ادھر پہلی بار آئے ہو؟"

"نہیں.. میں دس برس پیشتر اپنے ننھے بچوں کے ہمراہ ایک ڈے ٹرپ پر ہوشے آیا تھا"

"تو دشتے تب کیسا تھا؟"

"چند ایک گھر تھے.. کچے کوٹھڑی نما گھر تھے.. ہزاروں برس سے جو کوہستانی تنہائی اور آزردگی بھی اس میں گم شدہ چند گھر تھے.. مستر خواتین کے چہرے دھوئیں سے سیاہ ہو چکے تھے.. ان کی مینڈھیاں جو شاید بچپن میں گوندی گئی تھیں، پھر کبھی نہیں کھلی تھیں.. اور جو بھاری اونی لبادے انہوں نے پہنے ہوئے تھے وہ بھی برسوں سے پہنے ہوئے تھے، بچوں کے سر استرے سے اس طور مونڈے گئے تھے کہ درمیان میں صرف سانحوں کی مانند ایک لٹ لٹکتی تھی جو شاید ان زمانوں کا فیشن تھا.. بوڑھے اپنی سفید داڑھیوں میں ایک پتھری کے گرد اسے تھمائے ہوئے

اون لپیٹے تھے.. ایک ہوٹل اور ایک مشابارم شاپ تھی.. اور ہوشے والے انہیں دیکھ کر سراسیمہ ہو گئے تھے اور "انگریز۔ انگریز" کہتے گھروں میں گھس گئے تھے اور میری بیگم نے بے حد برا مناتے ہوئے ان کا پیچھا کر کے انہیں جا پکڑا تھا اور کہا تھا.. ہم موئے انگریز نہیں ہیں.. پاکستانی ہیں اور مسلمان ہیں.. لا الہ.. اور خبردار جو تم گندے ناگنٹ پھر سے اپنے آپ کو پونچھنے والے انگریز کہا.. تو پھر وہ سب دوست ہو گئے اور ہمارے قریب آ گئے.. یہ ہوشے تھا۔

"اب وہ ہوشے نہیں رہا۔" حوالدار نے منہ میں رکھی نسوار کی گولی کو ابھاری کسی شے کی جگالی کرتے ہوئے کہا۔ "اب تو کے ٹو کی جانب سے دنیا جہان کا ٹورسٹ ہوشے میں اترتا ہے لیکن صاحب.. ہوشے والا اب بھی نہاتا نہیں.. پانی کو اپنا دشمن سمجھتا ہے، گندا رہتا ہے۔"

"ویسے تو ہماری ایک محسن بیگم صاحبہ لانڈل شاہ بھی یہی کہتی ہیں کہ ہوشے کے لوگ پورے شمال میں سب سے گندے ہیں لیکن.. حوالدار صاحب آپ یہ بھی تو دیکھیے کہ وہ ہزاروں برس اس بلند تنہائی میں دنیا جہان سے کٹے رہے.. سال بھر میں صرف ایک فصل ہوتی ہے اور اگر سردی شروع ہو جائے تو وہ بھی پکتی نہیں.. پھلدار درخت بھی پنپتے نہیں۔ گندم، جو، شلجم اور مٹر کے چند دانے اور بس.. انہوں نے شدید برفباری اور بھوک کی آفتیں جھیلیں.. ان کے پاس تو موسم سرما گزارنے کے لیے کافی لکڑی بھی نہیں تھی اور اس کے باوجود انہوں نے اپنی دھرتی کو نہیں چھوڑا.. اگر گندے رہتے ہیں تو اپنے گھر میں رہتے ہیں۔"

حوالدار دل کھول کر اور جبڑا کھول کر ہنسا اور اپنا پیالہ جو سٹیئرنگ پر ڈال کر جیپ کو دائیں جانب موڑ دیا۔ "آپ تو ہوشے والوں کے طرف دار ہو گئے ہو۔"

"میں ان لوگوں کا طرف دار ہوں جو بھوک اور افلاس سہتے ہیں اور اپنے گھر نہیں چھوڑتے۔"

حوالدار میری اس گفتگو سے بور ہو گیا اور درمیان میں بیٹھے حسن سے مخاطب ہو گیا۔

"آپ ادھر لاہور میں کیا کرتے ہو؟"

"بس جی.." حسن صاحب حسب معمول ذرا شرما گئے۔ "میں ایک بینک افسر ہوں.. چھوٹا سا۔"

"کتنا بال بچہ ہے؟"

"دو بچے ہیں ماشاءاللہ.."

"اوئے سوہنیو.." حوالدار پھر سے ہنسنے لگا۔ "صرف دو.. میرے پانچ بچے ہیں اور ابھی

مزید آرہا ہے.. تو پانچ تو بہت کم ہے اور پیدا کرو۔"

"وہ تو جی حوالدار صاحب۔" حسن صاحب کو تو اللہ شرمانے کا موقع دے اور یہ کیا موقع تھا "وہ... بیگم نہیں مانتی۔"

"اچھا۔" حوالدار نے خشمگیں نظروں سے حسن کو دیکھا۔ "تو آپ بیگم کو پوچھ کر بچہ پیدا کرتا ہے.. ہم تو نہیں پوچھتا۔"

"اور کیا حال ہے حوالدار جی.." میں نے فوری طور پر موضوع کی پٹڑی بدلنے کی کوشش کی۔ "ہوشے کتنی دور ہے؟"

"زیادہ دور نہیں سوہنیو.."

شام.. رات کی دہلیز پر کھڑی پل دو پل کی مہمان تھی.. ابھی ہیڈلائٹس جلانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جب ہم ذرا نیچے ہوئے.. چٹانوں کی اوٹ میں چلے گئے اور نیچے ایک گہرائی میں ایک پل تھا..

اور پھر مجھے بھی یاد آ گیا.. یادداشت کی سکرین پر ایک فلم چل گئی.. ہوشے کے نیچے ایک پل تھا جسے پار کر کے ایک زبردست چڑھائی آتی تھی اور پھر ہوشے آ جاتا تھا..

"اس پل کے اوپر ہوشے ہے صاحب.. یہاں تک کاندے والوں کا زمین ہے اور اس پل کے پار ہوشے والوں کا علاقہ ہے۔" اس نے پل کے دوسری جانب جا کر سپیشل گیئر لگایا اور جیپ زبردست احتجاج کرتی.. ہونکتی رکی پھر سے دھچکے کھاتی چڑھائی پر چڑھنے لگی..

اور اوپر جب جیپ کی ناک سیدھی ہوئی.. ہم جو چڑھائی کی وجہ سے پیچھے گرے تھے ہموار ہوئے تو ہوشے آ گیا..

”ہوشے کی گلیوں میں اُندلس کے اجنبی“

شام کے بعد.. رات کی قربت میں ہم ہوشے میں داخل ہوئے..

یہ تو اب باقاعدہ ایک گاؤں تھا..

چند گھر نہیں.. گلیاں تھیں اور پکے نیم پختہ گھر تھے.. اور رونق تھی..

ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہوشے میں اب تین خیمہ گاہیں تھیں اور ان میں کوئی حمزہ کیمپنگ یا لیلیٰ پیک کیمپنگ بہترین تھی..

ہم اس کیمپنگ کے پھاٹک کے باہر رکے تو اس کے اندر غیر ملکی سیاحوں کے اتنے خیمے تھے.. کہ وہ اُبل کر ہوشے کی گلیوں میں آ رہے تھے..

اور یہ کیمپنگ سائٹ اگرچہ بہت مختصر تھی لیکن یہ سوئٹزرلینڈ کی جھیل لوگانو کے کنارے پر ایک کیمپنگ سائٹ دکھتی تھی کہ اس کے اندر تمام تر خیمے اور چہرے اجنبی سرزمینوں کے تھے اور میں جب لوگانو کی اس وسیع خیمہ گاہ کے گیٹ میں سے داخل ہو کر اندر گیا تھا تو استقبالیہ کلرک نے میرے پوچھنے سے پہلے بیزاری سے کہہ دیا تھا۔ ”کوئی جگہ نہیں.. سائٹ فل ہے۔“

”میں تنہا ہوں اور میرا خیمہ بھی بہت چھوٹا سا ہے..“

”ایک چھوٹے سے خیمے کے لیے بھی جگہ تو چاہیے.. جو نہیں ہے.. سوری۔“

اور یہاں ہوشے میں بھی بالکل یہی صورت حال تھی.. اور آج صرف میرا چھوٹا سا خیمہ ہی نہیں تھا بلکہ میرے چھ ساتھیوں کے بھی خیمے تھے.. اور جگہ نہیں تھی..

ویسے ہم نے بہت ہی ندیدے پن سے اس کیمپنگ کے اندر جھانکا کیونکہ اندر کا ماحول سراسر مغربی تھا اور خود ہم تین پہاڑوں سے اترنے کے باوجود ابھی تک اپنے لباس کے بارے

میں لاپروا تھیں..

زرا سا ہٹ کر ایک اور پھاٹک تھا.. جہاں کیمپنگ نمبر دو تھی اور یہ اشرف کیمپ تھی اور وہاں گھاس نہ تھی اور کچھ گھٹن گھٹی سی بھی تھی لیکن سوائے ایک چھوٹے سے خیمے کے بالکل خالی تھی..

دیوار کے ساتھ ساتھ جو ایلڈر کے درخت اونچے ہوتے تھے ان کے نیچے سورج مکھی کے چند پھول تھے..

ہوشے کی رات میں ہمارے خیمے سر اٹھانے لگے..

اشرف کی خیمہ گاہ کے کچن میں پکوان پکنے لگے..

خیموں اور خوراک کے بندوبست میں کاندے سے آتے ہوئے پورٹر نہایت پھرتیلے ہو رہے تھے کیونکہ وہ چار کی بجائے شاید چھ سات آ گئے تھے اور اگلی صبح کو جب پورٹروں کا چناؤ ہونا تھا اس میں سے چنے جانے کے لیے پھرتیلے ہو رہے تھے۔ ان میں کچھ ہوشے کے بھی پورٹر تھے جو ہم میں گھل مل گئے تھے.. ان میں ایک حسین نامی شخص بھی تھا جو پورٹر ہونے کے علاوہ ماہر باورچی ہونے کا بھی دعویٰ کرتا تھا اور لاہور کے کچھ ریستورانوں میں کام کرنے کا حوالہ بار بار دیتا تھا.. اور بہت فرمانبردار اور مسکین شکل کا تھا اور ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اس بے چارے کو تو ضرور ساتھ لے کر جائیں گے.. چاہے ہم افورڈ کر سکیں یا نہیں.. اور پھر جب ہم اسے ساتھ لے گئے تو ٹریک کے دوران ایسا ظالم اور طوطا چشم ہوا کہ ہم سب بے چارے اور مسکین ہو گئے..

میں اس بار اپنا چونکہ ننھا خیمہ ساتھ نہیں لایا تھا اور سلمان کے آسٹریلوی خیمے کے ایک گوشے میں حسن صاحب کی رفاقت میں اپنے سلیپنگ بیگ میں نہایت پرسکون استراحت فرما رہا تھا..

بقیہ ساتھی بھی اپنے اپنے خیموں میں کچھ نہ کچھ فرما رہے تھے..

اور باہر ہوشے کی رات تھی.. جو شاید ہم سے اتری رات تھی..

کچھ دیر استراحت فرمانے کے بعد میں اس خیمہ گاہ کے کچے اور کوہستانی ماحول والے ڈائننگ روم میں جا بیٹھا.. گیس کی دودھیا روشنی اور کچھ انجانے چہروں میں جا بیٹھا.. کچی دیواروں پر بطور آرائش کوہ پیماؤں کی تصویریں اور کارڈ چسپاں تھے اور کسی کیلنڈر سے مستعار لیے ہوئے جاپانی دوشیزاؤں کے تقریباً دو تین پوز تھے. تقریباً اس لیے کہ جاپانی اور چینی دوشیزائیں کوشش بسیار کے باوجود اپنی بدنی حالتوں کو برہنگی کے اس مقام پر نہیں لے جا سکتیں جسے مکمل طور پر ہوش ربا کہا

جاسکے... یہ رتبہ بلند صرف امریکی، ہندوستانی اور پاکستانی دوشیزاؤں کو ہی مل سکتا تھا..

یہاں.. اس ہر شے کے بے پگیس کی روشنی میں روز حیات ہوئے ایک ہسپانوی جوڑے سے ملاقات ہوئی جو نہایت صاف ستھرے اور بے حد اہتمام سے ملبوس شدہ تھے... وہ بھی اب تازہ ترین فیشن کے مطابق اشکولے سے کنکورڈیا تک پہنچ کر... وزنگ کنڈ اور گوندوگورو عبور کر کے ہوشے پہنچے تھے.. نہ صرف ان کا لباس ستھرا تھا بلکہ وہ خود بھی متاثر کن حد تک خوش شکل تھے..

عامر انہیں دیکھ کر کہنے لگا۔ "تارڑ صاحب نہ ان کے چہروں پر کے ٹو بیس کیمپ کی ہائٹ کا اثر نظر آتا ہے.. نہ ان کی جلد اکھڑی ہوئی ہے اور نہ ہی ہونٹ اور ناک سوجے ہوئے ہیں.. نہ ہی ایک طویل کوہ پیمائی اور خطرناک سفر کی کچھ تھکاوٹ ہے.. اور ڈریس اپ بھی ایسے ہوئے ہیں جیسے پیرس کی نائٹ کلب "مولین روج" میں ڈنر کرنے کے لیے جا رہے ہوں تو انہیں پوچھئے کہ کیا واقعی یہ کے ٹو بیس کیمپ سے ہو کر ادھر پہنچے ہیں.."

اور یہ حقیقت ہے کہ وہ ہسپانوی جوڑا ایک تر و تازہ کھیرے کی مانند سرسبز اور ستھرا تھا..

سورج مکھی کی مانند کھلا ہوا تھا..

انہوں نے ڈائننگ روم کی بجی چھت پر.. جہاں وہ ایک مخدوش سے زینے کی مدد سے پہنچے تھے... وہاں اپنا خیمہ نصب کر رکھا تھا تاکہ وہ ہوشے کے "منظر" کا نظارہ کر سکیں اور ہم گہرائی میں.. پاتال میں سفیدے کے درختوں تلے خیمہ زن تھے..

میں نے انہیں متاثر کرنے کی خاطر اپنی کتاب "اندلس میں اجنبی" کا ذکر کیا تو وہ ضرورت سے زیادہ متاثر ہو گئے۔

"ہم تو پاکستان کو بھی نہیں جانتے تھے.. صرف کے ٹو کو جانتے تھے اور یہ تو بالکل نہیں جانتے تھے کہ یہاں کوئی ایسا شخص ملے گا جس نے سپین کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہو۔"

انہیں کیا پتہ کہ ہسپانیہ ہم پاکستانیوں کے دلوں پر کہاں کہاں اثر کرتا ہے... بے شک بنیادی طور پر وہ رش سپین اثر کرتا ہے.. ہم ان کے قرطبہ، اشبیلیہ اور غرناطہ کو ان کی نسبت کہیں زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور مرسنگ چوک کو اب قرطبہ چوک کہتے ہیں..

وہ دونوں شاید میڈرڈ کے رہنے والے تھے اور ڈاکٹر تھے.. شادی شدہ نہیں لگتے تھے ورنہ اتنے خوش نہ لگتے.. اگلی صبح ان دونوں نے روانہ ہونے سے پیشتر میرے خیمے میں جھانکا اور اپنا کارڈ بڑھا کر مجھے میڈرڈ آنے کی دعوت دی.. وہ کارڈ وہیں کہیں ہوشے میں ہی رہ گیا..

ان دونوں نے البتہ میرا کارڈ گم نہیں کیا تھا اور ایک برس بعد انہوں نے مجھے اپنے پہلے بچے کی پیدائش کی خوش خبری بھیجی..

ویسے پاکستانی شمال میں اس بار ایک عجیب تبدیلی سامنے آئی.. اس کے پہاڑوں اور گلیشیئرز میں بھٹکنے جتنے کوہ نورد ملے، ان میں سے بیشتر کا تعلق ہسپانیہ سے تھا..

کھانے میں کیا تھا یہ کچھ یاد نہیں لیکن حسین کی تیار کردہ وہ سلاد یاد ہے جو نہایت تازہ اور خوش نظر تھی۔

کھانے کے بعد ہم سب ہوشے کی گلیوں میں نکل گئے..

دیا روں کو ذرا لیے.. اندھیرے میں احتیاط سے قدم رکھتے گلیوں میں نکل گئے.. تاریک رات کے سناٹے میں تنہائی میں ان میں گھومتے رہے..

یہ ایسی گلیاں نہ تھیں جن میں انسان گم ہو جائے.. کہ وہ دو چار ہی تو تھیں.. ہر گلی کے بعد ایک اترائی آتی اور کھیت شروع ہو جاتے.. گندم کے بوٹوں کا سنہری پن تاریکی میں بھی دکھائی دیتا تھا..

لیکن یوں بے مقصد بھٹکنے میں بھی ایک عجب سنسنی تھی..

اس لیے کہ ہم 7821 میٹر بلند مشابرم کی چوٹی کے دامن میں ہوشے میں تھے.. اور اگر اس چوٹی کا حساب کتاب کیا جائے تو یہ دنیا میں چوبیسویں بلند ترین چوٹی تھی.. جو امریکی کوہ پیماؤں نے پہلی بار 1960ء میں اس پر قدم رکھا..

اور ہم نے مشابرم کو آج نہیں.. دس برس پہلے بھی دیکھا تھا۔

یہاں سے نہیں.. اس کے پار.. دوسری جانب.. کنکارڈیا کی جانب چلتے ہوئے جب ہم اردوکس سے نکلے تھے تو دائیں جانب برفوں کی ایک دنیا میں سے اٹھتی ہوئی اس دانت نما چوٹی کو دیکھا تھا.. اور یہ حیرت ناک حد تک سوئٹزرلینڈ کی ماؤنٹ میٹرہارن سے مشابہ تھی۔ اگرچہ اس سے بلندی میں تقریباً دو گنی تھی اور اس کے گرد بادلوں کا ایک سفید گھیرا تھا.. ہم اس کے برابر میں چلتے تھے اور اس کی شکل اور بلندی سے مرعوب چلتے تھے.. اس کے دامن میں ہوئیٹ نامی گلیشیئر تھا اس کے زور میں چلتے تھے..

ایک برفانی عجائب گھر میں چلتے اسے دیکھتے جاتے تھے.. اور تب نہیں جانتے تھے کہ اس چوٹی کے اندر ایک درہ گوندوگورو نام کا ہے جسے عبور کر کے ہوشے پہنچا جا سکتا ہے.. کوئی بھی

نہیں.. یہاں تک کہ ہوشے والے بھی نہیں جانتے تھے اور وہ اسے ناقابلِ ذکر سمجھتے تھے..

یہ دریافت ہوا تو ہوشے کی قسمت بدل گئی..

اس کی قسمت بدل گئی لیکن نہ نہانے کی عادت نہیں بدلی..

اُس رات ہم اشرف خیمہ گاہ میں لوٹے.. باہر ایک دکان کے کچے تھڑے پر چند نوجوان گا رہے تھے.. باتیں کر رہے تھے..

"کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"نوجوانی میں کیسی باتیں کرتے ہیں.. ہم لڑکیوں کی باتیں کرتے ہیں۔"

ہم تھکاوٹ سے.. بلندی کے خمار میں یوں چور ہوئے کہ خیموں میں جاتے ہی بے سُدھ نیند میں اتر گئے..

کل سویرے ہم نے گندو گورو کی جانب سفر کرنا تھا..

گندو گورو... جو بقول میاں صاحب نہایت ہی خوش نام تھا۔

"تختِ لاہور کی گلیاں اور باقی رہ گئے... پانچ"

یہ ہوشے کی گلیاں تھیں جن میں ہماری ویگن ٹریفک کے شور میں.. چلتی جاتی تھی..

یہ تختِ لاہور کی گلیاں تھیں..

ساجن کی وہ گلیاں تھیں جنہیں ہم چھوڑ گئے تھے.. اور اب واپس آئے تھے تو جی چاہتا تھا کہ کاش ساجن ان گلیوں میں ہوتی وہ بیات اوسید اور گندی گلیوں میں نہ ہوتا... ہوشے کی گلیوں میں ہوتا..

ساجن پر مینارِ پاکستان ایسے.. انارکلی لاہور کی بھونڈی نقل ایسے سبز گنبد کا سایہ نہ ہوتا.. شاہ برم کا سایہ ہوتا..

اور ہوشے کی گلیاں بھی ایسی تھیں کہ ان میں ساجن کے ساتھ گھومنے پر پولیس نکاح نامہ طلب نہیں کرتی تھی.. یہاں پولیس ہوتی تو طلب کرتی..

البتہ ساجن کو لاہور سے ہوشے شفٹ کرنے میں بھی تو کچھ تکنیکی مسائل تھے..

ایک تو یہ کہ شہرِ لاہور کا باسی ساجن.. گھر سے باہر قدم رکھنے سے پیشتر میک اپ کی پوری ایک تہہ ختم کر دینے والا اور ہونٹوں پر ایل شیڈ کی لپ اسٹک لگانے والا ساجن.. اوّل تو لاہور سے ہوشے جانے کے لیے راضی ہی نہیں ہوگا.. اور اگر بفرضِ محال رومینٹک ہو کر چلا بھی جائے تو چند روز میں بیزار ہو جائے گا کہ یہ کہاں آ گئے ہم چمن سے نکل کر.. اور ایسی محبت سے ہم باز آئے... وہ موسم سرما کی شدید برفباریوں میں ہوشے کی کسی کھڑکی میں آگ پر اپنا گورا چٹا چہرہ سینکتا ساجن بہار کی آمد تک دھوئیں سے کالا شاہ ہو چکا ہوگا.. اس کا حلیہ بگڑ چکا ہوگا... وہ گورا رنگ جس کی وجہ سے پوا ایپنڈ ڈیرلی ہو جاتا ہے، وہ دھوئیں کی کالک میں ایسے غائب ہوگا کہ ساجن کی صرف آنکھیں دکھائی دے رہی ہوں گی جن کے کونٹیکٹ لینز والا ہو میں بھول آیا ہوگا اور اب

چندھیائی آنکھوں سے ہر سُو دیکھتا ہوگا کہ.. کہاں آ گئے ہم چمن سے نکل کر..

چنانچہ ساجن کو لاہور کی گلیوں میں ہی رہنے دینا مناسب ہے..

میاں صاحب کو ڈراپ کرنے کے بعد ویگن اپنے سامنے ونڈ شیلڈ میں بادشاہی مسجد کے بے مثال گنبد، مینار اناری.. شہر کے شور و غوغا میں بھنبھیڑ کو چیرتی بھاٹی گیٹ سے مڑ کر سول سیکرٹریٹ سے دائیں جانب ہو کر کرشن نگر کی گلیوں میں آ گئی... وہ کرشن نگر جسے اب زبردستی اسلام پورہ کہا جاتا تھا..

زبردستی اس لیے کہ نام بدلنے سے بستی کا مزاج اور اخلاق نہیں بدلا..

یہ محض ایک پلاسٹک سرجری ہوتی ہے جس کے نیچے چہرہ وہی رہتا ہے..

اس حساب سے تو فوری طور پر شہر لاہور کا بھی نام بدل دینا چاہیے کہ یہ رام کے بیٹے لوہ کے نام سے آباد ہوا تھا۔

اس کا نام بھی لائل پور کے بجائے فیصل آباد میں بدلنے کی پاکیزہ روایت کی پیروی کرتے ہوئے کسی سعودی شہزادے کے نام پر.. بے شک پرنس بندر آباد رکھ دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے.. ایک ایسا شہزادہ جو ایک سروے کے مطابق دنیا کے عیاش ترین افراد میں نہایت معتبر مقام پر ہے۔ قصور بھی...؟ میرا ہونہار شہر قصور ہے.. رام کے بیٹے کا ہم نام ہے۔ اسے بھی کسی اور شہزادے کے نام سے پکارا جائے تو کیا حرج ہے۔ سعودی شہزادے تعداد میں اتنے کثیر ہیں کہ ہمارے شہر اور گاؤں ختم ہو جائیں گے ان کی تعداد پھر بھی کم نہ ہوگی... بے شک آپ مان سنگھ کے مانسہرہ.. ہری سنگھ نلوہ کے ہری پور.. ٹیک سنگھ کے ٹوبہ اور رشی گودھا کے سرگودھا کے نام بھی بدل دیں.. شہزادے پھر بھی سرپلس رہیں گے۔

تو اس کرشن نگر.. اسلام پورہ کی ایک نہایت پُرسکون اور زندگی بھری گلی میں.. جہاں ایک گھوڑا بندھا تھا اور کچھ گائیں آوارہ ہوتی تھیں... وہاں حسن صاحب اتر گئے۔

اور کیسی بے تابی میں اترے.. اپنے بچپن کے لیے اداس.. جنم کے لیے مرجھائے ہوئے.. اتنی بیتابی میں اترے کہ ہمیں بھی بھول گئے یہاں تک کہ چچی کی خوبانیوں والی لڑکی کو بھی بھول گئے.. اتنی بے تابی سے جیسے لنکا سے واپسی پر سیتا کو رام ملتا ہے..

ویگن خالی ہو گئی تھی..

اس کے اندر جو موسم ٹھہرے ہوئے تھے وہ بھی رخصت ہوتے جاتے تھے.. اور شہر کی

کثافت آمیز دھواں بھری ہوا اس کے اندر ٹھہرے ہوئے موسموں پر غالب آتی جاتی تھی۔

ہر ساتھی کے اترنے کے ساتھ کچھ موسم بھی ویگن سے اتر جاتے تھے..

ہم کہاں سے آئے تھے؟

ہو کرشن نگر کی اس گلی میں جہاں ایک گھوڑا بندھا تھا اور کچھ گائیں آوارہ ہوتی تھیں اور حسن اترے تھے یہ یقین ہوتا تھا کہ ہم کہاں سے آئے تھے۔

"وادی ہوشے.. چھنگر پیک اور ٹریک کا پہلا دن"

ہر ٹریک کا پہلا قدم ہمیشہ ہیجان خیز ہوتا ہے۔

پورٹر اپنے کندھوں پر آپ کے بوجھ اٹھا کے.. آپ کے چولہے.. پریشر ککر.. دیگچی.. دالیں۔ خوراک کے ٹن۔ بکرے ملنے کے لیے بیس اور ٹینٹ، بچھلی، دفعہ اٹھائے نکلتے ہیں اور جب آخری پورٹر آپ کے قریب سے گزر جاتا ہے تب آپ سب سفر کی دعا پڑھتے ہیں.. اور بسم اللہ کہہ کر وہ پہلا قدم اٹھاتے ہیں..

دراصل پہلا قدم ہی پوری کوہ نوردی ہوتا ہے..

جیسے کہا جاتا ہے کہ ناول کا پہلا فقرہ لکھنا سب سے مشکل ہوتا ہے... وہ لکھ لیجیے تو گویا ناول مکمل ہو گیا..

جیسے چاند پر پہلا قدم.. نسل انسانی کے لیے ایک عظیم جست ہوتا ہے..

جیسے سڑک پار کرتے ہوئے کسی کے ساتھ آپ کا ہاتھ چھو جائے تو گویا ایک عشق خاص کا آغاز ہو جاتا ہے..

جیسے موت سے پہلے لمحے میں ہی قیامت آجاتی ہے.. کہ آپ کی آنکھیں بند ہونے کے بعد بے شک اربوں سال گزر جائیں، جب آپ کی آنکھ کھلے گی اور قیامت ہو گی اور آپ کہیں گے کہ میں تو ابھی ابھی مرا تھا..

کچھ ایسے ہی ٹریک کا پہلا قدم.. اور آپ منزل تک پہنچ جاتے ہیں..

بس یہی پہلا قدم ہم نے ہوشے میں اٹھایا تو گویا گوندوگورو کے بیس کیمپ پہنچ گئے..

ہوشے کی گلیاں کہاں تک ساتھ دیتیں۔ ایک ڈھلوان پر پہنچ کر جھک گئیں، پیچھے رہ

گئیں اور ہم پکے کھیتوں میں اترنے لگے..

ہمارے پورٹر جو خاصے دور چلے گئے تھے یہاں سے کھیتوں میں بھٹکتے ہوئے لگتے تھے..

ہر سو سنہری راج تھا..

اس کھلے سنہری پن میں کہیں کہیں ہریاول ٹھہری ہوئی تھی..

گندم پکنے کو تھی.. اتنی نہیں پکی تھی کہ کاٹی جا سکے.. اور کچھ کھیت ایسے تھے جن میں اس کے خوشے ابھی تک ہرے تھے..

ہم کھیتوں کے درمیان میں ایک پگڈنڈی پر چلتے جاتے تھے.. تازہ دم تھے اور چہلیں کر رہے تھے.. بدنوں میں چابکدستی تھی کہ وہ ابھی پسینے اور تھکاوٹ سے آشنا نہیں ہوئے تھے.. خوش تھے کہ اس ویگن سے جان چھوٹی جو جیپ میں گزرتی تھی.. جیپوں کی محتاجی کا اختتام ہوا.. سب بیساکھیاں پیچھے رہ گئی تھیں اور اب ہم کسی بھی سہارے کے بغیر خود چلتے تھے، ایک پگڈنڈی پر جس پر ہم آج تک نہیں چلے تھے اور ایک چودہ ہزار فٹ بلند درے کی جانب چلتے تھے... جو ہمارے لیے اتنا اجنبی تھا کہ ہم نے آج تک اس کی کوئی تصویر بھی نہیں دیکھی تھی..

مخالف سمت سے کچھ پورٹر چلے آرہے تھے..

وہ تھکے ہوئے تھے.. بوجھ تلے دبے ہوئے تھے.. یکدم انہوں نے اپنے بوجھ اتارے اور پگڈنڈی کے برابر میں کھیتوں میں گھس گئے..

کھیتوں میں کام کرنے والی خواتین نے بالکل مائنڈ نہ کیا کہ وہ گندم توڑ رہے ہیں اور اسے جمع کر رہے ہیں بلکہ ان کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگیں کیونکہ وہ ہوشے کے تھے اور ان کے دور پار کے رشتے دار تھے..

یہ پورٹر کھیتوں میں گھس کر گندم کے سنہری خوشوں کے بیچ کہیں کہیں نمودار ہونے والی سبز بالیوں کو تلاش کر رہے تھے... وہ ان کی بالیاں توڑتے اور انہیں مسل کر ان میں سے ہرے دانے نکال کر منہ میں رکھتے اور خوش ہوتے تھے..

وہ بس اتنی ذرا سی بات پر خوش ہوتے تھے..

بلندی سے نیچے آنے والے یہ پورٹر.. جانے کتنی طویل مسافتوں اور کتنے دنوں کے بعد نیچے آنے والے یہ پورٹر باسی روٹیاں، خشک پنیر اور ٹن بند خوراکیں کھا کھا کر بیزار ہو چکے تھے اور ان کے تالو کسی تازگی کو ترستے تھے.. تازہ کھیروں، خوبانیوں اور پیاز کے لیے ترستے تھے اور یہاں

صرف مٹر کی پھلیاں تھیں اور تازہ تھیں تو وہ ان کے ہرے ذائقے کو منہ میں رکھنے کے لیے بے چین ہوتے تھے اور خوش ہوتے تھے..

ہم انہیں یہ عیاشی کرتے ہوئے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

دائیں ہاتھ پر درجہ بدرجہ کھیتوں کی اوپر خشک چٹانوں کی ایک دیوار چلتی تھی اور بائیں جانب بھی کھیت تھے اور ان کے آخر میں ایک گہرائی تھی جس میں ہوشے دریا بہتا تھا اور یہاں سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اگر ہم نے اپنے اولین منصوبے کے تحت متابرم بیس کیمپ میں جانا ہوتا تو ہم یہیں کہیں سے نیچے اتر کر ہوشے دریا کے پار جاتے اور اس کے ساتھ ساتھ سفر کرتے.. دریا پار ایک اور بہت بڑا نالہ بلندی سے اترتا آ رہا تھا اور اس کے آس پاس اس کے پانیوں میں سیراب ہونے والے ہرے بھرے کھیت تھے.. اسی جانب ایک ویران پہاڑ دکھائی دے رہا تھا جس پر ہوشے کی تین خواتین اور ایک مرد بکریوں کی مانند اوپر چڑھتے جاتے تھے.. وہاں نہ کوئی راستہ تھا اور نہ کوئی پگڈنڈی.. اور پھر بھی چڑھتے جاتے تھے کہ وہ اسی دنیا میں پلے بڑھے تھے.. وہ مجھ سے اتنی دور تھے کہ یہاں سے محض نقطے لگتے تھے جو کبھی کبھار حرکت کرتے تھے اور کبھی یوں ہوتا کہ میں کچھ دیر کے بعد ادھر دیکھتا تو وہ جھاڑیوں اور گھاس میں گم ہو چکے ہوتے پھر غور کرنے سے دوبارہ نظر آتے.. وہ ایک خاص بلندی پر پہنچ کر رک گئے اور جھاڑیوں کو کاٹنے لگے۔ گھاس جمع کرنے لگے.. اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اسے کمر پر بوجھ کر کے نیچے نالے کی جانب اترنے لگے.. شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ اتنی دوری سے جہاں سے وہ محض نقطے لگتے تھے میں نے کیسے جان لیا کہ ان چاروں میں سے تین عورتیں ہیں اور ایک مرد.. خواتین کے پیراہن سرخ رنگ کے تھے اور وہ زیادہ آسانی سے پہاڑ پر چڑھتی تھیں..

ہم ابھی تک ہوشے کی دنیا میں تھے..

کھیتوں میں کہیں کہیں پتھریلی آماجگاہیں تھیں جن کے باسی ہماری نگاہوں سے چھپے تھے البتہ بچے لوگ ہاتھ ہلاتے تھے..

یہ تو درست کہ پہلا قدم سب سے مشکل ہوتا ہے لیکن اس سے بڑا سچ یہ ہے اس پہلے قدم کے بعد ہی تو اصل آزمائش شروع ہوتی ہے.. سانس پھولنے لگتا ہے۔ گھٹنوں میں درد ہونے لگتا ہے.. جوگرز پاؤں کو پاسنے لگتے ہیں.. جرابوں میں اگر کوئی سلوٹ رہ گئی ہے تو وہ چبھتی ہے اور پھر تیز دھوپ کے تھپیڑے آپ کے بدن میں سوراخ کر کے نہ صرف پسینہ بہاتے ہیں بلکہ آپ

کو نڈھال کرتے ہیں اور آپ اپنی فلاسک کو عزیز از جان.. جانتے ہیں کہ اس میں گلوکوز ملا پانی ہے جس کا ایک ایک گھونٹ آبِ حیات ہے اور جو آپ کے بدن کو ڈی ہائیڈریشن سے بچا سکتا ہے.. پھر آپ ان ساتھیوں کو تلاش کرتے ہیں جو آگے نکل چکے ہیں جن میں ہرانی بھی شامل ہے اور وہ چونکہ پہلی بار ہمارا ساتھی ہوا ہے اس لیے تازہ دم ہے اور کسی چولستانی آہوئے آوارہ کی مانند قلانچیں بھرتا نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے اور پھر ان ساتھیوں پر نظر کرتے ہیں جو آپ کے آس پاس آپ کو کوستے ہوئے پیٹ پیٹ ہماری قدموں کو بمشکل اٹھا رہے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو کوئی ایک آدھ ساتھی ایسا ہے جو یہ منصوبہ بندی کر رہا ہے کہ گندہ کور و پراسٹ تجویز کہیں سے واپس ہوشے لوٹ جاتے ہیں..

ہوشے سے ہماری اگلی قیام گاہ تک کا راستہ آسان ہونا چاہیے تھا کیونکہ گائیڈ کسی نے بھی اطلاع فراہم کی تھی اور اس قیام گاہ کا نام متعدد بار سننے اور دوہرانے کے باوجود مجھے یاد نہ ہوتا تھا۔ صرف اتنا یاد رہتا تھا کہ اس کا نام کچھ چٹنی سا ہے اور چٹنی کے ایک پیالے.. ایک وسیع جھیل کے کنارے چائے کے ہاتھوں والے شہر یا تھک چہرے سے ملتا جلتا تھا..

لیکن میں اس لیے یا تھک چہرے کو خصوصی طور پر یاد نہیں کرنا چاہتا تھا..

کہ وہاں چینگ کی تنگی رہتی تھی..

ہوشے کے کھیتوں کا اختتام ہوا تو پتھر شروع ہو گئے.. خدا خدا کر کے وہ ختم ہوئے تو ایک دونالے راستے میں آئے.. دو تین تنگ چڑھائی سے سابقہ پڑا..

ہمیں یہی اطلاع دی گئی تھی کہ آج کل چار سے چھ گھنٹے کا سفر درپیش تھا اور ہمیں چلتے ہوئے چھ گھنٹے تو بیت چکے تھے اور ابھی تک تھک کے لیے بھی قیام نہ ہوا تھا۔ پھر صنوبر کے کچھ درخت نظر آئے اور چھدرے نظر آئے.. اور ان کے سائے میں کچھ بھوری اور سیاہ ڈھیر نظر آئے..

میں نے جب پہلی ان ڈھیروں کو دیکھا تو ڈر گیا کہ یہ کیا ہولناک چیزیں ہیں.. پھر کھلا کہ یہ تو بھولے بھالے یاک ہیں جو دھوپ سے بچنے کی خاطر صنوبر کے سایوں تلے استراحت فرماتے ہیں..

یہاں سے ہوشے دریا کہیں متابرم کی جانب چلا گیا تھا یا وہاں سے اتر کر ہوشے کی جانب بہہ چلا تھا اور اب ہم چڑا کسا اور یا کو کہتے چلتے تھے..

ایک آبادی.. بلکہ متروک شدہ جھونپڑے آئے جو دراصل گھتان تھا.. بکری باڑے تھے اور

ایک کوٹھڑی نما مسجد تھی جس کے باہر وارننگ درج تھی کہ غیر مسلم یہاں داخل نہیں ہو سکتے.. ہم سب اگرچہ اس کے اندر جانے کے تمنائی تھے لیکن جھجک گئے کہ کیا ہم اپنے آپ کو مسلمان کہہ سکتے ہیں.. البتہ حسن صاحب بے دھڑک اندر چلے گئے کہ مرتی ہم اعلیٰ سادات میں سے ہیں..

"اندر کیا ہے؟" ہم نے پوچھا جب وہ باہر آئے..

"ایک چٹائی ہے اور ایک لوٹا ہے۔"

ہم پھر سے چلنے لگے.. اس ٹریک میں آسانی یہ تھی کہ نہیں راستہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی تھی.. ایک چوڑی پگڈنڈی تھی جس پر بس چلتے جائیے..

ذرا آگے ہمارے پورٹر آرام کر رہے تھے..

صنوبر کے درختوں تلے یاروں کی مانند استراحت فرما رہے تھے..

میں نے اپنا مختصر رک سیک اتارا اور ایک گھنے ہوئے صنوبر کے سائے میں رینگتا صرف اپنے چہرے کو دھوپ سے بچا سکا اور لیٹ گیا۔

گرم سوپ.. بادام.. کچھ پنیر اور چائے..

لنچ ختم..

بائیں جانب جدھر ایک وادی دور تک جہاں تک نظر جاتی تھی، کھلتی جاتی تھی.. مشابرم تھی.. مشابرم کے برابر میں دو اور چوٹیاں تھیں جو چٹانوں میں سے جھانکتی اوپر ہوتی آسمان میں شفید ہوتی تھیں..

"یہ چھتنگر پیک ہے سر.." حسین نے اطلاع کی..

بریانی تجسس ہو گیا۔ "سائیں.. یہ چھتنگر؟.. بلتی زبان کا کوئی لفظ ہے؟"

"نہیں سر.. انگلش میں کہتے ہیں.. چھتنگر پیک.. چھتنگر!" اس نے انگلی کھڑی کر کے ہمیں بتایا کہ یہ والی.. چھتنگر!

معلوم ہوا کہ یہ چوٹی چھتنگر.. یعنی فنگر پیک اس لیے کہلاتی ہے کہ اس کی ساخت اور شکل دور سے ایک انگلی کی مانند اٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے بلکہ دو انگلیوں کی مانند کہ وہ دو چوٹیاں تھیں جو آسمان کو انگلی دیتے ہوئے کہتی تھیں کہ خبردار ہم چھتنگر پیک ہیں..

اس چھتنگر سے یاد آیا کہ ہوشے سے نکلتے ہی، ہم متعدد پروفیشنل قسم کے بچہ لوگ کی یلغار میں آ گئے جو ہم سے بہ زبان انگریزی چاکلیٹ، سویٹ، ٹافی وغیرہ کی ڈیمانڈ کرنے لگے..

پروفیشنل اس لیے کہ شمال میں ہر وہ قصبہ یا آبادی جہاں سے بلند پہاڑوں کو راستے جاتے ہیں وہاں کے بچے جانتے ہیں کہ صبح سویرے غیر ملکی کوہ نورد اوپر جانے کے لیے نکلیں گے اور ان کے پاس چاکلیٹ اور ٹافیاں ہوتی ہیں جو ہمارے لیے ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ ایک طے شدہ شیڈیول کے مطابق اپنا حق وصول کرنے کے لیے آپ پر حملہ آور ہو جاتے ہیں..

ہم نے ہوشے میں ایک بورڈ پر یہ عبارت پڑھی تھی کہ براہ کرم ہمارے بچوں کو ٹافیاں اور سویٹس دے کر نہ بگاڑیے بلکہ انہیں کاپیاں اور پنسلیں تحفے کے طور پر پیش کیجیے تاکہ وہ تعلیم حاصل کر سکیں..

ہمارے پاس ان بچوں کو بگاڑنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم اپنے ساتھ کاپیاں اور پنسلیں لانا بھول گئے تھے.. چنانچہ انہیں ٹافیاں اور سویٹس تو ان کے شور پر ادا کر دی گئیں.. ان میں سے ایک بچے نے اپنا نام عمران خان بتایا اور دوسرے نے سینہ پھلا کر اپنے پنجوں پر ذرا بلند ہو کر کہا کہ میں.. مشابرم خان ہوں..

یہ مشابرم خان ابھی ایک میٹر کا بھی نہ تھا لیکن.. 7821 میٹر بلند چوٹی کی ہمسری کرنے میں کیا برائی ہے..

چنانچہ ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ مشابرم کو تو ہم نے ٹافیاں کھلائی تھیں اپنے ہاتھ سے.. لنچ بریک کے دوران میں ایک تو ہم نے چھتنگر پیک کو دریافت کیا اور اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس پیک کے برابر میں کوئی ایسا راستہ نکلتا ہے جو گھوبرے میں جا اترتا ہے..

"کے ٹو کہانی" کے دوران.. پائیو اور اُلی گو کے بعد بالتورو گلیشیئر کے کناروں پر جو ایک خیمہ گاہ تھی.. جہاں ہم نے ایک اُمڈتے ہوئے گلیشیئر کے سامنے رات کی تھی تو وہ خیمہ گاہ گھوبرے تھی.. اور یہ اُمڈتا ہوا گلیشیئر گھوبرے کا تھا جو ہمارے قیام کے ایک دو برس بعد یوں اُمڈا کہ اس خیمہ گاہ کو روندتا بالتورو میں اُتر گیا.. اس سفر کے دوران بہرطور کے ٹو ٹریک کے حوالے اتنے تھے.. کیونکہ.. یہاں واقعی اِدھر تم اُدھر ہم.. والا معاملہ تھا.. کنکورڈیا کو جانے والے بالتورو گلیشیئر کا وجود ان چوٹیوں کے دوسری جانب چلتا تھا..

صنوبر کے چھدرے سائے ہمیں آسودگی نہ دے سکے اور ہم لنچ نگل کر پھر سے رواں ہو گئے.. چراکسا دریا.. صنوبر کے درختوں اور جھاڑیوں سے پرے بہتا تھا.. اور پھر ہم اس کے کناروں پر آ گئے.. کناروں پر دور دور تک پتھر تھے اور نرم ریت تھی..

دوپہر خاصی ڈھل چکی تھی.. لیکن ہماری منزل کا کچھ پتہ نہ تھا.. کوئی نشان نہ تھا.. جس منزل کا نام بھی یاد نہ ہو وہ بھلا کیسے آ سکتی ہے..

تھک سب چکے تھے لیکن اقرار کوئی نہ کرتا تھا..

بے بس سب ہو چکے تھے لیکن شکایت کوئی نہیں کرتا تھا..

کیونکہ پہلے روز ہی اگر اس قسم کے شکوے شروع ہو جائیں اور یہ بھی بتا دیا گیا ہو کہ یہ تو دو چار گھنٹے کا آسان راستہ ہے تو پھر کوئی بھی شکوہ کر کے اپنی مردانگی مجروح نہیں کرتا.. دریا کے ہموار کناروں کے بعد اس کے پانی قریب آ گئے اور ہم موسیٰ نہیں تھے جو اس میں اپنی ڈانگ پھینک کر اسے دولخت ہو جانے کا حکم دیتے اور درمیان میں سے گزر جاتے۔ اس لیے ہم دریا پر معلق چٹانوں کے اوپر چڑھنے لگے..

پہلی بار ایک قدرے مشکل راستہ قدموں تلے آیا.. جس میں اگرچہ بلندی کم تھی لیکن خطرناکی تھی.. یعنی اگر پاؤں پھسلتا تھا تو ہم لڑھکتے ہوئے نیچے پانیوں میں جاتے تھے.... اگرچہ یہ پانی بھی کم تھے نہ ہمیں بہا کر لے جا سکتے تھے نہ ڈبونے کی صلاحیت رکھتے تھے.. جان تو نہیں جا سکتی تھی ایک آدھ ہڈی چٹخ سکتی تھی لیکن یہ بھی غنیمت تھا.. اس لیے یہاں پہنچ کر میاں صاحب پہلی بار چہکے بلکہ خوشی سے نڈھال ہو گئے۔ "شکر ہے کہ ایسا مدھم راستہ بھی آیا ہے.. واہ جی واہ.."

"کیوں واہ جی واہ.." میں نے اس راستے پر اپنے آپ کو قائم رکھنے اور نیچے نہ گرنے کی تگ و دو میں بڑی ناگواری سے پوچھا..

"مرتی.. ہوٹے سے یہاں تک تو بس مشقت اور مزدوری تھی.. طبیعت آوازار ہو گئی تھی بے مقصد چلتے چلتے.. اب کچھ کچھ خطرناکی کے آثار پیدا ہوئے ہیں تو بادشاہو، مزا آ گیا ہے.."

میاں صاحب کی کمزوری کی منطق یہ تھی کہ جب تک کہیں بلندی سے گر کر ہلاک ہو جانے یا دریا برد ہو کر موت کے سپرد ہو جانے کے امکانات پیدا نہیں ہوتے تھے وہ خوش نہیں ہوتے تھے.. مزا نہیں آتا تھا.. یہ نیم ہلاکت خیز راستہ بدقسمتی سے ذرا سی دیر میں تمام ہو گیا اور پھر سے صنوبر کے درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا..

ہم ایک مدت تک ان میں چلتے رہے.. ہمارے برابر میں دریا چنگھاڑتا تھا اور ہمیں مزید بہرا کرتا تھا..

"تارڑ صاحب.." تنویر میرے برابر میں چلتا تھا.. کے ٹو کے بعد پہلی بار کسی ٹریک میں

چلتا تھا اور ابھی تک اس کی سختی سے مطابقت نہیں کر پایا تھا۔ "ہمیں اس دریا کے پار جانا ہے؟"

"پتہ نہیں.."

"دریا کے پار ایک بہت بڑا گلیشیر دکھائی دے رہا ہے جو گندوگورو ہی ہو سکتا ہے تو کیا ہم نے وہاں تک جانا ہے اور کل صبح اس کے اندر جانا ہے؟"

"پتہ نہیں۔"

"ویسے آپ کو پتہ کیا ہے؟"

"پتہ نہیں.."

اور یہ حقیقت ہے کہ مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ ہم نے آج کہاں جانا ہے.. صرف یہ پتہ تھا کہ کہیں نہ کہیں جانا ہے..

"کچھ تو پتہ ہوگا.."

"صرف یہ پتہ ہے کہ کسی ایسی جگہ جانا ہے جس کا نام چین کے شہر ہانگ چو سے ملتا جلتا ہے۔"

ہم جھاڑیوں اور بلند گھاس میں چل رہے تھے..

"اگر تو ہم نے اس دریا کے کناروں پر سفر کرنا ہے تو مجھے آگے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا اور اگر ہم نے اس کے پار جانا ہے تو پھر اس مقام پر یہ بالکل دریا جیسا ہے اور ہم درجن بھر پورٹروں کے کندھوں پر سوار ہو کر بھی اس کے پار نہیں اتر سکتے جب تک کہ اس پر ایک پل نہ ہو... جو نہیں ہے۔"

"ہاں پل تو نہیں ہے.. اگر ہوتا تو نظر آ جاتا.."

اور ٹھیک اس لمحے جب ناصر نے یہ کہا کہ.. جب تک اس پر ایک پل نہ ہو... جو نہیں ہے.. اور میں نے جواب میں ابھی یہی کہا تھا کہ ہاں پل تو نہیں ہے.. اگر ہوتا تو نظر آ جاتا.. ایک پل نظر آ گیا.. جھاڑیوں کی اوٹ میں سے ایک نہایت تنگ کمر قسم کا پل دکھائی دینے لگا..

"یار تم پہلے ہی کہہ دیتے کہ اس دریا کو ایک پل کے بغیر پار نہیں کیا جا سکتا تو یہ پل پہلے ہی نمودار ہو جاتا.."

چراکسا دریا کہیں پیچھے سے چلا آ رہا تھا اور سامنے جو گندوگورو کا عظیم اور ہیبت ناک گلیشیر دکھائی دے رہا تھا اس میں سے اسی نام کا دریا اتر رہا تھا.. یہاں دونوں دریاؤں کا سنگم تھا

"تارڑ صاحب آپ صراطِ مستقیم پر ہیں.. یہ والا راستہ تو آگے سے بند ہو گیا ہے۔"

میں نے بھی آوارگی کی.. زندگی میں پہلی بار صراطِ مستقیم پر چلا ہوں.. اب تمہارا انتظار کرتا ہوں واپس نہ جاؤ..

میں نے انتظار کیا اور وہ آ گیا..

ہم چند قدم آگے چلے ہیں تو سامنے منظر یوں کھلا جیسے راحت بہ رضا محبوب کے بندِ قبا کھلتے ہیں..

"شائی چو کا خیمہ شہر.. ندیاں اور صنوبر کے گھنے درخت"

سامنے.. ایک جھاڑیوں بھرا.. ندیوں بھرا کھلا میدان ہے جس کے پس منظر میں کچھ برفپوش بلندیاں ہیں جو بہت نا آشنا اور پُرفریب ہیں اور یہ میدان رنگ رنگ کے بے شمار خیموں سے بھرا ہے.. لگتا ہے کہ یہاں بھی دوسے کی مانند ہمیں خیمے لگانے کے لیے جگہ نہیں ملے گی یہ اتنا خیموں بھرا ہے.. ایک پتھریلی آبشار بھی دکھائی دے رہی ہے جس میں گورا اور گوری لوگوں کا تماشا پتہ نہیں کیا کر رہا ہے.. ہم دونوں نیچے ایک پُرشور ندی کی سطح پر آئے تو وہاں ایک بڑے پتھر پر ایک گورے گوریاں دھیان میں گم تھا... وہ پانیوں کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا بلکہ اپنے ہی قبیلے کا تھا، پاگل تھا.. ہم اسے دیکھتے اس کے قریب سے گزرے تو اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ ہم گزرے ہیں... وہ بھی گزر رہا لگتا تھا..

ذرا آگے ہوئے.. ایک ندی کو پھلانگ کر عبور کیا تو اس پُرہجوم خیمہ بستی میں داخل ہو گئے اور اس بستی کا نام اب کہیں مجھے یاد آتا ہے.. یہ ہائی کیمپ نہیں شائی چو تھی..

ظاہر ہے ہم تو اس خیال میں مست تھے کہ وادی کھنڈا سے آگے.. پچاس اور تیس سے پرے یہاں تک کہ دوسرے ایسے دور افتادہ گاؤں سے بھی کہیں آگے ایک پیدل مسافت کے بعد جب ہم شب کے لیے کسی خیمہ گاہ میں پہنچیں گے تو وہاں ایک بڑی ویران گمنام تنہائی ہوگی.. بس ہم ہوں گے اور کوئی نہ ہوگا اور ہم آسمان سے باتیں کرتے پہاڑوں سے باتیں کریں گے.. تمام طور پر نہیں ہوا تھا.. لیکن یہاں پہنچے ہیں تو خیموں کا ایک گاؤں آباد ہے۔ نصف یورپ کے کوہ نورد یہاں خیمہ زن ہیں.. اور گورے اتنی تعداد میں گھومتے اور مسخریاں کرتے پھرتے ہیں کہ زنانہ جسم ہو رہا ہے.. وہ جو پتھریلی آبشار ہے تو دراصل یہ کوئی سا ہے جس کے برآمدے میں ہم لوگ

ٹانگیں پھیلائے کافی بیتاب اور اپنے مدت سے ان نہائے بدنوں کو کھجلی وغیرہ کرتا ہے..

ہماری آمد کو محال ہے کسی نے بھی نوٹ کیا ہو... ہوٹل کے قریب ندی کے اوپر ایک کھوکھا سا بنا ہوا تھا جس پر TWILIT لکھا ہوا تھا اور اس پینٹر کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا جس نے گندھ گورو نالے والے پل کو پینٹ کیا تھا، اگر آپ کی انگریزی کمزور ہے تو آپ کی اطلاع کے لیے یہ "ٹوائلٹ" لکھا ہوا تھا... ندیوں کے بیچ کچھ ٹیلے جزیرے سے ہیں جن میں مختلف گروپوں کے رہائشی ٹینٹ، ڈائننگ ٹینٹ اور کچن ٹینٹ ایستادہ ہیں.. اس جہان خیمہ جات میں ہم کھو سے گئے کہ ہم کدھر جائیں کہ نہ ہمیں کہیں اپنے خیمے نظر آ رہے تھے اور نہ پورٹر دکھائی دیتے تھے..

یہ تمام گروہ اور لوگ اسکولے سے کے ٹو بیس کیمپ تک جا کر پھر واپس وزیر گندھ گورو کے راستے یہاں شائی چو پہنچے تھے اور یہ ایک بہت ہی طویل اور سخت کوہستانی سفر کا اختتام تھا، اس لیے وہ ریلیکس کر رہے تھے.. مزے کر رہے تھے..

ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ایک بلند قامت جرمن خاتون ٹائٹ جین اور بلاؤز میں ہچکی سی کھڑی ہے، سنہری بالوں والی ہے لیکن نہایت مردانہ شخصیت کی مالک ہے اور وہ اپنی آٹھ سالہ بچی کو.. جو بالکل اپنی ماں کی آٹھ سالہ ہو بہو ہے.. ترغیب دے رہی ہے کہ یہ ندی خود چھلانگ کر پار جاؤ.. بچی اپنی پونی ٹیل لہراتی بڑے مزے سے چھلانگ لگا کر دوسری جانب چلی جاتی ہے..

"تارڑ صاحب.." عامر پہلی بار بولا۔ "یہ بچی بھی تو گندھ گورو درہ عبور کر کے آئی ہوگی.. رسوں کے سہارے نیچے اتری ہوگی.. تو یہ لوگ اگر اس عمر میں ہی اس قسم کی حرکتیں شروع کر دیتے ہیں تو ذرا جوان ہونے پر یہ کے ٹو یا ایورسٹ کی چوٹی پر بھی تو یونہی چھلانگیں لگاتے پہنچ جاتے ہوں گے.."

"یہ لوگ ہر قسم کی حرکتیں اسی عمر سے شروع کر دیتے ہیں اور جو جوان ہوتے ہیں تو استاد ہو جاتے ہیں.. ہم یہ حرکتیں اول تو کرتے ہی نہیں، اگر کرتے ہیں تو جوانی کے ڈھلنے پر شروع کرتے ہیں اور پھر ہمارا وہی حال ہوتا ہے جو.. ہمارا اب ہو رہا ہے.."

ہم خیمہ بستی میں سے گزرتے.. ندیاں.. بلکہ چھوٹی چھوٹی برفانی نالیاں پار کرتے بالآخر شائی چو کے کناروں پر آ گئے جہاں ابھی سورج کی تمازت تھی اور ہمارے خیمے تھے.. کچن ٹینٹ قائم ہو چکا تھا اور اسحاق باورچی ایک بہت ہی شور کرتے سٹوو پر آلو کے قتلے فرائی کر رہا تھا..

علی موسیٰ ایک نہایت ہی غلیظ جگ میں ٹینگ کے زرد پانی گھولتا ہمارے پاس آ گیا.. یہ گندا جگ.. چند دیگچیاں، ایک کڑاہی.. روٹیاں گرم رکھنے کے لیے ایک غلیظ پلاسٹک کا ہاٹ پاٹ.. کچن ٹینٹ کے لیے ترپال وغیرہ سلمان نے ہوشے سے کرائے پر حاصل کیے تھے.. ہم نے جب تو ان کی مخدوش بلکہ بدتر حالت کو دیکھ کر نہایت ناگواری کا اظہار کیا تھا لیکن جوں جوں ہم بلند ہوتے گئے، یہ آلات ہمیں عزیز تر ہوتے گئے.. کیونکہ جگ میں ٹینگ کا زرد جوس گھولا جاتا تھا.. کڑاہی میں پراٹھے اور بالآخر پکوڑے تلے جاتے تھے اور ہاٹ پاٹ میں ہمارے پراٹھے گرم رہتے تھے.. سلمان بھالو اور چوہلی زرین کا تازہ دم گروہ باقی پہلے آ چکے تھے.. پھر میں اور عامر پہنچے.. حسن صاحب آئے اور پھر میاں صاحب اور شاہد لو بزرگوں کی طرح جھکتے پیار کرتے وارد ہوئے..

"واہ جی واہ.." میاں صاحب کے کمے ہوئے کسرتی چہرے پر ایک ایسے کوہ نورد کی مسکراہٹ پھیلی جو دربدر ہوتا ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جس کے سامنے انجانی چوٹیوں کی برفیں بلند ہوتی ہیں اور وہ اپنی تھکاوٹ بھول جاتا ہے۔ "واہ جی واہ.. شاؤ چو کی کیا بات ہے.."

"یہ شاؤ چو نہیں ہے میاں صاحب۔" سلمان نے ہنس کر کہا "شائی چو ہے۔"

"اوئے مخول مار.. تو پہلے کبھی ادھر آیا ہے؟"

"نہیں میاں صاحب۔"

"تو پھر تمہیں کیسے پتہ ہے کہ یہ شاؤ چو ہے یا شائی چو ہے؟"

"ویسے شائی چو ہے میاں صاحب.." سلمان نے کھسیانے ہو کر کہا..

"ہوگا شائی چو.. لیکن ویسے زبردست نام.. نم جگہ ہے کہ اس کے ساتھ ایک اور "چو" لگا دیں تو کیا حرج ہے۔ بزرگوں کو ٹوکا نہیں کرتے.. بھالو بچے.."

"میاں صاحب.. بھالو بن کر دکھاؤں؟"

"دکھاؤ.."

سلمان نے ہاتھ اوپر کر کے اپنی دونوں ہتھیلیاں نیچے کر لیں جیسے ریچھ ناچتے ہوئے کر لیتے ہیں..

"تم بہت اچھے بچے ہو.." میاں صاحب نے نہایت محبت بھرے انداز میں داد دی..

"میں بہت اچھا بھالو ہوں.."

"سلمان تم مائنڈ نہیں کرتے جب تمہیں بھالو کہا جاتا ہے؟" شاہد نے نہایت سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"شاہد صاحب یہ مائنڈ کر جانے والے شعبے کے انچارج آپ ہیں.. یاد ہے جب آپ دیوسائی ٹریک کے دوران پائنچے چڑھائے جرابوں کے بغیر جوگرز پہنے میرے آگے چلتے تھے اور میں نے کہا تھا کہ شاہد صاحب آپ خلاف.. کر کے آئے ہیں تو.."

"شٹ اپ سلمان۔" میں نے اسے ڈانٹا۔

"سوری سر.."

سلمان ابھی ایک جنگلی سا بھالو تھا.. اور نہیں جانتا تھا کہ سینئرز کے ساتھ اس قسم کی بے تکلفی نہیں کیا کرتے.. ہم اسے سدھانے کی پوری کوشش کر رہے تھے..

ویسے کیا ہم سب میں اتنا بڑا دل تھا کہ ہم سلمان کی طرح اقرار کر لیں کہ ہم کیا کیا تھے.. کیا میاں صاحب اپنے آپ کو ایک شاطر شتر مرغ کہہ سکتے تھے.... میں اپنے آپ کو ایک حزب الاخلاق گدھ قرار دے سکتا تھا.. شاہد ایک عیار لومڑ ہونے کا اقرار کر سکتا تھا.. ہ ... ایک سحر انگیز آنکھوں والا کوبرا ہو سکتا تھا.. عامر کہہ سکتا تھا کہ میں ایک سوچ میں گم رہنے والا وہ بیابان الّو ہوں.. البتہ حسن صاحب کچھ بھی ہو سکتے تھے..

ہم سب میں کوئی نہ کوئی جانور ہوتا ہے لیکن ہم اقرار نہیں کرتے..

سلمان اقرار کر لیتا تھا۔

ہم شائی چو پہنچنے پر.. خوش ہو گئی تھی..

شائی چو.. کسی حد تک کے ٹو ٹریک کے دوران اسکولے کے بعد آنے والی خیمہ گاہ کورفون سے مشابہ تھا.. وہاں بیافو کی برفیں، خیمہ گاہ پر معلق بادلوں اور دھند میں تھی اور اس میں سے جو ندیاں اترتی تھیں، وہ نیچے رنگلے میدانوں میں اترتی اور پھیلتی تھیں اور یہاں جو ندیاں تھیں وہ گندے گوروں گلیشیر میں سے نکل کر شائی چو میں رواں ہوتی تھیں.. ندیاں تھیں، جھاڑیاں اور صنوبر کے بکھرے درخت تھے لیکن یہاں ہجوم بہت تھا.. کورفون میں.. کم از کم اس شب.. صرف ہم تھے..

ہمارے خیمے شائی چو کے کناروں پر.. ایک برفانی اور بہت ہی خاموش سی ندی کے کنارے اپنے رنگ رنگ وجودوں کے ساتھ ایستادہ ہو چکے تھے اور ہم گھر والے ہو چکے تھے.. اس ندی کے پار.. جدھر سے ہم آئے تھے اس جانب کسی ہسپانوی گروپ کے بے شمار خیمے تھے اور

انہوں نے ہماری آمد اور ہمارے خیموں کو ناپسند کیا کیونکہ ہم نے ان کا منظر بلاک کر دیا تھا..

اور یہ منظر.. اجنبی اور ناآشنا برفیلی چوٹیوں کا دل کش اور سحر انگیز تھا اور اب ہمارے خیموں کے بالکل سامنے.. ایک بڑے گلیشیر اور ایک بڑی ویرانی سے پرے یوں بلند ہوتا تھا جیسے وہ صرف ہمارے لیے ہی ہو..

کچن ٹینٹ میں ہمارا اپنا خرید کردہ چولہا دھڑ دھڑ جلتا تھا اور اس پر رکھی کڑاہی میں سے آلو کے گرم گرم تلے اتر رہے تھے جو ٹماٹو ساس کے ہلکے سے چٹخارے کے ساتھ اپنی گرمی ذرا سی بجھا کر ہمارے منہ میں اترتے تھے اور ہم خیموں کے آگے شانت بیٹھے سامنے کے منظر کو دیکھتے جاتے تھے..

ابھی ہم سامنے میں بیٹھنا چاہتے تھے اور ابھی وہ سپیر ڈھل گئی.. تمازت رخصت ہوئی تو اس کی جگہ ایک سرد ہوا چلنے لگی..

"کیا بات ہے شائی چو چوٹی.." میاں صاحب نے نعرہ لگا دیا..

میاں صاحب میں.. بے لگام قدرتی اور پہاڑی منظروں کو اپنے سراپے میں وصول کرنے کی ایک ایسی حس ہے کہ وہ ان میں کھو جاتے ہیں.. اور انہیں بیان کرنے کے لیے گفتگو میں موتی پرونے کی کوشش نہیں کرتے بس ایک "واہ جی واہ" یا "کیا بات ہے" کہہ کر اپنا مکمل اظہار کر دیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب بڑے دیوسائی سے مرتضیٰ کیمپ میں اترتے ہوئے جیپ کی اگلی نشست پر براجمان جب ہم دونوں کے سامنے یکدم چھوٹے دیوسائی کی سرسبز.. حیرت انگیز.. ایک وادی میں اترتی سفید ندی اور اس پر سفید بادلوں کے پرے کے پرے.. اور قطعی طور پر ناقابلِ یقین حسن کی دنیا دکھائی دی تو ہم دونوں نے "سبحان اللہ.. سبحان اللہ" کا ورد شروع کر دیا تھا.. اس کے سوا ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہم کیا کریں، کیا کہیں؟؟ تو یہاں بھی ان کا یہی کہنا کہ.. کیا بات ہے شائی چو چوٹی.. اس منظر کو بیان کرنے کے لیے کافی تھا..

علی موسیٰ ایک بلتی بچہ پورٹر.. میں اس سے سوال کر رہا تھا اور وہ مجھے سامنے والے پہاڑوں کے بارے میں بتا رہا تھا.. "صاحب.. یہ جو برف والا وہ چوٹی ادھر شائی چو سے بہت نظر آتا ہے.. اس پتھر نیچے ابھار اور پھر ایک بڑا گلیشیر کے آخر میں.. قریب نہیں.. لیکن قریب نظر آتا ہے تو یہ کے ٹو ٹو بلتسکس اور کے سیون کا چوٹی ہے.. بہت لوگ ادھر شائی چو میں اس لیے آتا ہے کہ ادھر اس چوٹی کے بیس کیمپ میں جاتے.. صاحب ہم تو ادھر گیا ہے بہت خوبصورت جگہ ہے نا.."

"تو کیا گندو گورو درّے کے بیس کیمپ سے بھی زیادہ خوبصورت جگہ ہے؟"

"تو اور کیا صاحب.. گندو گورو کا بیس کیمپ تو کچھ بھی نہیں.. فضول ہے.. اور پھر بھی سب لوگ اُدھر جاتا ہے۔ اُدھر کے سکس اور کے سیون کا جو بیس کیمپ ہے اُدھر جھیل ہے اور میدان ہے.. اور میدان میں یہ اتنا بڑا اونچا گھاس ہے کہ اس میں بندہ چھپ جاتا ہے.. ایسا گھاس ہے۔"

"اچھا!" ہم میں سے کسی کا منہ کھل گیا..

"جھیل ہے اور بہت بڑا بڑا گھاس ہے جی سوئی.." کسی اور نے ایک آہ سی بھری..

"ہاں جی.."

"تارڑ صاحب.. یہ کیسا رہے گا.. گندو گورو نہ جائیں اُدھر کے سکس اور کے سیون کے بیس کیمپ میں چلیں جدھر جھیل ہے اور لمبا لمبا گھاس ہے۔" کسی نے صلاح دی..

"اُدھر لمبا لمبا گھاس کیوں ہے؟" میں نے پوچھا..

"اس لیے صاحب کہ اُدھر تک مویشی نہیں پہنچ سکتا.. راستہ مشکل ہے تو مویشی مر جاتا ہے۔ اس لیے اُدھر لمبا لمبا دنیا جہان کا گھاس ہے۔"

"اگر اُدھر مویشی نہیں پہنچ سکتا تو ہم کیسے پہنچ سکتا ہے جی سوئی؟"

کوہ نوردوں کا ایمان بڑا کمزور ہوتا ہے.. انہیں پہاڑوں کا کوئی اچھی خواب دکھا دیا جائے تو وہ فوراً بے ایمان ہو جاتے ہیں.. ایسے ندیدے بچے ہوتے ہیں کہ ایک ٹافی ہاتھ میں ہے اور دوسری دیکھتے ہیں تو رال ٹپکنے لگتی ہے... ہم نے ایک بار مشابرم کو ترک کر کے گندو گورو کو چن لیا تھا اور اب ایک مرتبہ پھر بے وفائی کرنا چاہتے تھے..

ویسے اس لمحے ہمارے اردگرد شالی چو میں شام ہی شام تھی لیکن سامنے کے سکس اور کے سیون اسی شام کی آخری کرنوں کے سونے سے اپنے لیے برفانی جھمکے، جھانجریں اور کنگن بنا رہی تھیں.. زرد رنگ کے ایسے برفانی گہنے بنا رہی تھیں کہ ہم میں سے کوئی بھی ان زرد شہزادیوں کے عشق میں مبتلا ہو کر گندو گورو جانے سے انکاری ہو سکتا تھا.. اور اگر کوئی ایک ہو جاتا تو ہم سب ہو جاتے.. اور پھر ان زرد شہزادیوں کے دامن میں ایک جھیل بھی تھی اور لمبا لمبا گھاس بھی تھا..

"نہیں نہیں پہنچ سکتا ہے صاحب.. گندو گورو سے آسان ہے.. دیکھیں ہمارے ٹینٹ کے آگے جو ایک میدان سا ہے جس کے ایک طرف دریا ہے تو اس میدان کے آگے وہ چھوٹا خشک

پہاڑی ہے ناں.. آدھے گھنٹے میں اُدھر پہنچے گا.. پہاڑی سے آگے ایک گلیشیئر ہے اس پر چل کر ایک رات کرے گا اور اس سے اگلے دن کے سکس کے بیس کیمپ پہنچ جائے گا.. بہت لمبا لمبا گھاس ہے صاحب اور جھیل ہے اور.."

یہاں پر ہم نے علی سوئی کی زبان بندی کر دی کیونکہ ہم پھر بے ایمان ہونے لگے تھے..

کہتے ہیں جس سروے کرنے والے نے ان شمالی علاقوں کو نقشے پر لانے کے لیے یہاں کی چوٹیوں کی بلندی کا حساب کتاب کیا۔ اس نے چوٹیوں کے ایک پورے سلسلے کا نام "کے" سے شروع کیا اور پھر اسے جتنی جو سب سے بلند چوٹی تھی، اُسے کے ون کا نام دیا.. اس کے بعد جو کم بلندی کی چوٹی تھی اُسے کے ٹو کہا.. اور پھر تھری فور فائیو کے بعد کے سکس اور کے سیون کو شناخت ملی..

بہت بعد میں جب ذرا تفصیل سے بہتر آلات کی مدد سے بلندیاں ناپی گئیں تو معلوم ہوا کہ بلند ترین بلکہ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو تھی..

چنانچہ ہمارے سامنے زرد اور بجھتی کرنوں کے گہنوں سے لدی جو دو چوٹیاں تھیں وہ کے ٹو کی بہنیں تھیں.. اور یہ کمبخت بہنیں اتنی مونث تھیں کہ اس سے اس سردیلی شام میں شالی چو کی شام میں ان کے بلاوے آتے تھے..

کہتے ہیں کہ اُدھر سے.. مقامات مقدسہ کی جانب سے بھی بلاوے آتے ہیں تب انسان اُدھر کوچ کرتا ہے ورنہ یہ اپنے بس کی بات نہیں ہوتی..

کے سکس اور کے سیون بھی حجر اسود کی مانند ایک بلاوے کی قوت رکھتی تھیں کیونکہ دونوں میں کم از کم پتھر ہونا مشترک تھا..

ہم کوشش کر رہے تھے کہ اس بلاوے پر دھیان نہ دیں.. اس لیے اُدھر دیکھنے سے اجتناب کرتے تھے۔ اِدھر اُدھر دیکھتے تھے۔ چنانچہ اس کوشش میں کسی نے بائیں جانب جو پہاڑ تھا اس کے اوپر ٹہلتے ہوئے دو یاکوں کی نشاندہی کی اور حیرت کا اظہار کیا کہ یہ کمبخت وہاں تک کیسے پہنچ گئے ہیں..

"جیسے وہ ہمیں نیچے یہاں دیکھتے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھتے ہوں گے کہ یہ کمبخت یہاں کیسے پہنچ گئے ہیں.."

شالی چو میں اگرچہ ہر طرح سے خیریت رہی لیکن ایک چھوٹا سا سانحہ ہو گیا..

میاں صاحب نے اپنے خیمے سے شاہد کو دھکیل کر باہر نکال دیا۔ اس کا ساز و سامان، سلیپنگ بیگ وغیرہ باہر پھینک کر اُسے خیمے سے عاق کر دیا۔ "خان صاحب اپنا بندوبست خود کرو... میں نوکر تھا دراصل تمہارا کہ اپنا خیمہ لا دوں... اسے خود لگاؤں اور پھر تمہیں سلاؤں... اور پھر تم رات کو خراٹے مار مار کر میرا بچاؤس اُڑا دو... دو شب میں میں ساری رات سو نہیں سکا۔ آج چلنے میں سب سے پیچھے تھا... کیوں؟ صرف تمہارے نامرادتم خراٹوں کی وجہ سے..."

شاہد اپنے بورے بستر پر ایک فروس پناہ گزین کی طرح بیٹھا تھا۔

"میاں صاحب..." میں نے ذرا درد مندانہ معقولات کرنے کی کوشش کی۔

"بس جی آپ لیڈر ہوں گے تو اپنے گھر ہوں گے۔" انہوں نے مجھے بھی جھاڑ پلا دی۔ "میں کل ساری رات سو نہیں سکا... اگلی باری مجھے دوا نہیں کھانی جس میں خراٹے ہی خراٹے ہوں۔"

میاں صاحب واقعی جلال میں تھے کیونکہ ان کی ہر "ز" جیجی "ذ" "ز" میں بدل رہی تھی۔

"لیکن میاں صاحب آپ دونوں تو برسوں سے اکٹھے سوتے آئے ہیں..."

"وقت وقت کی بات ہے جناب... اب برداشت نہیں ہوتا... نہ میں جب خیمہ لگانے لگتا ہوں تو یہ ادھر اُدھر ہو جاتا ہے اور جب خیمہ تیار ہو جاتا ہے تو کہیں سے نمودار ہو کر کہتا ہے... میاں صاحب کچھ ہیلپ کروں... میرے تو اوپر نیچے کے بل جل جاتے ہیں یہ سن کر... تو جناب گڈ بائے ہے میری طرف سے۔"

"میاں صاحب کو بلندی ہو گئی ہے تارڑ صاحب... ان کی باتوں کا مائنڈ نہ کریں۔" شاہد نے کھسیانے ہو کر ذرا سرگوشی میں مجھ سے کہا لیکن میاں صاحب نے سن لیا اور چمک اُٹھے۔ "نہ میں تم سے کہہ رہا ہوں تو مائنڈ تم نے کرنا ہے کہ دوڑنے... او نے بھائی مجھے تو سنکورڈ یا میں بلندی نہیں ہوئی تھی یہاں شائی چو چو میں کیسے ہو جائے گی... بس میری آنکھیں کھل گئی ہیں... لیکن باری کو معاملہ ہے... میں تمہارے لیے کچھ بندوبست کر دیتا ہوں۔"

میاں صاحب نے سامان میں سے ایک خیمہ نکالا جو برمانی اپنے ساتھ لایا تھا اور جس پر "پاکستان زندہ باد" لکھا ہوا تھا اور صرف اس مقصد کے لیے ساتھ لایا تھا کہ اگر کہیں ہنگامی کی ضرورت پڑے تو اسے استعمال میں لایا جائے... ورنہ وہ کوئی ایسا خیمہ نہ تھا جس میں کوئی خوددار شخص رات گزار سکے۔

میاں صاحب نے وہ خیمہ نصب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا نامرد تھا کہ ایستادہ ہونے سے انکاری ہو جاتا تھا۔ میخیں بھی پوری نہیں تھیں اور ستونوں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں اور میاں صاحب اسے زبردستی کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے تھے... میاں صاحب اس پر پتھر رکھ کر اسے قائم رکھنے کی سعی کر رہے تھے۔

"یہ تو ذرا سی ہوا کے چلنے سے اُڑ جائے گا میاں صاحب..."

"نہیں اُڑے گا تارڑ صاحب... میں نے بہت سارے پتھر رکھ دیے ہیں... اگر اُڑ بھی جاتا ہے تو اندر سونے والا بلاک تو نہیں ہو جائے گا... اس کے گرنے سے... آپ ذرا ملاحظہ کریں کہ اب بھی اس کے لیے میں ہی خیمہ لگا رہا ہوں اور یہ... یہ شاہد مزے سے بیٹھا مسکرائے جا رہا ہے میری ہیلپ نہیں کرتا۔"

میاں صاحب فُل فارم میں تھے۔

اُن سے بحث کرنا فضول تھا۔

بالآخر جب وہ خیمہ کچھ نیم ایستادہ سا ہو گیا تو شاہد کو اس میں دھکیل دیا گیا۔ شاہد اُس کے پردوں میں سے سر نکال کر ہمیں انتہائی حسرت سے دیکھنے لگا۔

برمانی کہنے لگے۔ "لگتا ہے شاہد صاحب سیلاب زدہ ہیں اور خیراتی خیمے میں پناہ لیے ہوئے امدادی کھانے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

شاہد نے حسبِ عادت اپنے چند بال نہایت اہتمام سے سنوارے... عینک اتاری اور چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہمیں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "جی سر... بڑا ظلم ہوا ہے سیلاب میں سب کچھ بہہ گیا ہے..."

اس سانحے کے دوران کے ٹو کی دونوں بہنیں اپنے زرد کمبے اوڑھ کر نیند میں چلی گئی تھیں۔ شائی چو میں ایک سرد دوا اتری اور ہم اپنی گرم بُکلوں میں تلاش کرنے لگے۔

کھانے کے بعد... جو بہت ہی واجبی کھانا تھا... ہم سب اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے... البتہ شاہد کا سر اس کے امدادی خیمے کے پردے میں سے نظر آتا رہا۔

شائی چو کی خیمہ گاہ اور ہم تو اس کے کناروں پر مقیم تھے... بارونق تھی... کہیں کہیں گیس لیمپ روشن تھے اور اجنبی زبانوں کے فقرے ہوا کے دوش پر تیرتے ہمارے کانوں تک آتے تھے اور ان میں ڈھول کی تھاپ بھی رک رک کر آتی تھی... جیسے کہ قبرستان کی رات میں بیرون گاؤں سے

ڈھول کی آواز پیچھے وادی میں رُک رُک کر اترتی ہے..

"کل ہم نے کس مقام پر پہنچنا ہے سلمان؟"

سلمان نے ایک کروٹ بدلی جو کسی بھونچال کی چھوٹی سی شبیہ تھی اور بولا "دل سنگ پا"

"کیا؟" عجب واہیات نام تھا اس ٹریک کے..

اس نے پھر دوہرایا..

"دل تنگ پا؟"

"نہیں سرجہاں دل اتنا تنگ نہیں.. یہ دل سنگ پا ہے جہاں ہم نے پہنچنا ہے اور اس کا مطلب ہے.. "پھولوں کے کھیت" .. کل ہم وہاں جائیں گے.."

"واہ" میں نے کہا..

تھکا ہوا تھا.. پھولوں کے کھیت کے خیال میں گم.. دھیرے دھیرے اس نیند میں اترنے لگا جسے میں کبھی ایک عارضی موت سے تشبیہ دیتا تھا لیکن اب.. اس عمر میں اس کی ہیشگی کے بھی امکانات تھے..

حسن صاحب ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگے.. وہ اتنے بلند نہ تھے کہ انہیں خیمہ بدر کر دیا جائے..

حیرت انگیز طور پر سلمان نہایت بے آواز سوتا تھا.. اور یہ ثابت کرتا تھا کہ صرف انسان خراٹے لیتے ہیں بھالو نہیں..

"مُجراان شائی جو.. بابا فلاکت زدہ اور رقص کرتے حسن صاحب"

ڈھول کی تھاپ مسلسل آتی تھی..

اور اس کے ہمراہ کچھ نامانوس گیت تھے جو سر د ہواؤں کے ساتھ سفر کرتے آتے تھے.. میں ابھی دوسرے سے آیا تھا چنانچہ ہوش سے نیند میں مدہوش ہونے کے مراحل میں کہیں چکر لے کر رہا تھا جب مجھے ایک مدھم سی آواز آئی۔ "تارڑ صاحب.. تارڑ صاحب.."

خیمے کے باہر کوئی تھا..

میں نے اسی نیم مدہوشی کے عالم میں کہا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں تارڑ.."

"کون تارڑ؟"

"نمبر ون شرف امان کا کزن.. جس نے آپ کے لیے "پاک سرائے" کے سفر کے لیے وادی اشکومن تک جیپوں کا بندوبست کیا تھا.. سوری تارڑ صاحب یُو سر.."

"یار مجھے اب جیپوں کی ضرورت نہیں.. تم یہاں کیسے آ گئے ہو..؟" میں نے بیزاری سے کہا۔

"صاحب مجھے تو ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ ادھر شائی جو میں پہنچے ہو.. میں اپنا گروپ لے کر ادھر کے دُور سے گندو گورو کے راستے ادھر اترا ہوں تو.. صاحب ادھر ہوٹل کے پاس سارے پورٹر لوگ اور گائیڈ لوگ مزا کرتے ہیں.. ڈھول بجاتے ہیں اور ناچتے ہیں تو ان کو بھی معلوم

نہیں اس کی اس بے بہار مسرت کا سبب کیا تھا.. اس کی خوشی کس منبع سے پھوٹتی تھی.. مسلسل حرکت کرتا.. ناچتا.. کبھی ڈھول والے کو داد دیتا اور کبھی بنسری نواز کی تال پر ناچتا.. میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اتنا خوش کیسے ہو سکتا ہے..

شاید اس لیے کہ میں جس گھٹے ہوئے بے روح معاشرے سے یہاں شمالی چوک تک آیا تھا، وہاں اتنی بے پناہ مسرت کا.. بلکہ بے جواز مسرت کا رواج نہ تھا..

ڈھول کی تھاپ شمالی چوک پر تیرتی اس کی ندیوں اور صنوبر کے درختوں کو ہماری طرح اندھا دھند پھلانگتی کے سکس اور کے سیون کی برفوں تک جاتی تھی.. عام پورٹر.. دریدہ دامنوں والے.. پھٹے پیوندوں والے.. پاؤں میں کینوس شوز جرابوں کے بغیر.. وہ بھی اپنے ساتھی پورٹروں کے رقص کرنے پر ان پر سے نوٹ بے دریغ نچھاور کر رہے تھے.. غربت میں بھی.. اتنا بڑا دل رکھنا اہل شمال کا خاصا ہے.. ایک غریب مزدور خون پسینے کی کمائی دل کی جیب سے نکال کر نہیں رکھتا.. شمالی چوک کی رات میں کسی وجیہی رقص پر لٹا دیتا ہے.. وہ کسی ایک نوٹ سے اپنے لیے ایک عمدہ بوٹ خرید سکتا ہے.. چند نوٹوں سے ایک گرم جیکٹ حاصل کر سکتا ہے لیکن وہ پھٹے ہوئے بوٹوں اور چیتھڑا جیکٹ میں رہ سکتا ہے.. اپنی مسرت کے اظہار کے طور پر اکھاڑے میں ناچتے کسی شخص پر نوٹ پھینکنے سے نہیں رہ سکتا..

میں نے کہیں پہلے بھی لکھا ہے کہ اہل شمال میں رقص کی ایسی جنس ہے ان کے بدن میں ایک ایسی ردھم ہے جو بقیہ پاکستان میں کم کم ہی پائی جاتی ہے اور ان کے رقص میں کہیں بھی نسوانیت کی لچک کا رنگ نہیں ملتا.. انہیں دیکھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ رقص تو صرف مردوں کے کرنے کی چیز ہے اور عورتوں کو اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیے..

مسلسل تالیاں بجانے والے اور مسلسل مسکرانے والے شخص نے زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھے ہوئے ایک باباجی سے درخواست کی کہ وہ میدان میں آئیں.. باباجی نے کچھ دھیان نہ دیا.. ان سے پھر گزارش کی گئی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے بالآخر ان کی منت سماجت کی گئی اور اس کے ساتھ شائقین نے بھرپور تالیاں بجا کر انہیں مجبور کر دیا کہ وہ میدان میں اتر آئیں..

یہ باباجی نہایت فلاکت زدہ تھے..

پھٹے پرانے کپڑوں میں تھے.. بھوری آرمی جیکٹ کی سب جیبوں کی زبانیں لٹک رہی تھیں۔ کسی گورے کی عطا کردہ پتلون جو پاجامہ ہو چکی تھی، باباجی کے گھٹنوں کی نمائش کرتی تھی.. ان کی میلی جیکٹ اونی ٹوپی میں بھی سوراخ تھے.. یہاں تک کہ ان کے دانت بھی پورے نہ تھے.. لیکن جب وہ اٹھے تو کل خلق نے نعروں اور تالیوں سے شمالی چوک کا آسمان جو بلندی کی وجہ سے نیچے آ چکا تھا اسے سر پر اٹھا لیا.. وہ کسی نہ کسی فن میں کوئی نہ کوئی کمال تو رکھتے تھے..

بابا فلاکت زدہ نے نہایت سنجیدگی سے اپنے اعزاز میں پیٹی جانے والی تالیوں کا جھک کر شکریہ ادا کیا جیسے وہ ایسے استقبال کے عادی تھے.. انہوں نے دو چھوٹے چھوٹے طبلہ نما ڈھول جو شاید انہوں نے خود بنائے تھے، اپنے سامنے رکھے اور شہتوت کی دو چھڑیوں سے انہیں جل ترنگ کی مانند بجانے لگے.. ان پر ایک خاص لے میں ضرب دینے لگے.. اور تالیوں میں مزید اضافہ اور تحسین کے نعرے.. اور پھر منہ کھول کر.. اتنا منہ کھول کر کہ ان کے بقیہ ماندہ.. اور جو چیدہ چیدہ دانت تھے دیکھے جا سکتے تھے.. گانے لگے.. اب جو بابا فلاکت زدہ نے پہلی تان اٹھائی ہے تو غدر مچ گیا.. یوں جیسے ام کلثوم سٹیج پر آ گئی ہو.. نور جہاں نے "آواز دے کہاں ہے.." شروع کر دیا ہو اور مہدی حسن نے "گلوں میں رنگ بھرے" چھیڑ دیا ہو.. ایسے غدر مچ گیا..

میرے برابر میں بیٹھے ایک باریش بزرگ جو اگر سبز چوغہ زیب تن کر کے لاہور کے کسی پاش علاقے میں دھرنا مار کر بیٹھ جاتے تو پیر سائیں ہو جاتے اور معتقدین ان کے پاؤں دھو دھو کر پیتے.. بقیہ ناظرین کی مانند مسلسل تالیاں پیٹنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر بابا فلاکت زدہ کا استقبال کیا.. وہ موسیقی اور اس کی تال سے اتنے سرکش اور مسرت ہو رہے تھے کہ دوران گفتگو میں نے پوچھ ہی لیا.. اور اسی لیے پوچھ لیا کہ اتنی سرمستی اور بے خودی تو نشے کی کسی بند بوتل کو کھول کر ایک ہی سانس میں چڑھا جانے کے بعد ہی ممکن ہوتی ہے کہ.. بزرگو آپ ٹن ہو؟

بزرگوں نے پہلے تو میرے لاہوری محاورے "ٹن" کی رمز نہ پالی اور جب میں نے ذرا کھول کر بیان کیا تو انہوں نے اپنی ہتھیلیوں کو تالیاں پیٹنے سے لمحہ بھر کے لیے فارغ کیا اور انہیں ریش مبارک پر پھیرتے ہوئے بولے "نہیں تارڑ صاحب.. اب تو نہیں.. اب تو میں نے حج کر لیا ہے۔"

"اور جب آپ نے حج نہیں کیا تھا تو.."

"رات گئی بات گئی۔" حاجی بابا ہنس کر بولے۔ "جوانی میں تو سب چلتا ہے.. اب تائب ہو چکا ہوں۔"

"تو بزرگو یہ بے حساب سرخوشی اور سرمستی ابھی تک کیسے قائم ہے؟"

"یہ تو ایامِ جاہلیت میں جو شمار ہوتے تھے ان کا اثر ابھی تک چلا آتا ہے۔"

میں نے نوٹ کیا کہ بابا فلاکت زدہ پر بھی نوٹ نچھاور کیے جا رہے ہیں.. کبھی کوئی چاہنے والا ان پر نوٹ وار کے ہوا میں اچھالتا تھا اور کبھی کوئی سنجیدہ شوقین ان کے ڈھول کے نیچے چپکے سے کچھ رقم رکھ آتا تھا.. بابا فلاکت زدہ البتہ اپنی دیوانگی میں بھی ہوشیار تھے اور ان نوٹوں کو سمیٹ کر اپنی جیکٹ کی جیب میں اچھی طرح سنبھال لیتے تھے.. اور کسی ایک نوٹ کو بھی آگے پیچھے نہیں ہونے دیتے تھے..

بابا ام کلثوم عام طور پر بلتی لوک گیت گا کر داد وصول کرتے تھے لیکن کبھی کبھی کوئی پاپولر فلمی گیت شروع کر کے اسے بلتی کا ری مکس بنا دیتے تھے.. جیسے "جن میرے کمزن" کو اپنے حساب کتاب سے ری مکس کر لیا گیا ہے.. چنانچہ ایک گیت.. آپ یقین کریں یا نہ کریں.. "بچہ بادرا" کا "بچپن کی محبت کو دل سے نہ جدا کرنا" سے شروع ہوا اور اس کے بعد اس کا بلتی ترجمہ پیش کیا جانے لگا۔ پھر جانے کہاں سے "ویر میرا گھوڑی چڑھیا" آ گیا اور ویر صاحب اور جس گھوڑی پر وہ چڑھے تھے بلتی زبان میں منتقل ہو گئے.. دھن وہی جاری رہتی لیکن زبان بدل جاتی.. "شہباز قلندر" کی بھی باری آئی اور وہ بھی بلتستان میں دھمال ڈالنے لگے..

میں نے پائیو میں ریشماں کے "وے میں چوری چوری" کا بلتی ری مکس بھی سنا تھا..

بابا فلاکت زدہ کہیں بلند پہاڑوں میں.. کہیں شاہی چوک میں ایک پاپ سٹار تھے.. لیکن یہ حقیقت تھی کہ بابا فلاکت زدہ ایک ان پڑھ اور عام پہاڑی پورٹر ہونے کے باوجود ردھم میں تھے.. جڑواں طبلہ نما چھوٹے چھوٹے ڈھولوں کو شہادت کی انگلیوں سے جل ترنگ کی طرح بجاتے سب سُر میں ہوتے تھے نہ صرف یہ کہ ان کی پھٹی ہوئی جیکٹ کی جیبیں نوٹوں سے ٹھنسی پڑی تھیں بلکہ ان کی سوراخ زدہ اونی ٹوپی میں بھی کئی نوٹ اڑسے ہوئے تھے..

ویسے.. یہ بھی حقیقت ہے کہ جیسے وہ مگن ہو کر ڈوب کر گا رہے تھے، میں نے صرف پٹھانے خان کو "میرا عشق وی توں" گاتے ہوئے دیکھا تھا..

حسن صاحب دھڑا دھڑ تصویریں اتار رہے تھے..

سلمان ایک بھدی سی اونی ٹوپی میں تالیاں بجا رہا تھا..

اور میاں صاحب نے اپنی آنکھ مووی کیمرے کے ویو فائنڈر سے ایک لمحے کے لیے بھی جدا نہ کی تھی..

حسن کے کیمرے میں فلم ختم ہو گئی تو وہ ہانپتا ہوا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور چونکہ وہ مقامی پانی نہیں پیتا تھا اپنے معدے کا خیال رکھتا تھا اس لیے ہر وقت اپنے بیگ میں منرل واٹر کی ایک بوتل سنبھالے پھرتا تھا۔ کہنے لگا "سر جی.. میں نے آج شام نوٹ کیا تھا کہ آپ خیموں کے نزدیک جو ندی ہے اس میں سے اپنی اوک بھر بھر کر پانی پی رہے تھے تو سر جی.. یہاں آلودگی بہت ہے۔ آپ کا پیٹ یقیناً خراب ہو جائے گا۔ اس لیے اس منرل واٹر کے چند گھونٹ بھر لیجیے۔"

میں نے بھر لیے..

"سر جی اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی اس اکھاڑے میں کود پڑوں اور بھالو ناچ کا مظاہرہ کروں؟" یہ سلمان ہی ہو سکتا تھا..

"کیسے؟"

"ایسے.." اس نے پھر اپنے ہاتھ اوپر کر کے ہتھیلیاں نیچے کر دیں اور منہ کھول کر بھالوؤں کی مانند ہانپنے لگا..

"نہیں.." مجھے اپنی ہنسی ضبط کرنے میں بہت دشواری ہوئی.. سلمان اتنا فربہ نہ تھا جتنا کہ وہ اپنے آپ کو.. اپنی فربہی کا مذاق اڑاتا تھا..

اور تب قادر میدان میں آیا.. پہلے میرے سامنے جھک جھک کر آداب بجا لاتا سلام کرتا آیا اور پھر کسی جنوبی ہندوستان کی رقاصہ کی مانند ناچتا.. ہاتھ بلند کر کے گردن دائیں بائیں جھٹکاتا.. کمر مٹکاتا میدان میں آیا..

قادر کے سٹیج پر آنے پر بھی ایک مرتبہ پھر شور برپا ہو گیا.. اس کے رقص کے انداز میں کبھی ونجنتی مالا دکھائی دیتی اور کبھی وحیدہ رحمان کا رنگ نظر آتا.. اور کبھی تو وہ امراؤ جان ادا ہو جاتا.. جس نے آوارگی میں زمانے کی سیر کی تھی..

"سر جی.." سلمان نے چپکے سے اپنا بٹوہ کھول کر اس میں سے کچھ نوٹ برآمد کیے اور چپکے سے مجھے تھما دیے.. "لاہوریوں کی عزت بے عزتی کا سوال ہے.. آپ بھی ذرا ویل دینی شروع کر دیں.. قادر پر کچھ نوٹ لگا دیں.. بہت ضروری ہے۔"

چونکہ نوٹ سلمان کے تھے اس لیے میں بھی بے دریغ اٹھا اور اکھاڑے میں جا کر چند نوٹ حسب دستور قادر کے تھرکتے قدموں میں ڈالے.. کچھ اس کے سر پر وارے اور بقیہ ہوا میں اچھال کر واپس ہونے کو تھا کہ شاہی چوک کی اس ونجنتی مالا یعنی قادر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نادر صاحب.. رُک جائیں۔"

اب میں وہاں رُکا ہوا تو حسن اور سلمان بھی میری مدد کے لیے میدان میں آ گئے اور اپنی اپنی اوقات کے مطابق.. ایک بڑے ڈھول کی تال پر.. ایک شہنائی کی لے پر.. بابا فلاکت زدہ کی تانوں پر.. ماہر اس کے ہمراہ ان ڈھولوں کی ردھم پر.. جھومنے لگے..

ہم تینوں کا استقبال.. نادر اور بابا فلاکت زدہ کی میدان میں آمد سے کم نہ تھا.. یوں نعرے لگائے گئے.. تالیوں کا شور اٹھا جیسے ہم سب ابا را ناچتے ہوں.. حالانکہ مجھ میں رقص کی کوئی رمق باقی نہ تھی۔ چالیس برس پیشتر جو میرے قدموں میں اعتدال تھا وہ شل ہو چکا تھا.. اور میرا وجود.. وہ چند قدم اٹھانے سے بے وجود ہو جاتا تھا اور ہانپنے لگتا تھا..

حسن صاحب ہاتھ فضا میں بلند کئے ایک چترالی ٹوپی میں.. کسی ازلی انجانی ردھم پر رقص کرتے تھے جو کہیں اور تو نہیں شاید کرشن کنہیا اور ہیر کہیں رانجھے کی اور سلمان.. جوانی کے خمار میں تھا.. یہ خمار ہی دنیا کی سب سے بڑی ردھم تھا.. اس عمر میں تو جو قدم اٹھتا ہے گرم خون کی گردش میں آیا ہوا سرمستی اٹھتا ہے.. اور یوں بھی وہ اس ٹریک پر آنے سے چند روز پیشتر نکاح شدہ ہوا تھا اور ایک مخمور ردھم میں رقص کرتا تھا.. اس نے ناچتے ناچتے میرے قریب ہو کر کہا.. "سر جی میں بھالو بن کر دکھاؤں؟" میں اور سلمان تو اپنی ڈیوٹی دے کر فوراً واپس آ گئے.. اور ہاں مجھ پر بھی کچھ نوٹ.. جو زیادہ تر نادر کی جیب میں سے برآمد ہوئے تھے، نچھاور کیے گئے.. لیکن حسن صاحب اپنی سرمستی میں مست الست رہے اور ناچتے رہے..

اور وہ اس شب بابا فلاکت زدہ کے ہمراہ سٹار آف دی ایوننگ تھے.. ان کی چترالی ٹوپی میں سو سو کے متعدد نوٹ بہار دکھا رہے تھے اور یہ ان کے متعدد مداحین نے ناچتے ہوئے ان کی ٹوپی میں اڑسے تھے..

بابا فلاکت زدہ اب حسن کو قدرے ناپسند کر رہے تھے کیونکہ وہ ان کے نوٹوں میں شریک ہو گئے تھے..

اس لیے مجھے ایک نادر خیال آیا کہ اگر کبھی ٹیم کی مالی حالت بالکل دگرگوں ہو جاتی ہے.. کیش کم ہو جاتا ہے تو ہم اس کیش کی کمی کو پورا کرنے کے لیے آسانی سے حسن صاحب کو نچا سکتے ہیں..

اس رات میں.. شنائی نچو کی اس رات میں.. ایک لمحہ آیا..

ایسا لمحہ جب یکدم میں اس منظر، اس مقام اور اس رات سے الگ ہو گیا..

آوازیں.. بولیاں.. ڈھول کی تھاپ.. بابا فلاکت زدہ کی آواز سب کے سب معدوم ہو گئے.. ایک مکمل غیب کا سناٹا چھا گیا جس میں وہ تمام.. بابا فلاکت زدہ اور مرزا نادر کا نچیو اور ہم سب تو تھے کوئی آواز نہ تھی.. جیسے ایک خاموش فلم چل رہی ہو.. اس سناٹے میں.. میں تنہا تھا.. میرا آس پاس خالی ہو گیا.. صرف میں تھا جو ایک بنچ پر بیٹھا اس رات میں تنہا اور خاموشی میں تھا.. اور اس چپ میں سے ایک آواز آئی "تم کہاں ہو؟"

"پتہ نہیں.."

"تم شنائی نچو میں ہو.."

"ہانگ نچو میں؟"

"نہیں.. تم وہاں نہیں ہو جہاں چینگ کی بتلی تھی.. وارث شاہ کی بچی پکنے دی تھی.. یہ تو ہوشے سے آگے ایک مقام ہے جس کا نام تمہیں یاد نہیں رہتا.."

"یہ اچھا ہے کہ مجھے مقام یاد نہیں رہتے.. صرف کیفیت یاد رہتی ہے.. ایک گوشۂ بے خودی کے اس رات میں کیا فرق پڑتا ہے کہ انسان کہاں ہے۔"

"فرق پڑتا ہے.. آج شب جب تم خیمے میں اپنے پہلے دن کی مشقت کے بعد بے سدھ پڑے تھے تو تمہارے خیمے کے پردے کے پار.. بالکل سامنے.. K1 اور K2 کی چوٹیاں جب غروب کی کرنوں میں زرد ہو رہی تھیں تو تم بے سدھ پڑے تھے اور تم نہیں جانتے تھے کہ ان چوٹیوں پر سونا پگھل رہا ہے.."

"میں اتنا بے سدھ بھی نہیں تھا.. میں جانتا تھا کہ وہاں تجلّا کچھ ہیں اور باز بند کھلتے ہو رہے ہیں.. میرے اندر بھی تو ایک سونے کی شہزادی تھی جو کبھی پگھلتی تھی اور کبھی شاہ گوری کی برف کی مانند منجمد ہو جاتی تھی.. میں اتنا بے سدھ نہیں تھا۔"

"سنو.. تم نصیب والے ہو کہ ابھی تک سدھ بدھ میں ہو.. تم میں ابھی تک اتنی شکتی ہے کہ تم شنائی نچو تک پہنچ جاتے ہو.. اپنے رب کا شکر ادا کرو.."

مجھ میں.. میرے بدن میں تھرانے کی ایک عجیب سنسناہٹ نے جنم لیا اور پھر یکدم اس خاموش سناٹے میں بے پناہ تالیوں اور ڈھول کی آواز نے ایک ایسی دراڑ ڈالی کہ میں پھر سے شب شنائی نچو میں تھا..

ندیاں اُبھرنے اور پتھروں کے وہ ہمارے انداز میں جھک جھک جائیں گے.. ندی نالے تھم جائیں گے اور کہیں گے.. بہت کچھ تو رہتی آپ نے یہاں قدم رنجہ فرمایا.. ہم اتنی مدت سے آپ ہی کے منتظر تھے.. اور یہ تیسرا اوچھی پوں لگا کر اوپر سے ندیاں نہیں بلکہ سینکڑوں فیری کوئی وفود دھڑا دھڑ اُترتے آتے تھے.. ایک بے قابو ریوڑ کی مانند یلغار کرتے آتے چلے جاتے تھے.. ہمیں ان کو راستہ دینے کے لیے رکنا پڑتا ورنہ وہ ہمیں روند کر اُتر جاتے.. پہلے پہل تو ہم بے حد خوش مزاجی سے انہیں گڈ مارننگ وغیرہ کہتے لیکن ان میں سے اکثر ہمیں لفٹ نہ کرواتے اور ہمیں راستے کے پتھر جان کر چلاتے جاتے.. کوئی ایک آدھ خوش اخلاق ہوتا تو جواب میں گڈ مارننگ وغیرہ بڑبڑا دیتا ایسے جیسے ہم پر احسان کر رہا ہو.. وہ ہمیں باقاعدہ دھکیلتے ہوئے گزر جاتے..

ان گورا لوگوں نے ہماری انا کو شدید طور پر مجروح کیا..

وطن ہمارا تھا اور دندناتے یہ پھرتے تھے..

یہ مایہ دار راستہ اختتام کو پہنچا تو آگے ایک پتھروں سے بھرا میدان تھا.. کنکورڈیا گلیشیئر کے دامن میں.. گلیشیئر اب نظر نہیں آتا تھا کیونکہ ہم اس کے دامن میں تھے.. بلکہ میں اس کے دامن میں تھا کیونکہ فیری کوئی وفود کی یلغار نے ہمارے دامن کا ستیاناس کر دیا تھا اور ہم تتر بتر ہو چکے تھے.. پرمانی کا بے مہار شتر پورٹروں کے ہمراہ کہیں آگے جا چکا تھا اور جب میں نے اسے ایک بار ٹوکا تھا کہ وہ ذرا آہستہ خرام ہو جائے اور بقیہ ٹیم کے ہمراہ خراماں خراماں چلے تو اس نے اپنے دفاع میں یہ دلیل دی تھی کہ "تارڑ صاحب یہ میری قدرتی چال ہے.. اگر میں اپنے آپ کو روک کر چلتا ہوں، رک رک کر چلتا ہوں تو پھر میں یکدم تھک جاؤں گا.. مجھے یونہی بے مہار چلنے کی اجازت دیجیے.."

"اجازت ہے.." میں نے مغلِ اعظم کے انداز میں ایک گہری گونج دار آواز بناتے ہوئے کہا تھا..

پہاڑوں میں.. کسی بلند پہاڑوں میں وہاں جانا جس کا نام آپ جانتے ہوں، مشکل ہوتا ہے..

اور پہاڑوں میں وہاں جانا جس کا نام آپ نہ جانتے ہوں، بہت مشکل ہوتا ہے..

پتھروں کے انبار پھلانگنے کے بعد ایک بہت وسیع میدان سامنے آیا.. ریتلا اور خشک.. کہیں کہیں سوکھی ندیوں کی گزرگاہیں تھیں.. دائیں ہاتھ پر کچھ فاصلے پر جو چٹانیں تھیں، ان کی آغوش میں

سے ایک خشک ہو چکے نالے کے پتھر پورے فاصلے میں پھیلے تھے..

چند پتھر نیلے گھر بھی دکھائی دے رہے تھے..

دراصل یہ کنکورڈیا تھا..

کیسے تھا؟

کنکورڈیا تو ابھی دو روز کی مسافت پر تھا تو یہ کنکورڈیا کہاں سے آ گیا..

یہ ایسے تھا کہ گئے زمانوں میں.. یہ میدان اور چراگاہ ہی کنکورڈیا کہلاتے تھے اور یہاں سے اوپر دو دن کی مسافت پر جو ایک درہ تھا اس کا کوئی نام نہ تھا کہ وہ شمال کے دروں میں کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا..

اور جب وہ درہ اہم ہو گیا تو اس کا نام اس چراگاہ کے حوالے سے کنکورڈیا رکھ دیا گیا.. اس لیے یہی اصلی اور بڑا کنکورڈیا تھا جسے میں نے بمشکل طے کیا کیونکہ یہاں کوئی سایہ نہ تھا.. کڑی دھوپ کا سفر تھا اور یہ میدان ختم ہونے میں نہ آتا تھا..

کل دو بجے سے شانی چھونک کے سفر میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی تھی کیونکہ راستہ تقریباً ہموار تھا اور ہر صبح ماڈل ٹاؤن پارک کے ٹریک پر چھ کلومیٹر چلنا میرا معمول تھا.. لیکن آج شروع سے ہی چڑھائی کا سامنا ہو گیا اور چند قدم اٹھانے کے بعد ہی میرا دم درہم ہو گیا.. ظاہر ہے ایک بنیاد پرست مسلمان ہونے کے ناطے سے میں یقین جانتا تھا کہ دم کیسے نکلتا ہے.. جیسے بھی نکلتا تھا بس ویسے ہی ہوتا ہو گا جیسے چڑھائی چڑھتے ہوئے آس پاس نہیں ہوتا تھا..

میں اپنی جوانی کے اس برس میں.. جو پچھلے برس سے ایک برس زیادہ تھا.. اور میں اس پچھلے ایک برس میں چہرہ مزید زوال پذیر ہوا تھا.. مجھ میں ہمت کم ہوئی تھی اور چہرے پر کم از کم ایک جھری کا اضافہ ہوا تھا تو میں اپنے اندر ایک جھجک رکھتا تھا کہ کیا پتہ کبھی وہ آخری برس ہو جب مجھ سے ہمت چھن جائے.. میں ایک ایسا قدم اٹھاؤں جو اُٹھ نہ سکے اور میری کوہ نوردیوں کا اختتام ہو جائے.. لیکن اس برس بھی کہیں نہ کہیں وہ ہمت موجود تھی.. میں اسے ہمت مرداں تو نہیں کہوں گا کیونکہ مردانگی کے محض چند برس ہوتے ہیں، اس کے بعد پشیمانی شروع ہو جاتی ہے..

اگرچہ چڑھائی چڑھتے ہوئے برا حال ہو گیا تھا لیکن اب وہ راستہ خاموش تھا اور مجھے چلنے میں دقت نہیں ہو رہی تھی..

البتہ میاں صاحب کے ٹخنے میں موچ آ گئی تھی اور وہ اس پر ایک پٹی باندھ کر قدرے

"آسان ہے آ جاؤ... ہم پکڑ لیں گے آ جاؤ۔"

"اور اگر گر گیا تو..."

"وہ تو اللہ کی مرضی ہے..."

میں پھر سے حساب کتاب لگانے لگا کہ کیا کروں.. چھلانگ لگاؤں یا نہ لگاؤں.. اگر اس کا پاؤں میرے ہاتھ کی گرفت میں نہیں آتا تو کیا یا اتفاقی اور روانی کی شدت والے پانیوں میں سے اچھال لے گی..

یقینی طور پر نہیں اچھال لے گی، چاہے یہ مجھ سے کتنی ہی محبت کیوں نہ کرتی ہو کیونکہ میں ابلتی ہوئی میں کہیں کا کہیں بہہ جاؤں گا.. گلگت اور کشمیر میں اتر جاؤں گا... میں تو دریا ہوں، سمندر میں اتر جاؤں گا..

اس حساب کتاب اور غور و خوض کے دوران ایک مسئلہ ہوا کہ اس پتھر پر کھڑے کھڑے رہنے کی دہشت اور چھلانگ کے خوف سے میری ٹانگیں لرزنے لگیں... میرے قابو میں نہ رہیں.. اب اگر میں فوری طور پر چھلانگ نہیں لگاتا تو ٹانگیں ویسے طور پر یوں بھی ڈھے کر غرق ہو جاتا ہوں چنانچہ میں نے مجبوراً چھلانگ لگا دی.. لیکن اللہ اللہ کرتے ہوئے..

شمالی علاقوں میں کوہ نوردی کا ایک روحانی پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ اللہ کرنے کے مواقع اکثر و بیشتر ملتے رہتے ہیں اور انسان پارسا ہو جاتا ہے لیکن صرف چند دنوں کے لیے... وہ دن گزر جاتے ہیں تو پھر سے رند ہو جاتا ہے کہ یہی حضرت انسان کی خصلت ہے..

بہرحال یہ عارضی پارسائی میرے کام آئی اور دوسرے پتھر پر کھڑے پورٹر کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا، میرے جوگر کے پتھر پر اگرچہ پھسلے اور یہ ثابت ہو گیا کہ اگر میں اپنی بہادری کے زعم میں یہاں خود سے چھلانگ لگا دیتا تو منزل اور دور رفت تھی.. پورٹر میری اس حرکت سے ناراض ہو چکا تھا اور اسے آج کی تنخواہ بھی چاہیے تھی کہ اس نے مجھے شکر گزار ہونے کا موقع بھی نہ دیا اور فوراً عازم سفر ہو گیا..

"موت چٹانوں کی صورت ہمارے سروں پر معلق تھی"

میں بھی دوسرے کنارے پر پہنچ کر دوپہر کیا اور چند منٹ کے لیے پھر عازم سفر ہوا تھا کہ میں نے سامنے ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں چند جھاڑیوں کے تھوڑے سایے میں ایک شکر دوپہر میں اپنے سامان کو منتظر دیکھا.. پورٹروں کے بے حد دوستانہ رویے اور ان میں ایک پتھر سے ٹیک لگائے ہوئے برمانی کو دیکھ کر دل ہی دل میں گھبرائے اور اس کے علاوہ بہت بڑ کھجاتے دیکھا..

لیکن ہم پر کیا بات گزر رہی ہے اور یہ لوگ یہاں جنت کے مزے اڑاتے ہیں..

میں نے اپنی اس کوہ نوردی کے دوران پہلی بار اپنے بلڈ پریشر کو بلند ہو جانے دیا اور ان پر برس پڑا.. پہلے پورٹروں پر برسا "شانی پیچھے سے چلتے ہوئے میں نے سب کو بتایا تھا کہ راستے میں جہاں کہیں بھی دشواری ہو گی آپ لوگوں نے ٹھہرنا ہے.. ہماری مدد کے لیے رکنا ہے.. اگر راستے میں کوئی دشوار مقام ہے تو وہاں ہمارا انتظار کرنا ہے... کیوں نہیں کیا؟"

پورٹروں میں ایک ایسا حسن تھا جسے بے شک پیاسا ہو پھر بھی کبھی پانی نہیں دینا چاہیے تھا۔ یہ ایسا حسن تھا۔ یہ وہی حسن تھا جو دیکھنے میں نہایت مسکین اور درخواست گزار تھا اور بے مدمت حاجت سے ہماری ٹیم میں شامل ہوا تھا.. کہ صاحب ہم پورٹر بھی ہوں گا اور آپ کا باورچی بھی.. ہم کو ساتھ لے جاؤ.. ہم نے آپ کے لاہور میں چینی، جاپانی اور پاکستانی ریستورانوں میں باورچی کا کام کیا ہے.. آپ کو یہ سب کھانا تیار کر کے کھلائے گا.. اور پورٹر بھی ہو گا ہمیں ساتھ لے چلو...

لیکن یہاں وہ کوئی اور حسن تھا.. باغی ہو گیا تھا اور مجھے ایک ٹوٹے کی چشم حقارت سے دیکھتا ہوا کام کر رہا تھا.. کیوں؟

صرف اس لیے کہ کاندے کا اسحاق بھی ہمارے ہمراہ تھا۔ یہ اسحاق شروع میں تو نہایت شوخا اور بدتمیز تھا۔ نہایت پھرتی سے گفتگو کرتا تھا اور بے حد فرینک ہو رہا تھا۔ پھر میں نے اسے فوری طور پر فارغ کر کے ہوسٹے واپس بھیجنے کی دھمکی دے کر سیدھا کر لیا تھا۔ یہ اسحاق بھی کسی حد تک باورچی تھا اور حسین چونکہ ہوسٹے کا تھا اس کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا کہ ان کے کچن ٹینٹ میں کاندے کے کسی باورچی کا عمل دخل ہو۔ اس نے آج صبح یہ انکشاف کر دیا تھا کہ صاحب ایک تو آپ نے کل رات مجھے ہوسٹے چاول کھلائے۔ اور یہ ہوسٹے چاول کچن پلاؤ تھا۔ اور دوسرے یہ اسحاق اُدھر کچن ٹینٹ میں کیوں آتا ہے۔ تو میں نے ایک نہایت خوشامدانہ تقریر کی تھی کہ حسین بھائی ہم تم سے معافی مانگتا ہوں کہ پچھلی شب تمہیں ہوسٹے چاول کھانے کو ملے۔ آئندہ تم پہلے کھاؤ گے اور پھر ہم۔ اور جہاں تک اسحاق کا سوال ہے تو یہ شخص ایک پورٹر ہے۔ ٹیم کے سرکاری باورچی تم ہو لیکن۔ اسے اپنے ساتھ مدد کے لیے رکھو تو کیا حرج ہے۔

حسین کو یہ بھی گوارا نہ تھا اور اس کی عزت نفس اتنی مجروح ہو رہی تھی کہ مجھے کسی بھی پہاڑی نالے کے پانیوں میں ڈوبتے دیکھتا تو مسرت سے تالیاں بجاتا۔

تو یہی حسین۔ ایک مجروح اور آنکھیں بدل لینے والا حسین کہتا ہے۔" صاحب ہمارا کو بڑا دھوکہ ہے۔ آپ کا مدد کرنا نہیں ہے۔" اور وہ بدستور ایک پتھر سے ٹیک لگائے مکمل بے حسی سے بیٹھا رہا۔

میرا بلڈ پریشر تمام حدود عبور کر گیا اور مجھے حیرت ہے کہ اس نے میرے دماغ کی کوئی رگ کیوں نہ پھٹ گئی۔

میں نے اس نے یہ محسوس کیا کہ فوری طور پر کاندے کے پورٹرز ادھ سادہ اور ہمدرد تھے جب کہ ہوسٹے سے جتنے بھی پورٹر بھرتی کیے گئے وہ قدرے اوباش اور بیگانے تھے۔ کاندے والوں کی بے پناہ مدد نے ان کا دماغ خراب کر دیا تھا۔

"برانی۔" حسین پر جب کچھ اثر نہیں ہوا تو میں ڈاکٹر پر حملہ آور ہو گیا۔ "تم ان پورٹروں کے ساتھ تھے۔ میرے منع کرنے کے باوجود تم نہیں ٹھہرے اور آگے نکل گئے تھے تو تم نے اس نالے کے کنارے باقی ساتھیوں کا انتظار کیوں نہیں کیا۔"

برانی پہلی بار مجھے اس حالت غضب میں دیکھ رہا تھا۔ "سر۔ میں نے حسین کو کہا تھا کہ یہ نالہ خطرناک ہے۔ لوگ مدد کے بغیر اس کو پار نہیں کر سکتے۔ تم یہاں ٹھہرو۔ لیکن یہ وہاں

نہیں ٹھہرے۔ کہتے تھے جب ٹیم ادھر تک آئے گی تو ہم پھر آ جائیں گے۔ اور یہ یہاں آ کر لیٹ گئے۔"

"اور پھر تم بھی بھول گئے کہ کچھ لوگ پیچھے ابھی اس نالے کو پار کریں گے اور اسے دیکھ کر اپنی جان کو روئیں گے کہ پار اترنا ممکن نہ ہوگا۔ یہ لوگ اگر یہاں آ کر لیٹ گئے تھے تو تم بھی کیوں لیٹ گئے تھے۔ تمہارا فرض تھا کہ تم وہاں رک کر ہمارا انتظار کرتے۔ ڈیم اٹ برانی میں مرتے مرتے بچا ہوں۔ اگر نیرتی کی وہاں نہ آ جاتی تو میں ابھی تک یا تو دوسرے کنارے پر بیٹھا اپنی قسمت کو رو رہا ہوتا یا ڈوب چکا ہوتا۔"

"آپ کی نیرتی؟" برانی ڈاکٹر تھا۔ جان گیا کہ میرا بلڈ پریشر کے نوٹ سے بھی اونچا ہو چکا ہے۔ اور میرے دماغی خلیوں میں کھلبلی مچ چکی ہے۔ "میں آپ کو خود پار اتارتا ہوں۔"

"تم موضوع بدلنے کی کوشش مت کرو برانی۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اس نالے کو ایک نیرتی کے سہارے کے بغیر پار کر سکتا تھا۔"

"ہرگز نہیں تارڑ صاحب۔"

"تو پھر مجھے میرا منہ کیا دیکھتے ہو۔ پورٹروں کو ساتھ لے کر فوراً نالے کے نیچے پہنچو۔ بقیہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔"

"ویسے تارڑ صاحب آپ نے کمال کر دیا۔ سب سے پہلے پہنچ گئے۔"

"میری خوشامد کر رہے ہو؟" میں نے چمک کر کہا۔ "مجھے الو کا پٹھا سمجھتے ہو؟"

"بالکل نہیں۔"

برانی نے نہایت تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اپنی بلوتی رنگ کی ٹوپی جھٹک کر ٹھیک کی اور پورٹروں کو اکٹھا کر کے نالے کی جانب چلا گیا۔

مجھے نگیر، خوش دل، راحت اور صد پارہ کے علی جیسے پورٹر یاد آنے لگے جو بھائیوں کی طرح ہمارا خیال رکھتے تھے۔ کہیں کوئی راستہ ذرا خطرناک نشان رکھتا تھا تو ٹھہر جاتے تھے۔ کہ صاحب لوگ آ جائیں تو مشکل نہ ہو۔ کوئی نالہ آتا تھا تو مجھے اپنے ہاتھ کا سہارا دیتے تھے اور اپنے کندھوں پر اٹھا کر پار لے جاتے تھے۔ شام ہوتی تھی تو ہمارے بدن دباتے ہماری تھکاوٹ اتارتے تھے اور پھر الاؤ کے گرد رقص کرتے گیت گاتے ہوئے دوستوں سے بڑھ کر دوست ہوا کرتے تھے۔ اور کسی بھی معاوضے یا لالچ سے بے نیاز ہو کر۔ ایک مخلص اور شاندار انسان کی صورت میں۔

ہر کوہ نوردی کی مہم میں جو پورٹرز ہائر کیے جاتے ہیں، ان میں بقول منیر نیازی کچھ خبیث
روحیں ہوتی ہیں اور کچھ طیب..

پورٹروں میں بھی یہی دو قسمیں پائی جاتی ہیں..

ابھی تک تو ہمیں خبیث روحوں سے پالا پڑا تھا.. لیکن وزنہ گنڈوگورو کے بیس کیمپ تک
پہنچتے پہنچتے دو تین طیب پورٹرز بھی ظاہر ہو گئے..

جب میری بقیہ ٹیم.. برفانی اور پورٹروں کی مدد سے نالے کے پار ہوئی اور وہ سب مجھ
تک پہنچے تو میرا بلڈ پریشر کے ٹو سے اتر کر میدانی علاقے کی سطح پر تو نہیں البتہ نانگا پربت... جو دنیا
کی نویں بلند ترین چوٹی ہے.. وہاں تک اتر چکا تھا..

ہم نے بڑے پتھر کے سائے میں خوراک کے نام پر کچھ زہر مار کیا اور کچھ دیر اونگھتے
ہوئے آرام کیا..

اس بڑے پتھر کے برابر میں.. ایک بلند کنارہ تھا تو اس کے نیچے گنڈوگورو کا گلیشیر
کروٹیں بدلتا تھا.. اور اس کی برفوں سے جدا ہو کر جو پتھر پاتال میں گرتے تھے، ان کی آواز ہم
تک پہنچتی تھی اور لگتا تھا کہ ہم ایک بڑبڑاتے ہوئے آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہیں.. بلکہ
اونگھ رہے ہیں..

وہاں سے چلے تو ذرا مشترکہ طور پر چلے.. ایک دوسرے کو نظر میں رکھتے ہوئے چلے..
شانی چو سے چلتے ہوئے علی موسیٰ نے ہمیں اطلاع دی تھی.. اور یہ وہی علی موسیٰ تھا جس نے ہمیں
بدگمان اور بے ایمان کر کے گنڈوگورو کی بجائے کے سکس اور کے سیون کی بڑی بڑی گھاس اور
جھیل کی جانب لے جانے کی کوشش کی تھی تو اسی ٹین ایج پورٹر نے ہمیں اطلاع کی تھی کہ
صاحب راستہ ویسے تو آسان ہے.. آگے میدان ہے.. صرف ایک تھوڑا چڑھائی آئے گا۔

چڑھائی آئے تو آ جائے.. ہم نے سوچا تھا.. آخر کتنا چڑھائی ہو گا.. کیا یہ نوخیز مردود
نہیں جانتا کہ ہم "سنولیک" کے دوران ہسپر گلیشیر کے کناروں پر چلتے ہوئے تین عظیم برفانی
گلیشیرز کے کناروں سے اتر کر انہیں پار کر کے دوسرے کناروں پر چڑھ چکے ہیں جہاں صرف
چیونٹیاں اور کوّے ہی چڑھ سکتے تھے تو ان کے مقابلے میں یہ کیا چڑھائی ہوگی.. اور کتنی ہوگی..

لنچ کے زہر مار کے بعد ذرا آگے گئے ہیں تو سطح بالکل ہموار ہوگئی.. اور ہمیں چلنے میں
دشواری پیش آنے لگی.. کیونکہ ہمیں چڑھائی کی ایسی عادت ہوگئی تھی کہ میدان میں ہمارے پاؤں

بے ربط ہوتے جاتے تھے... دائیں ہاتھ پر.. جہاں ہم چلتے تھے.. وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک
عظیم چٹان سربلند تھی اور اس کے دامن میں چند خیمے نصب تھے..

چٹان کے ایک بڑے اور وسیع دامن میں دوپہر کی دھوپ میں جلتے خیمے تھے..

ان خیموں میں جو مکین تھے اور ظاہر ہے غیر ملکی تھے۔ انہوں نے شاید خیموں کے
پردے اٹھا کر ہمیں وہاں سے گرتے پڑتے چلتے دیکھا ہوگا.. اور ان مکینوں میں سے کوئی ایک
مسکراتا ہوا.. بلندیوں سے ڈستے ہوئے ایک چہرے کے ساتھ مسکراتا ہوا میرے پاس آ گیا۔

"سر.. آپ یہاں بھی آ گئے؟!"

میں اس سوال سے اگرچہ تنگ آ چکا تھا.. مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا تھا کہ مجھے یہاں نہیں آنا
چاہیے تھا.. میں نے یہاں آ کر گستاخی کی ہے.. لیکن اس کے باوجود میری انا کو تسکین بھی ہوتی تھی
کہ... میں یہاں بھی آ گیا ہوں۔ "آپ کون ہیں؟!"

"میں ایک غیر ملکی مہم کے ہمراہ رابطہ افسر کے طور پر آیا ہوں۔ کیپٹن... ہم لوگ گشابرم
فور کر کے آئے ہیں.. کنکورڈیا میں.. اور اب گنڈوگورو سے اتر کر یہاں پہنچے ہیں.. میں اپنے خیمے
سے باہر کھڑا تھا۔ جب آپ کو دیکھا تو دور سے پہچان گیا کہ یہ آپ ہی ہو سکتے ہیں۔"

"کیسے؟" میں نے مسکرا کر دریافت کیا۔

"ادھر تو آپ ہی ہو سکتے ہیں سر.. اور کون ہو سکتا ہے۔"

یہ نوجوان کپتان ڈھکے چھپے انداز میں مجھے فاتر العقل ہی تو کہہ رہا تھا..

چٹان کے بڑے سائے میں جو خیمہ گاہ تھی، اس سے ذرا آگے گئے تو گر گئے.. اور گر
گئے... سے مراد یہ ہے کہ... یہ میدان جب ایک چٹانی سلسلے کی رکاوٹ سامنے پا کر اختتام پذیر ہوا
اور ہم ذرا بائیں جانب ہو کے کوئی راستہ تلاش کرنے کے لیے اُس کنارے کی بلندی سے نیچے جھانکا
تو نیچے گنڈوگورو گلیشیر کی وسیع برفانی گزرگاہ سانس لیتی تھی..

اور ہمیں اس گزرگاہ میں اترنا تھا..

اور اس گزرگاہ تک ایک ایسی اترائی اترتی تھی جس پر اترا نہیں بس گرا جا سکتا تھا.. اس
لیے ہم گر گئے..

شاید یہی اترائی تھی جس کے بارے میں ہمیں خبردار کیا گیا تھا کہ صاحب آگے ایک
چڑھائی ہے.. لیکن یہ تو واپسی پر چڑھائی ہوگی.. اب تو یہ ایک اترائی تھی.. اور یہاں سے نیچے جانے

کے لیے ایک بنگی چھلانگ ہی کارآمد ہو سکتی تھی..

بنگی چھلانگ جس میں ایڈونچر کے رسیا لوگوں کے پاؤں میں ایک رسی باندھ کر انہیں بلندی سے دھکیل دیا جاتا ہے..

باری باری ایک دوسرے کے سہارے، پورٹروں کے سہارے.. بڑھتے.. گرتے پڑتے.. پھسلتے.. روڈ سکیٹنگ کرتے.. کبھی بے بسی سے مسکراتے اور کبھی خوف کے آنسو روکتے نیچے پہنچ گئے.. گلیشیئر کے قریب پہنچ گئے لیکن اس پر اترے نہیں، اس کے برابر میں جس کنارے سے ہم گرے تھے، وہاں ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے.. گلیشیئر کے ساتھ ساتھ!

چونکہ ہم کھلے میدان اور بڑے آسمان سے نکل کر گلیشیئر کی گہرائی میں آ گئے تھے اور یہاں صرف برفیں تھیں اور اس کے بلند کنارے تھے جن کی تہہ میں ہم چلتے تھے تو یہاں بھی ایک دنیا جہان سے کٹی ہوئی تنہائی تھی جس میں ہم ایک ڈھلوان کنارے پر گلیشیئر کے برابر میں اپنے آپ کو سنبھالتے چلتے جاتے تھے.. یہاں بھی دو چار سخت مقام آئے لیکن انہوں نے جی کو خوش نہ کیا کیونکہ پھسلنے کی صورت میں ہم محض چند گز نیچے گلیشیئر پر جا گرتے اور خیریت رہتے.. تب میں نے پہلی بار اپنے اوپر دیکھا.. اور اوپر موت کا ایک منظر دیکھا جو معلق تھا..

چٹانیں تودے اور چھوٹی موٹی سڑک کے پتھر بلند کنارے کی مٹی میں یوں اٹکے ہوئے تھے جیسے ذرا سی ہوا کے چلنے سے ہم پر لڑھکتے ہوئے نازل ہو جائیں گے.. نہیں ہمارے سروں کے اوپر وہ چٹانیں جانے وہاں کیسے قائم تھیں.. بھی مٹی میں پھنسی وہ کسی معجزے سے قائم تھیں اور ذرا سا سانس لینے پر نیچے گر سکتی تھیں.. بلکہ گرنے کو تھیں اور ذرا سوچ میں پڑ گئی تھیں کہ اب فوراً گر پڑیں یا اپنے نیچے مرے سے چٹے ان بے وقوفوں کو چند نئے اور جینے کے عنایت کر دیں.. وہ چٹانیں ایسے ڈائناسورس تھیں جن کی صرف دُمیں مٹی میں پھنسی ہوئی تھیں اور وہ زور لگا کر باہر آنے کو تھیں.. ان سینکڑوں پتھروں اور معلق چٹانوں میں سے کوئی ایک بھی گر کر ہمیں اجل کا سرمہ بنا سکتی تھی..

بہتر یہی تھا کہ سر اٹھا کر اوپر دیکھا ہی نہ جائے.. صرف اپنے سامنے دیکھیں اور ایک عالم جذب میں سر جھکائے چلتے جائیں..

بائیں ہاتھ پر گندہ گوروں کی برفانی دنیا کی اونچ نیچ میں سے کوئی پتھر کسی برف کی دیوار میں سے جدا ہو کر کسی نیچی کھائیوں میں گہری گونج سے گرتا تو ہم چونکنے ہو کر فوراً اوپر دیکھتے کہ کہیں یہ پتھر اوپر سے تو نہیں آ رہا.. کہیں موت کا دن تو متعین نہیں ہو گیا..

ازاخِش شاہ نے اس راستے کے بارے میں خبردار کیا تھا کہ اس کی ہولناکی بیان سے باہر ہے.. اس کے اوپر جو چٹانیں معلق ہیں وہ کسی وقت بھی نیچے آ سکتی تھیں اور آپ کو ملیامیٹ کر سکتی تھیں.. ہم نے شالی چوٹ سے چلنے کے بعد اب تک تیز دھوپ کو کوسا تھا اور اب وہی دھوپ اور بن بادل کا آسمان ہمارے لیے باعث رحمت تھا.. یہاں اگر بارش کے چند چھینٹے بھی پڑ جاتے تو اس ہوئی مٹی کی گرفت ڈھیلی کر کے ان چٹانوں کو ہم پر دھکیل دیتے.. ہم نے یہاں اپنے بے ترتیب سانس درست کرنے کے لیے بھی ذرا سا رک جانا مناسب خیال نہ کیا اور چلتے رہے.. اور ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر چلتے رہے.. خاموشی سے دم سادھے چلتے رہے کہ لے سانس بھی آہستہ.. کہ نازک ہے بہت کام..

پتھریلی موت کے دامن میں یہ مسافت جب اختتام کو پہنچی تو نیچے ایک نالہ اس طرح گرتا تھا جیسے ہم کنارے سے گرے تھے.. نالہ گرتا تھا اور نیچے گلیشیئر کی کسی دراڑ میں گم ہوتا تھا..

ہم نے اسے نہایت آسانی سے اور رغبت سے پار کیا..

اس کے پار ایک کچی راہ.. تقریباً سیدھی ڈھلوان پر عرش کو اٹھتا تھا.. اس پر پرواز کر جانا تو ممکن تھا اس پر قدم رکھ کر چلنا اور چڑھنا.. لا تھی ہوئے تیر کا.. یا شاید چڑھے تیر تو صرف ایک تیشے کے مسلسل استعمال سے لائی جا سکتی ہے لیکن یہاں وہ تیشہ بھی بیکار ہو جاتا تھا.. چنانچہ فرہاد ہو جانا بھی کارآمد نہ تھا.. اس لیے میں نے دو پورٹر طلب کیے اور ان کے بازوؤں پر بھروسا.. یونہی کارروائی کے طور پر اپنے پاؤں ہلاتا ان کے سہارے سہارے اس عرش تک جا پہنچا اور شانت ہو گیا کہ وہ چڑھائی جس کو ذرا انہیں شالی چوٹ سے چلتے ہوئے بتایا گیا تھا بالآخر طے ہو گئی لیکن پھر وہ شانتی ایک ایسے ہراس میں بدلی جس میں مجھ پر یکدم خوف کے پسینے نالوں کی صورت میں بہنے لگے.. اور دل جو پہلے سے ہی پریشر میں تھا ایک دھک کر کے دیر تک رہا اور پھر اس نے بہت دیر بعد ایک اور دھک کی اور پھر رک گیا کیونکہ سامنے.. سامنے تو نہیں اوپر وہ چڑھائی تھی جس کے بارے میں ہمیں خبردار کیا گیا تھا..

پہلے جو گھاٹیاں آئی تھیں وہ تو محض ٹریلر تھے.. اصل فلم کا تو اب آغاز ہوا تھا.. میں نے بہت سی تو نہیں.. لیکن دس بارہ ایسی آسمانی سیڑھیوں پر قدم رنجہ فرمایا تھا.. لیکن سیڑھیاں ایسی جن کا کوئی زینہ سلامت ہو.. کبھی درگوتھ کی ندیوں سے پہلے اور کبھی سنولیک کے دوران کسی گلیشیئر کی دیوار پر چڑھتے ہوئے.. لیکن اس چڑھائی کی شان ہی الگ تھی..

''دل سنگ پا.. پھولوں کا کھیت، جہاں کوئی پھول نہ تھا''

ہم چلے... ایک ہاتھ پر تیسرا پیک گنڈوگورو تھا جب ہم چلے..

ہمارے آس پاس... برفانی ڈھلوانوں اور ندیوں کی بجھی ہوئی گزرگاہیں تھیں.. مرجھا چکی جھاڑیاں اور بوٹے تھے.. ایسے جن پر کبھی پھولوں کے ڈھیر کھلے ہوں گے اور اب وہاں ان کے خزاں رسیدہ ڈنٹھلوں پر ان کے نقش باقی تھے... جیسے پہاڑی میدان کی بہار چند روزہ ہوتی ہے اور جو کوئی موسم گل کے بعد وہاں سے گزرتا ہے تو یقین نہیں کر سکتا کہ یہاں تو قافلے رنگ و بو بھی ٹھہرے تھے..

ان لفظوں نے [illegible] ٹریک کا سب سے خوبصورت حصہ قرار دیا تھا.. اسے پھولوں کی وادی کہا تھا..

اس لیے کہ ''دل سنگ پا'' کے لغوی معنی ''پھولوں کے کھیت'' کے ہیں.. لیکن پھولوں کا یہ کھیت ویران ہو چکا تھا..

جیسے گندم کی کٹائی کے بعد کھیت میں بوٹوں کے کھردرے ٹنڈ رہ جاتے ہیں.. ان کی جڑیں باقی رہ جاتی ہیں اور انہیں دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ کبھی ان پر سنہری خوشے جھومتے تھے.. ایسے یہ پژمردہ بوٹے اور جھاڑیاں تھیں.. گھاس میں.. ڈھلوان پر اور ہمارے راستے میں بکھری ہوئی تھیں کہ انہیں دیکھ کر یہ گمان بھی نہ گزرتا تھا کہ یہاں کبھی صرف رنگوں کی بادشاہت ہوگی..

خشک گزرگاہوں کو دیکھ کر یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ ان میں برفانی اور سورج کی روشنی سے پیدا ہوتے شگفتہ پانی بجتے ہوں گے..

ہمیں پچھلے ماہ یہاں آنا چاہیے تھا جب یہ اندازے.. یہ گمان اور یہ خیال جھوٹے ہوتے..

کہیں بلند پہاڑوں میں.. ان کے اندر جانے کے لیے موزوں ترین مہینہ جولائی کا ہے.. مئی کے مہینے میں برف پگھلتی ہے.. دھوپ تیز ہوتی ہے.. جون میں ندی نالے پُرشور ہو جاتے ہیں.. گلیشیئر کے کناروں پر جو وادیاں ہوتی ہیں ان میں آبشاریں اترتی ہیں.. گھاس بلند ہونے لگتی ہے اور پھول کھلنے لگتے ہیں.. چشمے جاری ہو جاتے ہیں اور جھرنے چٹانوں کی کوکھ میں سے پھوٹنے لگتے ہیں.. ڈھلوانوں پر جہاں برف ہوا کرتی تھی وہاں ہریاول کی چادر بچھنے لگتی ہے.. اور جولائی میں تو قافلۂ رنگ و بو زمین پر آ جاتا ہے.. لیکن اگست کے شروع میں بلندیوں پر پھر سے ٹھنڈک اترنے لگتی ہے.. دھوپ میں تمازت نہیں رہتی.. ہلکی برفباری شروع ہو جاتی ہے اور ندی نالے سکڑنے لگتے ہیں.. دو دن کی بہار کے بعد جھاڑیوں اور بوٹوں پر جو پھول کھلتے تھے وہ اپنی زندگی پوری کر لیتے ہیں.. رنگ و بو کا قافلہ کوچ کر جاتا ہے..

اور ہم یہاں اگست کے تیسرے ہفتے کے آغاز میں پہنچے تھے..

اب یہاں خزاں کی پرچھائیاں تھیں.. اور جیسے ابھی یہاں سے کوئی قافلہ گزرا تھا..

''پھولوں کا کھیت'' اُجڑ چکا تھا..

آسانی اور تیزی سے آگے.. ہم زیادہ دیر نہیں چلے جب ہم ذرا اونچے ہوئے.. ایک بلند کنارے پر آئے تو یکدم نیچے.. دل سنگ پا دکھائی دیا..

ایک ویران میدان.. گلیشیئر کے بلند کناروں کی اوٹ میں.. چٹانوں کے دامن میں شام کی سرد چھاؤں میں آ رہا تھا.. ایک جانب ایک مختصر پانیوں والی جھیل جس میں شام اتر رہی تھی..

اور دوسری جانب گلیشیئر کی دیوار کے اس پار مشابرم سربلند... اور مشابرم کی انبار برفیں.. اور ان کے آس پاس بے شمار.. چھ سات بڑے بڑے گلیشیئر برفانی دریاؤں کی مانند بہتے اترتے.. لیکن منجمد کیفیت میں.. ٹھہرے ہوئے.. دل سنگ پا پر اُمڈتے ہوئے..

اور ان برف زاروں کی اوٹ میں دل سنگ پا کی ویران چراگاہ..

کسی نے بتایا تھا کہ دل سنگ پا کی رات بھی اتنی ہی سرد ہوتی ہے جتنی کنکورڈیا میں۔

4150 میٹر یا 13600 فٹ کی بلندی پر دل سنگ پا..

مشابرم چوٹی اور مشابرم کے سامنے پھولوں کا کھیت جس میں کوئی ایک پھول بھی نہ تھا..

"پانچ گلیشیئر..میرا خیمہ اور 13600 فٹ بلند سردرات"

ہم دل سنگ پا میں اترنے لگے..

کند وکوروہ کے کناروں سے نیچے اترنے لگے..

اس کے پہلو میں اجڑا ہوا پھولوں کا کھیت تھا اس میں اترنے لگے..

گھاس کم کم تھی..ریت بہت تھی..

دائیں ہاتھ پر چٹانوں کے دامن میں ایک کم پانیوں والی جھیل تھی..اتنے کم کہ اس میں جابجا پتھر ابھرے ہوئے تھے..وہیں کہیں سے ایک چشمہ اس میں شامل ہوتا تھا اور یہ ہادنی وانر سپلائی تھا..چشمہ بہ ابھی تک چل رہا تھا خشک نہیں ہوا تھا..

ریتلے میدان سے ذرا بلند ایک پتھریلی چاردیواری دکھائی دے رہی تھی جس کی جانب ہمارے پورٹر ایک تیر کی مانند گئے اور لمحوں میں پتھروں کے اوپر کون ٹینٹ کی ترپال آویزاں کر کے آ....گئے..

دل سنگ پا میں اترنے سے پیشتر میں نے دائیں جانب ایک سرسبز گھاٹی کے دامن میں دو پتھر یلے جھونپڑے دیکھے تھے جن میں بقول اوانقل شاہ..شمشے کی کچھ اپنی خواتین کو ہونا چاہیے تھا جو یہاں مویشیوں کی نگہبانی کرتی ہیں....دودھ بچتی ہیں اور پنیر بناتی ہیں....پتہ نہیں اب تک وہاں تھیں یا نہیں کیونکہ میں نے اس پاس کسی ذی نفس کو نہیں دیکھا تھا..

اور اس منظر نے میری توجہ اس لیے حاصل کی کہ ان جھونپڑوں کی جانب ہمارے دو پورٹر کمبل اٹھائے جا رہے تھے....وہ یقیناً ان بلندی پر تنہا قیام پذیر خواتین کے عزیز رشتہ دار تھے اور ایک چھت تلے رات گزارنے کے لیے اتر جاتے تھے..وہاں ایک چھت کے علاوہ آگ بھی

کو ہووہ اور کھانے کو پنیر ملنے کی امید تھی..

ہم تو اس خیال میں تھے کہ شاہی چوک کی مانند ادھر دل سنگ پا میں بھی غیر ملکیوں کے خیموں کی ایک دنیا ہوگی لیکن وہاں کوئی نہ تھا..اگرچہ ہم تنہائی کے تمنائی تھے اور ہمیں خوش ہونا چاہیے تھا لیکن ہم ذرا ڈر گئے کہ ہم اتنی بڑی اور مکمل تنہائی کے بھی تمنائی نہ تھے..

ہر جانب گلیشیئر دندناتے ہوئے اترتے تھے..

لیکن وہ دیوار کے پار رک جاتے تھے..

برف بلندیاں تھیں اور ان برفپوش حسیناؤں میں سب سے گورے اور مختصر اور بلند قامت والی مشابرم تھی..ہم نے اس سے بے وفائی کی تھی اور اس کے بیس کیمپ میں جانے کی بجائے ادھر آ نکلے تھے..

ویسے ہم کسی حد تک کنکورڈیا ٹریک کے متوازی چل رہے تھے..

پتھر یک کی جانب سے ایک راستہ کنکورڈیا کی خیمہ گاہ میں جا اترتا تھا..

شاہی چوک سے پرے دو گلیشیئر شروع ہوتا تھا جو مونالیزا چوٹی یا جوڑ لیزا تک چلا جاتا تھا..پلا جاتا تھا یا وہاں سے اتر کر نیچے آتا تھا اور جو ڈولیزا گلیشیئر کہلاتا تھا..

اس مشابرم کے پار وہ برفانی جانب گھر تھا جس سے اگلا سٹاپ گورے فوکا تھا..اور کند وکوروہ کے پار کنکورڈیا ہوا کرتا تھا..

گویا ہم سب کنکورڈیا ٹریک کے اس جانب چل رہے تھے..دیوار کے اس پار تھے..

اس لیے یہاں دل سنگ پا میں بھی وہی موسم تھے..وہی موسم برفیلے سبانے..ہم خیموں کے باہر میزوں پر استراحت فرمانے کی کوشش کرتے تھے لیکن سردی کرنے نہ دیتی تھی..کبھی کبھار کسی گلیشیئر پر سے کوئی ایولانچ گرنے سے ایک گمبھیر دل کو ہلا دینے والی گونج دل سنگ پا کی تنہائی میں اندلی ہوئی آتی..سنائی دیتی..اور جتنی دیر میں ہم اس برفانی تودے کو گرتے ہوئے دیکھنے کی آرزو میں اسے متعدد گلیشیئرز پر نظریں دوڑاتے تلاش کرتے وہ تودہ گر چکا ہوتا اور اس کی گونج گم ہو چکی ہوتی..

پورا دل سنگ پا..مشابرم کی چوٹی..اس کو برفانی دیواریں متعدد گلیشیئر کم از کم آج کی شب ہماری جاگیر تھے..ان کی رجسٹری ہمارے نام ہو چکی تھی..بے شک ایک شب کے لیے ہی سہی..

ہم وہ نظام سقے تھے جو برف کے سکے چلا سکتے تھے..اپنے تخیل کی ٹکسال میں پوری مشابرم کو ڈھال

بجرلی تھیں اور سونے نہیں دیتی تھیں.. بچپن میں فلم "پرچھائیں" کا لتا منگیشکر کا گایا ہوا گیت "کٹتے ہیں دکھ میں یہ دن.. پہلو بدل بدل کے" مجھ پر بہت اثر کرتا تھا.. اب کھٹا کر لتا نے یہ گیت دل سنگ پا کی اس رات کو مدنظر رکھتے ہوئے گایا تھا.. یہاں بھی یہ رات دکھ میں کٹی تھی اور کروٹ بدل بدل کے..

دل سنگ پا کی شام میں ہم جن گلیشیئرز کا اپنی ریاستیں اور جن چوٹیوں کو اپنی کنیزیں سمجھ رہے تھے وہ اس کی سرد رات میں ہم پر حاوی ہو کر ہم پر حکمرانی کرنے لگیں.. اس سے ہمارا استغنا کھو گیا اور ہم بادشاہ سے مجبور انجام سے ہو گئے..

رات کے کسی پہر مجھے مجبوراً خیمے سے باہر آنا پڑا..

ایسی شدید سردی میں اگر خیمے میں آگ بھی لگ جائے تو بھی میں اپنے سلیپنگ بیگ سے باہر نہ آؤں.. لیکن یہ مجبوری آگ سے بھی زیادہ مجبوری تھی..

مجھے کوہ پیمائی کی کسی کتاب میں اس کا حل نہیں ملا.. بلکہ ایک بار شاہد ویسانی کے ہمراہ برجی لا کی اس رات میں جب برفباری تھمتی نہ تھی تو میں نے سوچا تھا کہ انسان کے پاس ایک ربڑ پائپ ہونا چاہیے کہ اس میں فٹ ہو کر خیمے کے اندر ہی اندر فراغت ہو جائے..

اگر یہاں دل سنگ پا میں میرے پاس کوئی پائپ ہوتا تو میں ہرگز باہر نہ جاتا..

لیکن یہ شاید بھی ہماری قسمت.. اس لیے مجھے مجبوراً باہر آنا پڑا.. کہ میرے مثانے پر جو شدید دباؤ تھا وہ خیمے میں آگ لگ جانے سے کہیں زیادہ جان لیوا تھا..

بہر حال میں اس دباؤ کو دبانے کی کوشش کرتا.. سلیپنگ بیگ سے باہر آیا.. رینگتا ہوا خیمے سے باہر آیا.. لیکن باہر آنے سے پیشتر اپنی سنو جیکٹ پہن لینے کو نہ بھولا.. اگر بھول جاتا تو برفانی عجائب گھر میں ایک مجسمہ ہو جاتا..

میں باہر آیا.. اور جب میں اپنے آپ کو ہلکا کرنے کے بعد ایک عجیب بالیدہ روح کے ساتھ خیمے میں جانے کو تھا تو میری نظر آسمان پر گئی..

اور وہاں کوئی اور آسمان تھا..

اور یہ وہ آسمان تو نہ تھا جو پچھلے ساٹھ برس سے میرے سر پر ایک خیمے کی مانند تنا رہا تھا..

میں اپنا آسمان کہیں بھول آیا تھا..

یہ درست کہ ایک آسمان اپنے پکنیکس کے دوپٹے کے ساتھ دریائے سندھ میں اترا تھا اور اس میں اپنے ستارے ڈبوتا اور جھلملاتا تھا.. ایک اور آسمان فیئری میڈو پر اترتا تھا اور ہم الاؤ بجھا دیتے تھے تاکہ اس کے ستارے نزدیک آ جائیں..

لیکن یہ.. دل سنگ پا کی رات کا آسمان کوئی اور آسمان تھا..

اس آسمان کے ستارے الگ الگ نہ تھے بلکہ ایک کہکشاں کی صورت میں بچھے ہوئے روشن تھے..

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے!

اور وہ 13600 فٹ کی بلندی پر اتنا قریب تھا کہ میں اس کا روشن دوپٹہ ذرا ہاتھ بڑھا کر اتار کر سکتا تھا اور اوڑھ سکتا تھا..

ستاروں کے جھمکے تھے جو مشابرم کی چوٹی سے لپٹتے جاتے تھے.. روشن شراروں کی مانند اس کی برفوں میں دفن ہوتے جاتے تھے لیکن بجھتے نہ تھے اور اس کی برفوں کے ناخنوں کو لو دیتے تھے..

میرے آس پاس.. ہر سو چپ تھی.. دل سنگ پا پر لاکھوں ستاروں کی روشنی بکھی ہوئی تھی..

یہ ستاروں کی کیسی بارات اتری تھی..

میں پوری شب جب تک کہ ستاروں کی یہ بارات رخصت نہ ہو جاتی وہاں خیمے سے باہر جب سارا عالم سوتا تھا میں منہ اٹھائے اس بارات کو تکتا رہتا لیکن سنو جیکٹ اور گرم جرابوں کے باوجود میرا بدن سردی کو سہار نہ سکتا تھا اور بری طرح کپکپانے لگ گیا تھا..

ان چوٹیوں کا گلیشیئرز کی قربت مجھے منجمد کرنے لگی تھی..

مجھے اپنے خیمے میں لوٹنا تھا..

خیمے کا پردہ اٹھانے سے پیشتر میں نے ایک بار پھر دل سنگ پا کے آسمان پر نظر کی... پھولوں کے اس برفانی اجلے چمکتے کھیت پر نگاہ کی..

وہ... 13600 فٹ کی بلندی پر ایک گھنا اور روشنی بھرا ستاروں کا کھیت تھا جس میں میرے تخیل اور آرزوؤں کے ہل چلتے تھے.. دل سنگ پا کی صرف یہ رات بھی اس لائق تھی کہ لاہور سے.. بشام.. گلگت.. سکردو.. خپلو.. ہوشے اور پھر شانی چوٹی کہیں آگے صرف اس کے لیے سفر کیا جائے..

کھنچنے کی صلاحیت یوں بھی کم کم رہ گئی تھی..

شاہد صاحب کیمرے کو اتنی سنجیدگی سے آپریٹ کرتے تھے جیسے وہ پہلے ایٹم بم کو ڈی فیوز کرنے کو ہوں.. ان کا خاصا تھا کہ وہ نہایت اہتمام سے اور دھیرج سے سلوموشن میں کیس میں سے کیمرہ نکالتے پھر تادیر روشنی، دھوپ اور سائے کا اندازہ لگاتے.. اپرچر، سپیڈ اور پتہ نہیں کیا کیا سیٹ کرتے اور پھر ایک عجب سا زاویہ بنا کر بہت سوچ بچار کر کے کیمرے کا بٹن دباتے.. جیسے داد طلب کر رہے ہوں کہ بچہ آج تک بھی کسی نے تمہاری ایسی نایاب تصویر اتاری ہے.. اس احتیاط اور اہتمام کا نتیجہ یہ نکلا.. کہ لاہور واپسی پر جب انہوں نے اپنی آٹھ فلمیں پرنٹ کروائیں تو تصویروں میں ہر جانب تاریکی ہی تاریکی تھی.. کچھ سائے تھے.. کچھ ہیولے تھے اور یا پھر ان کی احتیاط تھی..

حسن کا کیمرہ ولنز بھورو ٹریک کے دوران ایک ندی میں منہ کے بل گر گیا تھا... وہ ذاتی طور پر خود بھی تو کئی گر گیا تھا وہ اس کے ساتھ حسن صاحب تھے. اس لیے اب وہ ایک نیا نکور کیمرہ نمائش کرتے پھرتے تھے جو انہوں نے اپنی بیگم کی معاونت سے خریدا تھا اور اس کے نتائج بعد میں حوصلہ افزا برآمد ہوئے..

اور سلمان اس زعم میں تھا کہ جناب یہ کیمرہ تو امریکہ سے آیا ہے.. یہ بری تصویر کھینچ ہی نہیں سکتا..

صرف میں اپنے محبوب اشالی ٹنکلس کے بغیر تھا..

میں منظروں کو فلم پر نہیں اپنے بدن پر کھینچتا چلا جاتا تھا..

آج.. ہمیں دوزا گنڈو گورو کے بیس کیمپ تک پہنچنا تھا اور پھر اس کی چوٹی پر یلغار کرنی تھی.. نیچے زمین ہیں ہونے لگے..

"آج کا سفر کیسا ہے؟" میں نے حسب عادت اور روایت اسحاق سے پوچھا..

"ادھر نکلے گا تو سامنے تھوڑا اترائی ہے.. پھر گلیشیئر پر اتر جائے گا.. آسان ہے۔"

"گلیشیئر چترا ہے؟"

"ہاں ناں.."

"سفید ہے یا سیاہ ہے؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے صاحب!"

"بہت فرق پڑتا ہے اسحاق.. سیاہ گلیشیئر بادو کہلاتا ہے اور سفید کو ژ کہا جاتا ہے تو میں سیاہ گلیشیئر پر چلنے کی پریکٹس رکھتا ہوں.."

"تھوڑا سیاہ ہے اور تھوڑا سفید ہے.."

"اور آج ہم کہاں پہنچیں گے؟"

"گنڈوگورو کے بیس کیمپ میں.."

"اور اس بیس کیمپ کا نام کیا ہے؟"

اسحاق نے ایک عجیب وغریب سپاٹ سی قسم کا نام لیا..

میں پہلے بھی اقرار کر چکا ہوں کہ اس ٹریک کی منزلوں کے نام بہت الگ تھے اور مجھے یاد نہیں ہو رہے تھے.. مشکل سے شالی چو اور ولی سنگ یاد کیا تھا اور اب یہ کھا اور آ گیا تھا.. چنانچہ میں نے محض سر ہلا دیا کہ نام میں کیا رکھا ہے..

ہمارے خیمے سمیٹے جا رہے تھے..

میں اپنی میٹرس پر بیٹھا اپنے نئے ہائی ٹیک بوٹوں کے تسمے باندھ رہا تھا اور مجھے بے حد لطف آ رہا تھا.. میں خوش تھا..

جی ہاں ایک کوہ نورد کی خوشیاں بہت الگ ہوتی ہیں..

ایک کوہ نورد کے لیے یہ بھی ایک خوشی ہوتی ہے.. ایسے نئے نکور ہائیکنگ بوٹ پہننا جو آپ کے پاؤں کو پسند کر لیں اور پھر ان کے تسمے اور وہ بھی نئے نکور.. کس کر یوں باندھنا کہ آپ کے پاؤں ان میں محفوظ محسوس کریں.. یوں کہیے کہ اپنے تسموں کو باندھنے میں وہی سنسنی محسوس ہوتی ہے جو ایک رقاصہ گھنگھرو باندھتے ہوئے محسوس کرتی ہے.. گویا نفس کوہ نوردی سے پیشتر بوٹوں کے تسمے ہمارے گھنگھرو ہوتے ہیں..

یہ نئے بوٹ پہننے کے بعد میں نے جامنی رنگ کی نارتھ فیس جیکٹ پہنی تو یہ ایک اور ہی لذت تھی..

جامنی رنگ کی نارتھ فیس جیکٹ..

یہ چترال سے آئی تھی..

کیسے آئی تھی.. اس کا ذکر کرنا میں بھول گیا تھا..

یہ میں نے ایک تاجی سردار سے حاصل کی تھی..

خلا ہے۔ اس میں اگر لینڈ کریں گے تو ٹانگ خلا میں جائے گی اور ٹوٹ جائے گی.. بس اتنا خیال رکھنا پڑتا ہے..

اور یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اگلا قدم جس پتھر پر رکھنا ہے تو وہ پتھری ہے ہاں.. کہیں بجری سے ڈھکی ہوئی سخت برف تو نہیں جس پر قدرے بے احتیاطی سے پڑنے والا بوٹ یوں پھسلتا ہے کہ آپ ایک مختصر سی قلابازی کے بعد بھی بیٹھے ہیں ہائے ہائے کرتے ہیں اور کبھی نہیں بھی اٹھتے اور آپ کے ساتھی ہائے ہائے کرتے ہیں کہ ہائے ہائے عجب آزاد مرد تھا..

کنڈرے کے ان پتھروں پر چلتے چلتے ہم گلیشیئر کے درمیان میں پہنچ گئے جو سیاہ رنگ کا تھا اور شکن در شکن تھا اور اس پر چھوٹا سامان تھا.. اس کی دراڑوں کی شکلیں بھی ایسی تھیں کہ دور سے پتہ چلتا تھا کہ یہ بیہودہ ہے..

ہم اس گندہ گور گلیشیئر سے زیادہ متاثر نہ ہوئے کیونکہ ہم میں سے جو سنولیک کے سفر کے دوران دنیا کے طویل ترین گلیشیئر پر قدم رنجہ فرما چکے تھے.. اگر ہم نے ان قدم رنجوں کے دوران رنج بھی بہت اٹھائے تھے۔ اس کے مقابلے میں تو یہ ایک بچہ گلیشیئر تھا.. لیکن احتیاط پھر بھی لازم تھی..

یہیں پر گندہ گور پر چلتے ہوئے دائیں جانب لیلیٰ نے پہلی بار اپنے وجود کی سفید عریانی کو ہم پر ظاہر کیا..

وہ پہلے تو وہاں نہیں تھی..

شاید اس نے ابھی ابھی میری پسلی سے ایک اماں حوا کی طرح جنم لیا تھا اور دائیں ہاتھ پر بلند ہو گئی تھی..

اس صحرائے برف میں جھلکتی ہوئی اچانک کہیں سے آ گئی تھی..

متعدد برفانی بلندیوں میں سے قد نکالتی ہوئی.. چھریرے بدن کی ترچھی تکون کی صورت اختیار کیے لیے۔ جس کی چوٹی اس تکون کی ایک ایسی نوک تھی جس پر کوئی دودھ پیتا بچہ تو نہیں جا سکتا تھا..

ہمارے کوہستانی سفر کے دوران کے سکس ٹو کے سیون اور مشابرم ہم پر ظاہر ہوئیں۔ ہم ان سے مرعوب بھی ہوئے اور مسحور بھی لیکن وہ محض برف تھیں۔ چٹانیں تھیں لیکن لیلیٰ.. گوشت پوست کی بنی لگتی تھی.. بدن ابھاروں اور گرم جذبوں سے سلگتی چوٹی لگتی تھی.. زندہ لگتی تھی... یہ ایسی لیلیٰ تھی.

میں چلتا تو گلیشیئر پر تھا لیکن گردن ترچھی کر کے دائیں جانب بس اسے مسلسل دیکھتا جاتا تھا اور اگر یہ کوئی ہموار گلیشیئر ہوتا تو میں کب کا بے دھیانی میں کسی دراڑ میں گر چکا ہوتا..

مجھے خدشہ ہوا کہ مسلسل اس کی جانب دیکھتے دیکھتے میری گردن میں بل آ جائے گا۔

اس لیے میں نے اپنا دھیان سامنے کیا جہاں برمانی تھا.. اس نے حسن کا ہاتھ تھامے شاید اس کی نبض چیک کرتا چلا جا رہا تھا..

"برمانی.."

"جی.."

"وہ پیک کیسی لگتی ہے؟"

"جی؟" برمانی بھی شاید شاہ صاحب کی مانند ذرا اونچا سنتا تھا۔ اس لیے یکدم سوال کرنے پر ہمیشہ چونک جاتا تھا اور ایک لمبی "جی ای ای" کرتا تھا..

"میں اس پیک کی بات کر رہا ہوں.. لیلیٰ پیک.. کیا چوٹی ہے.. لیلیٰ برمانی۔"

"سبحان اللہ.. کیں آپ نے جو اس چوٹی کو لیلیٰ برمانی کہا ہے تو میرا دل موہ لیا ہے۔ میں تو پچھل سا ہو گیا۔" "کیا مطلب؟"

"لیلیٰ کے نام کے ساتھ ہمارا نام برمانی لگا کر بولے ہو جیسے یہ ہماری منکوحہ ہو تو ہمارا دل خوش ہو گیا ہے سائیں.."

برمانی میری نظروں میں کچھ مشکوک ہو گیا۔ "بھئی.. یہ تو لگتا ہے کہ ابھی ابھی یہاں ایک خلا تھی اور یکدم یہ وجود میں آ گئی ہے.. اب دکھائی دی ہے۔"

"سائیں آپ تخت لہور کے باشندے ہو شہر کے شور اور میدانوں کے باسی ہو تو آپ کو یہ اب دکھائی دی ہے.. ہم صحرا کے مکینوں کو تو یہ ایک مدت سے دکھائی دے رہی ہے۔"

"برمانی تم یہ ہو کہ ایک مرتبہ فیصلہ کر لو کہ تم ہو کیا؟.. کبھی تم سرائیکی ہو لیے تھے ہو.. کبھی تم بلوچ ہونے کا دعویٰ کرتے ہو.. کبھی کوہستان سے رشتہ جوڑ کر مرد کوہستان ہو جاتے ہو اور کبھی صحرا کا باسی ہونے کا دعویٰ کرتے ہو۔ اور اس کے ساتھ سندھ سائیں کے نچھاور ہونے پر بھی فخر کرتے ہو.. تو تم ہو کیا؟"

"سائیں آپ کے اور ہمارے شیخ شاہ نے کہا تھا کہ کی جاناں میں کون او بلھیا.. کی جاناں میں کون.."

چھاتے.. وحشی چتون اور پھڑکتی ہوئی مونچھوں کے ساتھ..

"نور حیات یہ حضرات مجھ سے مل کر کچھ ضرورت سے زیادہ خوش ہو رہے ہیں اور بے وجہ مسکرا رہے ہیں تو کیوں.."

نور حیات قدرے پریشان اور پشیمان ہو گیا اور اپنی پھڑکتی ہوئی ناک کھجا کر کہنے لگا

"صاحب ایک چھوٹی سی بدتمیزی ہوئی ہے.."

"کیسی بدتمیزی؟"

"دراصل ہم لوگ.. گائیڈ لوگ... جب بھی غیر ملکی کوہ نوردوں کو لے کر پہاڑوں اور گلیشیئروں میں جاتے ہیں تو ہمیشہ ایک ہی سوال پوچھا جاتا ہے کہ تمہارا شمال اتنا خوبصورت اور زبردست ہے اور یہاں صرف غیر ملکی آتے ہیں، تمہارے ملک کے باشندے کیوں نہیں آتے.. آپ کے نمودار ہونے سے چند لمحے پہلے یہی سوال پھر اٹھایا گیا تھا کہ ہم نے پورے ٹریک کے دوران کوئی پاکستانی کوہ نورد نہیں دیکھا.. اور تب آپ نظر آ گئے.. آپ کے ساتھی دکھائی دینے لگے.. آپ دور سے پہچانے تو نہیں جا رہے تھے لیکن آپ کی بے ڈھنگی چال سے اندازہ ہوتا تھا کہ جو کوئی یہ شخص ہے سخت مشکل میں ہے اور پاکستانی ہے.. تو میں نے نہایت فخر سے اعلان کیا کہ سنیور.. سنیور تھا.. آپ شکایت کر رہے تھے کہ ان پہاڑوں میں کوئی پاکستانی نہیں آتا تو یہ سامنے سے ایک پاکستانی آ رہا ہے اور اس کا نام تارڑ ہے.. کتابیں لکھتا ہے اور ٹیلی ویژن پر میزبانی کرتا ہے.. تو انہوں نے دریافت کیا کہ اتنی دور سے صرف ایک جامنی رنگ کی جیکٹ نظر آ رہی ہے تو تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ وہی شخص ہے جس کا تم نام لے رہے ہو.. تو میں نے وہی چھوٹی سی بدتمیزی کی اور کہا.. پاکستان میں صرف ایک ہی تنہا پاگل شخص ہے تو وہی ہو سکتا ہے.. ہم قریب آئے تو آپ.. میرا مطلب ہے کہ وہ وہی تھا.. اس لیے آپ سے ہاتھ ملاتے ہوئے یہ لوگ مسکرا رہے تھے.."

"ٹھیک ہے نور حیات.. عجیب سا کوئی مت دو ہے تم نے لیکن ٹھیک ہے.." میں نے نور حیات اور اس کے ساتھی کوہ نوردوں سے باری باری ہاتھ ملایا اور آگے بڑھ گیا.

شمال بہت بڑا ہے.. ایک کائنات ہے.. اور اس کائنات میں میری حیثیت ایک ذرے سے بھی کم ہے.. لیکن پچھلے بیس برس سے یہ ہوتا چلا آ رہا ہے کہ میں بے شک "پاک سرائے" کی وادی سو جڑ آ ہوں میں خیمہ زن ہوں یا "سنو لیک" کی برفوں میں کسی برفانی پل صراط پر چلتا ہوں تو

پورے شمال کو خبر ہو جاتی ہے کہ میں اس برس کہاں دیکھا گیا ہوں.

دیوسائی ٹریک کے دوران جب مجھے بتایا گیا کہ پورے دیوسائی میں صرف تین یا بیس ریچھ ہیں تو مجھے یقین نہ آیا کیونکہ جو ہم کر رہے تھے پورے سکردو میں ریچھوں کی دھوم ہوتی تھی.. ہر دوسرا شخص گواہی دیتا تھا کہ دیوسائی پر تو اتنے ریچھ ہیں کہ ان کو چلتے پھرتے میں بھی دشواری پیش آتی ہے.. یا تو ہر ایک نے ریچھ دیکھا ہوتا تھا اور یا پھر اسے بتایا گیا ہوتا تھا کہ جناب میں نے خود دیکھا ہے.. چنانچہ مجھے یقین نہ آیا کہ دیوسائی پر صرف تین یا بیس ریچھ رہائش پذیر ہیں.. پھر جنگلی حیات کے رفیق راجپوت نے یہ مسئلہ حل کر دیا.

"تارڑ صاحب دیکھیں.. اگر روزانہ تین یا پچیس جیپیں دیوسائی سے نیچے سکردو میں اترتی ہیں اور کسی روز کوئی ایک ریچھ روڈ کے آس پاس بیٹھا نظر آ جاتا ہے تو گویا پچیس جیپوں میں سوار تقریباً دو سو افراد نے اس ایک ریچھ کو دیکھا.. اب وہ دو سو افراد اپنے دو ہزار جاننے والوں کو بتاتے ہیں کہ ہم نے خود دیوسائی پر ریچھ دیکھے ہیں.. اور وہ دو ہزار افراد مزید لوگوں کو یہی کہانی سناتے ہیں اور یوں ریچھ صرف ایک ہوتا ہے لیکن تاثر یہ ابھرتا ہے کہ جانے والے وہاں ہزاروں ریچھ ہیں.."

شمال میں میری موجودگی کی دھوم بھی اسی کلیے کے مطابق ہوتی تھی..

تارڑ صاحب ایک ہوتا تھا اور..

اور ہاں اب وہ قصہ کہ میں اس روز گھوڑا ہو گیا تھا.

یہ نہایت دلچسپ تھیوری ڈاکٹر عمر نے "کے ٹو کہانی" کے دوران پیش کی تھی..

یعنی کہ ٹریک کا پہلا دن جب وہ اپنی جیپ سے بے خبر کران ویرانوں میں قدم رکھتا ہے جہاں صرف قدم ہی جاتے ہیں تو وہ دن پر مشقت اور اذیت والا ہوتا ہے.. اس کی بے بسی اور تھکاوٹ عروج پر ہوتی ہے.. پھر دوسرا دن آتا ہے تو وہ ذرا بہتر محسوس کرنے لگتا ہے.. اگرچہ نڈھال ہوتا ہے اور پاؤں میں چھالے ابھرتے ہیں اور رانوں میں خراشیں ہوتی ہیں لیکن وہ گرتا پڑتا اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے.

لیکن تیسرے دن وہ گھوڑا ہو جاتا ہے..

اور واقعی کے ٹو ٹریک کے تیسرے دن میں گھوڑا ہو گیا تھا..

شاہدان میں ڈاکٹر عمر کی بتائی ہوئی دوائی کی گولیوں کا بھی کمال ہو جو میں نے صبح سویرے چائے کے ساتھ لی تھیں اور مجھے شک ہے کہ ان میں کچھ سٹیرائڈ کی آمیزش تھی لیکن میں ایک بہت

نی تجربہ اور دوستوں کو پیچھا نگ جانے والا ان تھک گھوڑا ہو گیا تھا۔ لیکن ایک عجیب سانحہ ہو گیا.. کے ٹو ٹریک کے بعد میں نے جتنے بھی ٹریک کیے ہیں میں نے ہمیشہ تیسرے دن کا بے تابی سے انتظار کیا کہ آج تو ہم گھوڑے ہو جائیں گے اور ہم کبھی بھی نہ ہوئے... ہمیشہ وہ ناکارہ خچر ہی رہے جنہیں بیکار جان کر کوئی ہانک دی جاتی ہے۔ چنانچہ قابل فہم طور پر ڈاکٹر مر کے اس تھیسس پر سے میرا ایمان اٹھ گیا۔ لیکن آج.. گندو گورو ٹریک کے تیسرے دن یہ معجزہ ہو گیا تھا..

میں نے اپنے تمام ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اور مگن چلتا جاتا تھا.. میرے بدن میں کوئی زیادہ تھکاوٹ نہ تھی اور نہ بلندی مجھ پر کوئی خاص اثر کرتی تھی اور میں ملکھا سنگھ ہو گیا تھا..

ملکھا سنگھ جسے "فلائنگ سکھ" کا نام دیا گیا تھا.. دنیا کے بہترین دوڑنے والوں میں سے تھا.. ایشین اولمپک میں گولڈ میڈل جیت چکا تھا اور کہتے ہیں کہ انڈین ریلوے میں ٹکٹ چیکر ہوا کرتا تھا.. ایک روز اس نے ایک بے ٹکٹ مسافر کو چیک کیا تو وہ مسافر بھاگ اٹھا.. ملکھا سنگھ کو بڑا غصہ آیا کہ کیسا احمق ہے مجھ ایسے چیمپئن سے بھاگ جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے مسافر کے پیچھے دوڑ لگا دی.. جب ملکھا سنگھ پلیٹ فارم پر قدرے رکا تو سٹیشن سے باہر آ کر کھیتوں میں دوڑتا چلا جا رہا تھا تو کسی نے پوچھا سردار جی وہ بغیر ٹکٹ والے مسافر کو پکڑ لیا ہے یا نہیں تو ملکھا سنگھ نے کہا

"بادشاہو ہم تو دوڑ میں اس کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔"

تو میں بھی دوڑ میں اپنے ساتھیوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا..

شاید یہ لیلیٰ پیک کی قربت کا اثر تھا جس نے میرے پژمردہ بدن پر اپنا برف ہاتھ رکھ کر کوئی منتر پھونک دیا تھا.. ایک دم جیسے پھونک دیا تھا اور میری مردنی.. زندگی میں بدل گئی تھی..

ویسے مجھے کچھ کچھ شرمندگی بھی تھی کہ عمر کے اس حصے میں جب انسان باوقار اور معزز بزرگ ماند ہو جاتا ہے، میں گھوڑا ہو گیا تھا.. یہ کوئی قابل فخر بات نہ تھی لیکن اس پر میرا کوئی اختیار نہ تھا..

میرا خیال ہے کہ میں ایک آدھ بار ہنہنایا بھی..

کہیں بلند پہاڑوں میں.. پتھروں کی دنیا میں.. بے انت برفوں میں عام طور پر کوئی واضح راستے نہیں ہوتے.. بس اندازے ہوتے ہیں کہ کوئی رخ یہ ہے بس چلتے جاؤ.. ان حالات میں آپ اپنی حماقت کو بروئے کار لاتے ہیں.. عقل کو اس لیے نہیں کہ وہ تو آپ میں ہوتی نہیں.. اگر ہوتی تو ادھر ذلیل و خوار ہونے کے لیے کیوں آتے.. تو اس کو دوری کی حماقت کو بروئے کار لا کر آپ اپنے راستے کا تعین کرتے چلے جاتے ہیں.. مثلاً کے ٹو ٹریک کے دوران جب ہم

بھٹک جاتے تھے تو بلتورو گلیشیئر پر خچروں کا گوبر تلاش کرتے تھے کہ یہ خچر پاکستانی فوج کا سامان رسد ڈھوتے تھے تو جہاں جہاں ان کا گوبر کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا تو.. یقیناً یہی راستہ ہوگا.. ہوشے سے شلی چو اور پھر دل سنگ پائیو سومش اور چاکیت کے وہ چھلکے اور ڈبے ہر کام آئے جو بدتمیز کوہ نورد پھینکتے گئے تھے.. ان واضح نشانوں کے علاوہ "تی" کوہ نوردوں کے لیے ایک مینارہ نور ہوتی ہے.. پیچیدہ برفانی راہگذاروں اور بکھرے نالوں میں کسی بڑے پتھر پر چھوٹے چھوٹے پتھروں اور کنکروں سے ایک "تی" مینار سا بنا دیا جاتا ہے.. جیسے "پچو کرم" کھیلنے کے لیے بچے کنکریوں کو اوپر تلے جوڑ کر ایک مینار سا بنا دیتے ہیں..

آپ پتھروں کی سلطنت پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور بہت غور سے دیکھتے ہیں تو کہیں نہ کہیں یہ نشانی نظر آ جاتی ہے جو کبھی تو دو تین کنکروں پر مشتمل ہوتی ہے اور کبھی خاصے تردد سے دس بارہ چھوٹے چھوٹے پتھروں کو اوپر نیچے رکھ کر یہ نشانی بنا دی جاتی ہے۔ یہ نشانی بھی تو کوہ نورد بناتے ہیں اور اکثر پورٹر اپنی سہولت کی خاطر بناتے چلے جاتے ہیں تاکہ ان کے پیچھے آنے والے ساتھی بھٹک کر کہیں اور جب نہ نکل جائیں.. اگر راستہ واضح نہ ہو جو کہ وہ کبھی نہیں ہوتا تو ہر کوہ نورد پورٹر کا یہ فرض ہوتا ہے کہ کسی بڑے پتھر پر یہ نشانیاں بنا کر آگے بڑھتا جائے..

اگر "تی" موجود ہو تو ہر کوہ نورد یہ کوشش کرتا ہے کہ اس رہنما مینار پر ایک اور پتھر نصب کر کے سرخرو ہو جائے۔

یہ نشان محض ایک سرسری نظر ڈالنے سے نظر نہیں آتے..

میں بہت غور سے دیکھتا ان چھوٹے میناروں کو تلاش کرتا.. جن میں سے بیشتر پیسا کے جھکے ہوئے مینار کی مانند گرنے کو تکتے تھے.. ان کی جانب قدم اٹھاتا چلتا جاتا تھا.. اور اپنے بڑوں کو دراصل اپنی نفی کرواتا تھا جو میرے نتھنوں میں ٹھونک دی گئی تھیں اور ان میں سے شاید چنگاریاں بھی اڑتی تھیں کہ میں گھوڑا ہو چکا تھا.. شاید اس بلندی پر میرے نتھنوں میں سے بھاپ بھی خارج ہوتی تھی.. مردوں نے اپنی تسلی کی خاطر جو دو انتہائی لایعنی محاورہ گھڑ رکھا ہے کہ مرد اور گھوڑا کبھی بوڑھے نہیں ہوتے.. تو میں تو بوڑھا بھی تھا اور گھوڑا بھی..

میں جب کبھی سر اٹھا کر لیلیٰ پیک کو دیکھتا تو بے اختیار جی چاہتا کہ ہنہنانے لگوں.. ایسی ہی کرتا اس کے قدموں میں لوٹنے لگوں.. لیکن میں نے اجتناب کیا.. اس حرکت سے یقیناً لیلیٰ پیک کا دل دکھے گا کہ میں تو مجنوں کی منتظر تھی اور میرے حصے میں یہ گھوڑا آ گیا ہے..

"گونگے شاہ مجھے ہسپاں لے جا رہا ہے یا ہسپانیہ"

اس سے پیشتر کہ میں لیلیٰ کی جانب دیوانہ وار لپکتا اور مذہبِ عشق اختیار کرتا علی محمد نے پوچھا "صاحب آگے نہیں جائے گا۔"

"جائے گا۔"

"ذرا ٹھہر جاؤ۔"

"آگے کتنا دور ہے ہمیں کیمپ ابھی کتنا دور ہے؟"

"تھوڑا دور ہے۔"

"اور جدھر ہم پہنچیں گے تو اس جگہ کا نام کیا ہے علی محمد؟"

اس بدبخت نے پھر وہی ہسپانوی قسم کا ہسپاں سا نام لیا۔ اور میں اسے روک روک کر ایک ایک لفظ کو بار بار دہراتے جب اس نام سے آگاہ ہوا تو وہ... ہسپاں... ہی تھا۔ اسی لیے ہسپانوی سا لگ رہا تھا...

"اور یہ کدھر ہے؟"

"صاحب ادھر سے نیچے اترے گا... جدھر ایک ندی بہتا ہے... پھر اوپر جائے گا پھر نیچے۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے ایک برتری کی نظر اپنے نڈھال ساتھیوں پر ڈالی اور سینہ پھلا کر کہا "میں کیمپ پہنچ کر خیمے لگواتا ہوں اور پھر آپ کا انتظار کرتا ہوں... میں جاتا ہوں۔" میں چلنے لگا تو خیال آیا کہ جانا کس طرف ہے۔

"کدھر ہے یہ ہمیں کیمپ کا راستہ..."

"آپ کے ساتھ یہ پورٹر جائے گا صاحب... راستہ دکھائے گا۔"

اور یہ پورٹر ایک سیاہ ریش لٹا پٹا پریشان حال خنگ سا بابا پورٹر منہ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا "یہ آپ کو ہسپاں لے جائے گا... ہم آپ کے ساتھیوں کو لے کر پیچھے پیچھے آئے گا۔"

میں پھر سے رواں ہو گیا۔

وہ تمیں بلندیاں اور ڈھلوانیں ہانپتے ہوئے طے کیں... ندیوں میں چھینٹے اڑاتا پار گیا، پتھروں کو پھلانگتا اور برفوں پر بے خطر چلتا گیا... اس لیے بھی کہ میرے ساتھی مجھے دیکھ رہے ہیں اور میں ان کے سامنے [illegible] آیا تھا۔ جونہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئے میں نے ایک پتھر سے ٹیک لگا کر ہانپنا شروع کر دیا بلکہ زبان باہر نکال کر اس کو بھی ہوا لگوائی تا کہ تھوڑی بہت آکسیجن ان کے مساموں میں جذب ہو کر مجھے تازہ دم کرنے میں معاون ثابت ہو... لیکن ثابت یہی ہوا کہ میں اتنا گھوڑا بھی نہ تھا... ایک جعلی سا گھوڑا تھا...

دراصل لکڑی کا وہ گھوڑا تھا جس میں سپاہی چھپا کر اسے ٹرائے کے شہر میں دھکیل کر لے جایا گیا تھا تا کہ ہیلن ایسی بے وفا حسینہ کی کنیزوں تک پہنچا جائے... میں پھر سے چلا... اور وہ سیاہ ریش پریشان حال خنگ سا بے چارہ کے تعاقب میں چلا اور تھوڑی ہی دیر میں پھر سے ہانپنے لگا...

اب وہ پتھروں کی دنیا پیچھے چھوڑ کر ایک اور سفید گلیشیئر پر اتر چکا تھا اور انتظار کرتا تھا کہ میں اس سے جا ملوں... وہ کمزور تھا کسی پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر لیکن جونہی میں ان کے قریب پہنچتا وہ مجھ سے بات کیے بغیر پھر سے چل دیتا تھا... چلنے لگتا تھا...

میں نے متعدد بار آوازیں دے کر اسے روکنا چاہا لیکن وہ سنتا ہی نہ تھا... پیچھے مڑ کر دیکھتا اور اپنی سیاہ ریش میں پوشیدہ مسکراہٹ سے مجھے نوازتا پھر سے شروع ہو جاتا...

عجیب اہلِ جنوں اور اخلاقیات سے عاری پورٹر تھا...

میں آوازیں دیتا... ہانپتا ہوا آوازیں دیتا کہ ہیلو... بابا جی... بابا... بزرگو... پورٹر... ذرا رک جاؤ... مجھے سانس تو لینے دو لیکن شاید وہ بہرا تھا... سنی ان سنی کرتا چلتا جاتا تھا... اور میں اسے کھو دینے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس پتھریلی اور برفانی ریاست میں بھٹک سکتا تھا...

اور پھر حسبِ روایت ایک اور ہسپانوی نیم سے آمنا سامنا ہو گیا...

ان میں ایک ایسی بزرگ خاتون تھیں جو پاکستان میں ہوتیں تو پوتے پوتیوں کو کھلاتی اللہ اللہ کرتی موت کی منتظر ہوتی... ایک ذہین چین اور ہاتھ [illegible] میں کولہوں پر ہاتھ رکھے شکایتیں کر

تھا کہ وہ گونگا ہے اور وہ جان گیا تھا کہ میں جان چکا ہوں کہ وہ گونگا ہے.. تو اب سفر آسان ہو گیا..

جب اپنے لیڈر کے بارے میں علم ہو جائے کہ وہ گونگا ہے تو اس کی پیروی کرنا آسان ہو جاتا ہے.. ورنہ آپ آوازیں ہی دیتے رہتے ہیں کہ لیڈر جی ہمیں بھی ساتھ لے کر چلیں.. اور اس کی ٹافیوں سے رغبت بھی میرے بہت کام آئی.. جونہی وہ اپنی رفتار تیز کرتا.. میں ٹافی کا پرچم بلند کر کے اسے روک لیتا.. اس کے دانت کم ہونے کا باعث شاید یہی ٹافیوں کے لیے رغبت تھی.. شاید وہ غیر ملکی ٹیموں کے سامان سے ٹافیاں اور چاکلیٹ چرا چرا کر کھاتا رہا تھا.. اس لیے اپنے دانت کھو بیٹھا تھا..

ہم پتھروں سے اٹے گلیشیئر سے آگے ہوئے اور ایک برف سفید گلیشیئر پر اتر گئے.. اور اس کی سطح پر کرچ کرچ چلنے لگے کہ بوٹوں کے نیچے دبتی برف میں سے اعصاب پر اثر انداز ہونے والی یہی آواز مسلسل آتی تھی.. یہی آواز کرچ کرچ نے سنو لیک کے سفر کے دوران ذہن میں نقش کر کے رکھ دی تھا..

میں نے پیچھے نگاہ کی.. دور دور تک میرے ساتھیوں کا کچھ پتہ نہ تھا اور میں نے انہیں یوں مات دینے پر ایک انتہائی کمینی خوشی محسوس کی اور ذرا ہنہنایا..

اور جب میں ذرا ہنہنایا ہوں تو گونگا بابا رک گیا.. اور میری جانب ذرا بری نظروں سے دیکھا.. اگرچہ وہ گونگا تھا اور بہرا بھی ہو سکتا تھا لیکن وہ بہر حال ایک ہنہناہٹ تو سن سکتا تھا..

چنانچہ میں نے شرمندہ ہو کر مزید ہنہنانے سے گریز کیا اور چپکے سے اس کے پیچھے چلنے لگا.. بائیں جانب ایک خشک پہاڑی سلسلہ چلا جا رہا تھا اور جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے توں توں اس کے عقب میں سے برف پوش بلندیاں اور چوٹیاں ظاہر ہو رہی تھیں اور سرکتی ہوئی سامنے کے منظر میں داخل ہو رہی تھیں..

میں نے آج کے سفر کے لیے تین سگریٹوں کا بندوبست کر رکھا تھا.. میں کسی ایک مقام پر تھوڑی دیر کے لیے سانس درست کرنے کے لیے رکتا.. فلاسک میں سے گلوکوز کی آمیزش والے پانی کے دو گھونٹ بھرتا.. پھر سگریٹ سلگا کر تین چار کش کھینچنے کے بعد اسے پیکٹ میں بند کر کے دم بخت کر دیتا.. یوں ایک سگریٹ تین بار میرے کام آتا.. میں تمباکو کی غلامی سے آزاد ہونا چاہتا تھا لیکن کہ نفس کی ملکہ نے مجھے پوری طرح اپنے دام میں جکڑ رکھا تھا..

سفید گلیشیئر کا بھی اختتام ہوا اور ایک بار پھر اس کی سطح کو پتھروں، بجری اور سنگریزوں نے مکمل طور پر ڈھک لیا..

ٹافیوں کا رسیا گونگا بوڑھا ان ایک بلندی پر پہنچ اور اپنی لاٹھی لہراتا اور بوڑھی مسکراہٹ بکھیرتا مجھے اوپر آنے کے لیے اشارے کرنے لگا..

میں اپنے ٹوٹتے بکھرتے سانسوں سے اندازہ لگا رہا تھا کہ ہم بلند سے بلند تر ہوتے جا رہے ہیں.. نامعلوم انداز میں اونچے ہو رہے ہیں.. بڑی مشکل سے.. ہر لمحہ اپنے بلڈ پریشر کا خیال رکھتے.. یہ خیال رکھتے ہوئے کہ اس عمر میں اتنی بلندی پر کہیں دل کی شریانوں میں کوئی رکاوٹ نہ آ جائے.. دھیرے دھیرے اس سانس کو جو تن بدن سے نکلا جاتا تھا منت سماجت کر کے اسے روکتا سنبھالتا اوپر بالآخر گونگے شاہ کے پاس پہنچ ہی گیا..

اور اس سے خشک بلندی سے پرے نرس خان کے اشارے کرنے سے پہلے ہی میری نظر اس منظر تک سرک گئی..

"درہ گندوگورو کے دامن میں چار خیمے .. لٹل باسٹرڈز"

وہ جو مقدس کتابوں میں کہا جاتا ہے کہ Lo & Behold..

تو یہاں بھی... Lo & Behold... سامنے ایک پیالہ نما میدان تھا.. خشک بلندی سے نشیب میں.. برف کی برف پہاڑوں کے دامن میں ایک پیالہ نما میدان تھا جس پر دھند کے آثار تھے.. ایک پُرشور ندی تھی جو اس میدان میں اترتی تھی لیکن یہاں سے اس کا شور سنائی نہیں دیتا تھا.. برفوں میں سے اتر کر نیچے آ رہی تھی تو یقیناً پُرشور تھی.. میدان کے اوپر ڈھلوان پر کچھ پتھریلی آبادیاں تھیں جن کے آگے نیچے ذروں کی قطاریں تھیں اور ان کی نیلاہٹ پورے منظر میں سے الگ اور شوخ دکھائی دیتی تھی..

اور اس پیالہ نما وسیع میدان میں.. برف زاروں کی گود میں.. دھند میں.. پُرشور ندی کے پیچھے.. اس میدان میں جس پر بے پناہ برفیں ہر جانب سے جھکتی جاتی تھیں اور برفیلی ندیوں کے پانی چلتے تھے.. وہاں ایک وسیع خیمہ گاہ تھی.. جس میں ہر رنگ اور ہر نسل اور ہر سائز کے بے شمار خیمے ایستادہ تھے.. اگرچہ یہاں سے وہ نیچے تھیں خیموں کے کھونے لگ رہے تھے.. رنگوں کے دھبے لگتے تھے.. ایک دنیا وہاں آباد تھی..

یہی ہسپاں تھا..

مجھے اتنی آبادی کی توقع نہ تھی..

اور اس ہسپاں کے اوپر گندوگورو کی چوٹی اور درہ تھا.. اور درے پر حیرت انگیز طور پر برف کے ڈھیر نہیں تھے بلکہ خشک چٹانوں کے اوپر برف کی ایک لکیر تھی.. اور لیلے بھی تھی..

وہ میرے ساتھ ساتھ چلتی چلتی ہسپاں تک پہنچ گئی تھی اور اب اس پر سایہ فگن ہوتی تھی..

ایک عجیب منظروں والی برفانی بلندیوں کے دامن میں پھیلی ایک انہونی سی دنیا تھی..

جیسے تیس برس پیشتر میں نے ایک ناول سوچا تھا کہ ایک کوہ نورد تقی کے درے کو پار کر کے جب دوسری جانب اترتا ہے تو وہاں دھند میں ایک شہر آباد دکھائی دیتا ہے.. اور شہر موہنجو داڑو کا ہے.. وہی گلیاں.. وہی حمام اور غلے کے گودام اور وہی لوگ... پانچ ہزار برس پہلے کے وہی لوگ جنہوں نے آریائی حملہ آوروں سے فرار ہو کر ان دور افتادہ برفانی وادیوں میں آ کر پھر سے اپنا شہر اسی شکل میں تعمیر کر لیا تھا اور نہیں جانتے تھے کہ پانچ ہزار برس گزر چکے ہیں اور باہر کی دنیا بدل چکی ہے اور یہ کوہ نورد اس شہر میں اتر کر انہیں بتاتا ہے کہ باہر کی دنیا کیا تھا اور ہو چکی ہے...

لاہور کے شیزان ریستوران میں.. ذوالفقار تابش کی موجودگی میں... میں نے اس ناول کی آؤٹ لائن اپنے پسندیدہ مصنف ابن انشا کو سنائی.. ڈرتے ڈرتے کہ یہ کچھ عجیب سی آؤٹ لائن تھی.. اور مجھے اب تک یاد ہے کہ ابن انشا نے اپنے موٹے شیشوں کی عینک اتار کر مجھے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تھا اور کہا تھا.. تارڑ تم سب کام کاج چھوڑ دو.. دنیا ترک کر دو لیکن یہ ناول ضرور لکھو.. یہ تمہارا بہترین کام ہو گا.. اور میں نے کہا تھا کہ میری سمجھ میں ابھی اتنی تخلیقی سکت نہیں اور یہ آئیڈیا بھی عجیب اور انوکھا سا ہے.. تو ابن انشا نے کہا تھا.. کبھی نہ کبھی تم میں یہ سکت پیدا ہو جائے گی.. اس آئیڈیے کو فراموش نہ کرنا.. یہ تمہارا بہترین کام ہو گا..

تیس برس گزر گئے ہیں لیکن مجھ میں ابھی وہ سکت پیدا نہیں ہوئی..

ہسپاں کو.. عجیب منظروں والی برفانی بلندیوں کے دامن میں پھیلے ہسپاں کو دیکھ کر مجھے ایک عرصے کے بعد ابن انشا کا خیال آیا.. اس لیے کہ گمشدہ موہنجو داڑو ایک ایسی ہی بلند اور نامعلوم وادی میں ہو سکتا تھا..

لیکن اس پورے منظر میں ایک اور منظر تھا..

ایک.. اس منظر سے پرے ایک اور الگ منظر تھا جس نے مجھے تباہ کر دیا..

شعلہ جس نے مجھے چھوا تھا بس اسی الگ منظر سے اٹھا تھا..

اس وسیع پُرہجوم خیمہ گاہ سے پرے.. درہ گندوگورو کی جانب جو راہ تھی.. وہاں برف پانیوں کے پچھواڑے کے کناروں پر.. ایک مکمل تنہائی میں.. جہاں.. اور کوئی نہ تھا وہاں سب سے جدا چار خیمے ایستادہ تھے..

اور ایسے خوش نظر لگتے تھے جیسے یہ پورا منظر.. درہ گندوگورو کے دامن میں یہ منظر صرف

انہی چار خیموں کے لیے تحقیق کیا گیا تھا..

وہاں "ہاؤس آف ایڈیشن ریز ورڈ" کی تختی تب تک لگی رہی تھی جب تک کہ یہ چار خیمے وہاں نہ پہنچے اور اپنا دائٹ کیمپ نہ کیا..

وہ چار خیمے خوابناک لگتے تھے..

دسپاں کی خیمہ گاہ کی بھیڑ اور شور سے بہت پرے.. گندو گورو کی وادی میں.. پانیوں کے کنارے چار خیمے.. خوابناک لگتے تھے..

اور میں نے انہیں دیکھتے ہوئے سوچا.. کہ یہ جن کوہ نوردوں کے بھی خیمے ہیں وہ کتنے کی باسٹرڈز ہیں..

کاش کہ میں ان کی باسٹرڈز میں شامل ہوتا..

میں نے ٹونگا پہاڑوں کو رشوت کے طور پر تین چار ٹافیاں پیش کیں اور اشارے سے کہا کہ بابا ارشیں اب تم بے شک مت رکو.. میرا انتظار نہ کرو... بے دریغ چلے جاؤ کہ میں نے منزل دیکھ لی ہے.. تم چلو میں پہنچ جاؤں گا..

مجھے اس بلند خیمہ گاہ تک پہنچنے اور اس میں اترنے میں بیس منٹ لگے.. اور جب اترا ہوں.. تو وہاں بلند برفانی ٹھنڈک شفاف ہوا کی پرتیں تھیں.. ایک بو تھی..

اپنی کوہ نوردی کی آخری منزل میں اترا ہوں تو خیمہ بستی میں ایسے وہ غیر ملکی ٹیموں کے رنگ رنگ خیمے.. آرام دہ خیمے.. کچن ٹینٹ اور ڈائننگ ٹینٹ اپنی جگہ.. لیلے پیک کا بے مثال عکس اپنی جگہ جو ان خیموں کے برابر میں ٹھہرے ہوئے پانیوں میں ٹھہرا ہوا تھا.. اور چودہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند دسپاں میں پہنچ جانے کی چھلکی چھلکتی ہوئی بے پایاں مسرت اپنی جگہ لیکن وہاں ایک بو تھی..

اور یہ انسانی فضلے کی ناقابل برداشت بو تھی.. جہاں کہیں پتھروں کی اوٹ تھی وہاں میں نے استعمال شدہ ٹائلٹ پیپر بھی سرسراتے ہوئے اڑتے اور دیکھے..

عامر نے کیا خوب کہا تھا کہ تارڑ صاحب.. ہم اگرچہ اپنے آپ کو اشرف المخلوقات گردانتے ہیں لیکن ایک معاملے میں چوپایوں سے.. پرکھا جاتے ہیں.. یعنی ان کی غلاظت ہمیں ڈسٹرب نہیں کرتی.. گاؤں میں بھینسوں کے گوبر سے اُپلے تھاپے جاتے ہیں اور کچھ ناگواری نہیں ہوتی.. بکریوں اور بھیڑوں کی مینگنیاں ہماری طبیعت کو ناگوار نہیں اور ہم ان کی نزدیکی سہہ سکتے

ہیں.. ان پر بیٹھے لگ سکتے ہیں.... پرندوں کی بیٹ اور بچھوؤں کا گوبر ہمیں بالکل اپ سیٹ نہیں کرتا لیکن حضرت انسان کا تمام فضلہ کچھ ایسا ہے کہ اگر آپ کے آس پاس صرف ایک انسان کی بیٹ ہو تو وہ برداشت سے مکمل طور پر باہر ہو جاتی ہے.. اس کی بو کو سہارنا ممکن نہیں ہوتا..

پائیو میں بھی یہی پرابلم تھی..

اور دسپاں کی خیمہ گاہ میں بھی جو برفیلی سرد ہوا تھی.. اس میں بھی اسی انسانی "کمال" کی بو تیرتی تھی اور برداشت سے باہر ہوتی تھی..

ہسپانوی میڈم بھی اسی بو سے نالاں ہو کر مجھ سے شکایت کرتی تھی..

میں جب اپنے قدم.. اور ان قدموں میں جو بوٹ تھے، انہیں گھسیٹتا اس خیمہ گاہ میں اترا.. جو گندو گورو کے بیس کیمپ دسپاں میں اترا.. اس میں داخل ہوا.. بو کو بڑی مشکل سے برداشت کرتا اس میں داخل ہوا تو دائیں جانب ایک ٹھنڈے میدان میں ان سینکڑوں کوہ نوردوں کے خیمے پُر ہجوم تھے جو آج سویرے کے کو سے واپس پر گندو گورو کا درہ عبور کر کے.. ان میں سے بیشتر اس کی چوٹی سر کر کے یہاں اترے تھے..

اور ان پانیوں کے کنارے تھے جن میں لیلے پیک کی لینے اور لیلے برفیں عکس ہوتی جاتی تھیں اور ان پانیوں کے کنارے میں نے ایک سرخ.. تیز آتشی سرخ بالوں والی کوہ نورد لڑکی کو بالوں میں کنگھی کرتے دیکھا..

قدرتی سرخ بالوں والی لڑکیاں یورپ میں بھی کم کم ہوتی ہیں..

اور جن کے بال کسی ڈائی کے دم سے رنگ کے ہوتے ہیں وہ بھی اس امر سے آگاہ ہوتی ہیں کہ محض بالوں کی رنگت کی وجہ سے انہیں جنسی شدت کی علامت سمجھا جائے گا، وہ اپنے بالوں کو سرخی میں رنگتی ہیں..

سٹاک ہوم کی ایک رات میں.. ایک ایسی ہی قدرتی سرخ بالوں والی بھری بھری لڑکی تھی جس نے ریستوران کے ڈانس فلور پر مجھ سے مکمل بے اعتنائی برتی تھی اور پھر مجبوراً کہا اس کے فیٹ ور... رات کے اس کے کوئی پروگرام نہیں ہوتی تھی میرا ساتھ دیا تھا..

اور اس نے مجھے آگاہ کیا تھا کہ محض بالوں کی سرخی کی وجہ سے کسی لڑکی کو آسان اور جذباتی سمجھ لینا حماقت ہے..

تو یہ سرخ بالوں والی لڑکی لیلے پیک کے عکس کے سامنے اپنے بال سنوارتی تھی.. ان

میں منگنی کی گئی تھی..

ہسپاں کی خیمہ گاہ میں دائیں ہاتھ پر تو خیموں کی دنیا تھی اور بائیں جانب پہاڑ کی اوٹ میں متعدد پتھریلی چار دیواریاں تھیں جن میں ان غیر ملکی کوہ نوردوں کے ہمراہ آئے ہوئے پورٹر قیام کرتے تھے اور اگلے روز شائد چوٹی تک پہنچ جانے کی آرزو کرتے تھے جہاں ان کو پورے ٹریک کی مزدوری مل جاتی تھی.. اور انہوں نے حصول ہو کر اپنے گھروں کو.. اپنی ایک یا دو بیویوں کے پاس لوٹ جانا تھا..

میں اس خیمہ بستی میں داخل ہوا تو وہاں کوئی ہیجان پیدا نہ ہوا..

کسی نے پروا نہ کی کہ کون آیا ہے..

کسی بھی غیر ملکی کوہ نورد نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا..

صرف چند ایک پورٹروں نے مجھے حیرت سے دیکھا.. اس لیے دیکھا کہ میں یہاں تک پہنچنے والا پہلا پاکستانی تھا..

البتہ ایک وحشی داڑھی والے گائیڈ نے مجھے جانے کیسے اس خستہ حالت میں پہچان لیا اور چائے کی ایک پرخلوص دعوت دی..

ایک اور پورٹر جو نہایت بلند قامت تھا اور جس کی مسیں ابھی بھیگی نہ تھیں میرے استقبال کے لیے آگے آیا اور ذرا جھجکتے ہوئے بولا "صاحب میں نے آپ کو پہچان لیا ہے.. آپ تارڑ صاحب ہو ناں!"

"کیسے پہچان لیا ہے؟" میں نے اپنی اس خوش نصیبی پر نازاں ہو کر سوال کیا.. جی ہاں.. کم از کم میرے ایسے لوگوں کے لیے تو ایک بہت بڑی خوش نصیبی ہوتی ہے کہ آپ پہاڑوں کے اندر ایک دّرے کے دامن میں اترتے ہیں اور وہاں آپ پہچانے جاتے ہیں..

"سر میں شمشال کا رہنے والا ہوں.. دو برس پیشتر جب آپ ہماری وادی میں اترے تھے تو آپ نے یہی نیلی جیکٹ اور سفید چترالی ٹوپی پہنی ہوئی تھی.. میں نے آپ کو شکل سے نہیں لباس سے پہچانا ہے.."

"تم یہاں.. اپنی وادی سے اتنی دور.. یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں ادھر روزگار کے لیے آیا ہوں.. بوجھ اٹھاتا ہوں.. پورٹر ہوں.. میں نے آپ کا کتاب "شمشال بے مثال" پڑھا ہے.. شمشال کے سب لوگوں نے پڑھا ہے.. اردو میں ہمارے

علاقے کے بارے میں پہلا کتاب ہے سر.. اور اب کچھ لوگ یہ کتاب پڑھ کر ہماری وادی میں بھی آنے لگے ہیں سر.."

یہ کیسی خوش بختی ہے کہ آپ کوہ نوردی کی داستانیں اپنے جنون کی تسلی کے لیے لکھتے ہیں.. کسی آگہی اور ادبی جذبے کے تحت نہیں لکھتے.. کسی مقصد کے لیے نہیں تحریر کرتے اور پھر بھی کچھ غیر معروف وادیاں.. ان کی وجہ سے معروف ہو جاتی ہیں..

کبھی کوئی فیری میڈو.. کبھی ترشنگ اور کبھی شمشال!

وحشی داڑھی والے.. فرینڈلی گائیڈ نے مجھے ایک مرتبہ پھر اپنے ڈائننگ ٹینٹ میں چائے کی دعوت دی لیکن میں اس نیم کیمپ میں اترتے ہی عیش و عشرت میں مبتلا نہیں ہو جانا چاہتا تھا.. پہلے اپنے ان پورٹروں کو تلاش کرنا چاہتا تھا جو مجھے اور گوگلے پہلوان کو راستے میں چھوڑ کر آگے نکل گئے تھے اور اب اس وحشی دنیا میں کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے..

پتھریلی آماجگاہوں میں چہل قدمی کرتے ہر پورٹر کے چہرے کو میں غور سے دیکھتا تھا کہ کہیں یہ وہ تو نہیں.. اور یہ کوئی اور ہوتے تھے.. میرے پورٹر نہیں ہوتے تھے..

میں ایک لاوارث گمشدہ بچے کی مانند ہسپاں کے اس میلے میں شناسا چہرے تلاش کرتا تھا.. اور وہ کہیں بھی نظر نہیں آتے تھے..

تب میں نے اس بستی سے پرے.. شوریدہ ندی کے پار ڈھلوان پر جو پتھریلی آماجگاہیں معلق تھیں اور وہاں خیمے نصب تھے.. وہاں اپنے گوگلے پہلوان کو اشارے کرتے دیکھا کہ ادھر آ جاؤ.. ادھر آ جاؤ..

ادھر جانا اتنا آسان نہ تھا..

ان ڈھلوانوں اور خیمہ بستی کے درمیان شوریدہ ندیا جو بہہ رہی تھی.. گدلی اور ابلتی برفوں میں سے جنم لیتی پگھلتی.. بلندی کی برفوں کی رفتار میں سے ظاہر ہوتی نیچے آ رہی تھی.. لیکن اس کے پانیوں میں چند پتھر ایسے ابھرتے تھے جن پر احتیاط سے قدم جما کر دوسری جانب جایا جا سکتا تھا.. دوسری جانب تھوڑی سی چڑھائی تھی جس کے اوپر کچھ کوٹھڑیاں اور غاریں سی تھیں جن میں پورٹر بسیرا کر رہے تھے اور مختلف مہموں کے سامان کے تھیلے اور ڈرم قطار اندر قطار رکھے تھے.. میں اپنے گوگلے پہلوان کے پاس پہنچا اور اس سے دریافت کیا کہ.. جیسے ایک کوئی دوسرے گوگلے سے دریافت کرتا ہے کہ اے گوگلے ہمارے پورٹر کہاں مر گئے ہیں.. خیمہ بستی میں تو نہیں ہیں.. اور کمبخت

تو اِدھر کیا کر رہا ہے.. ہٹ سے گا تو تالی دوں گا..

اور تب گرتے پہلوان نے خون خالی کر کے گندو گورو کی وادی کے نشیب کی جانب اشارہ... درے سے نیچے آنے والی پگڈنڈی کے دامن میں ندیوں اور گھاس کے میدانوں کے کنارے جو خوابناک منظر والے پُر شہزادے خیمے راج کرتے تھے ان کی جانب اشارہ کیا..

میرا دم رک گیا.. وہ ہمارے خیمے تھے..

وہ شاندار رنگ برنگے.. ہسپاں کی جھیل اور بوٹے پرے.. پانیوں کے برابر میں عظیم برفانی چوٹیوں کے آمنے سامنے سب سے الگ تھلگ جو چار خیمے تھے، جنہیں میں نے گلیشیر سے اترتے ہوئے دیکھا تھا اور حسد کیا تھا ان پر مقدر کی قسمت پر جن کے وہ خیمے تھے.. اور وہ تو ہمارے تھے..

ہمارے کسی پورٹر نے پہلی بار ذوقِ جمال کا مظاہرہ کیا تھا..

میں نے رشک کیا تھا کہ وہ کون سے کی باسعادت ہیں جن کے یہ خیمے ہیں.. تو اب یہ کھلا کہ یہ ہم تھے.. شرمندگی بھی ہوئی کہ خوامخواہ بے احتیاطی کی اور اپنے آپ کو یہ کیا کہہ دیا..

میں نے خوش ہو کر گرتے پہلوان کو انعام کے طور پر متعدد دعائیں پیش کر دیں..

ہم دوسری جانب اپنے خیموں کی طرف اترنے لگے..

خیموں کے آگے ٹھہرے ہوئے پانیوں اور ندیوں کی ایک وسیع گزرگاہ تھی جس کے پار پتھروں کا ایک میدان تھا اور ان کے اوپر برفیلی چوٹیاں جھکی ہوئی تھیں..

دائیں جانب وہی ہسپاں کی وسیع خیمہ گاہ دکھائی دے رہی تھی اور پہلے لیلے بیک وہاں تھی اور اب میرے ساتھ چلتی چلتی خیموں کے عقب یا سامنے آ کھڑی ہوئی تھی..

بائیں ہاتھ پر ایک مختصر وادی وہاں تک چلی جاتی تھی جہاں وزو گندو گورو کی پناہیں اور بلندیاں اس کا راستہ روک کر بلند ہو جاتی تھیں اور وہاں دھند تھی..

میں نے اپنا چہرہ اور رک سیک کندھے سے اتارا.. ٹانگ ملک گھاس پر پھیلائی اور زمین پر لیٹ گیا.. زمین میں ہلکی نمی اور ٹھنڈک تھی..

"ہسپاں کی شام.. پکوڑے اور لیلے او لیلے.."

اسحٰق نے ملتے کے رنگ کا زرد شربت بنا کر مجھے پیش کیا اور اس کے متعدد گلاس چڑھا جانے کے بعد قدرے تر و تازہ ہوا اور اس تنہائی سے لطف اندوز ہونے لگا جس میں ابھی تک میرا کوئی ساتھی شریک نہیں تھا..

تھوڑی دیر بعد مجھے خیال آیا کہ مجھے اپنے ساتھیوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے واپس خیمہ بستی میں جانا چاہیے جہاں انہوں نے اترنا تھا.. انہوں نے اترتے ہوئے بھٹکتے رہنا تھا کہ ان کے گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ہمارے خیمے ادھر ہیں.. میں واپس ہوا.. اطاعت پر چڑھ کر نالے تک گیا اور پہلی بار اوپر دیکھا جہاں سے نالہ اتر رہا تھا.. اوپر ایک یکتا خوبصورتی کی برفانی بھری برف بھری لینڈ سکیپ تھی جس پر دھند اتر رہی تھی اور اس لمحے اس دھند میں سے ایک غیر ملکی کوہ نورد اتر رہا تھا جو شاید آج صبح ہی اوپر گیا تھا اور اب شام ڈھلے ہسپاں واپس آ رہا تھا..

خیموں سے آگے میں اس مقام پر جا کھڑا ہوا جہاں سے میں ابھی ابھی اترا تھا.. پھر میرے ساتھی ایک ایک کر کے گلیشیر پر نمودار ہونے لگے اور آہستہ آہستہ نیچے آنے لگے.. میں آگے بڑھ کر انہیں خوش آمدید کہتا اور پھر ایک بچے کی طرح ان سے پوچھتا کہ ذرا ایک نظر اس درے کے وسیع دامن پر ڈالیے اور ذرا اندازہ لگائیے کہ ہمارے خیمے کہاں ہو سکتے ہیں..

وہ تھکے ہاروں کے خیموں کے انبار میں اپنے خیمے تلاش کرنے لگتے اور جب وہ کہیں نظر نہ آتے.. ان کا سراغ نہ ملتا تو میری طرف دیکھتے نا اہل نظروں سے کہ وہ گم گشتہ ہوئے تھے اور میں ایک چوڑی مسکراہٹ سے ہسپاں ندی کی جانب اشارہ کرتا.. اس مقام کی جانب جو ان کے گمان میں بھی نہ تھا..

مجھے خاص طور پر حسن کا انتظار تھا.. اور جب وہ برمائی کی زیر نگرانی خیمہ گاہ میں داخل ہوا تو ہم سب نے تالیاں بجا کر اس کا استقبال کیا کہ وہ آج کا "ہیرو" تھا.. چوٹی اور تقریباً ہمت کے باوجود وہ یہاں تک پہنچ گیا تھا.. اس کے حوصلے اور ہمت کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی.. اور اس کے چہرے پر تازگی تھی..

ہم سب ایک قافلے کی صورت خیمہ بستی میں سے گزر کر.. نالے کے پار ہو کر.. اپنے خیموں تک چلے گئے..

اور جب پہنچے تو سب کی تھکاوٹ اور پژمردگی رو دو گئی.. اور ہر کوئی چہکنے لگا.. حسن اپنے پیارو کا بھی حال اچھا تھا.. اس کے منہ پر رونق آ گئی تھی..

"کیوں سلمان.. کیسا منظر ہے اور کیا مقام ہے" میں نے اسے داد طلب نظروں سے دیکھا..

"او کے ہو گئے.. انکل سر جی.."

"اور خپلو میں تم کہتے تھے کہ سر جی کیمپ ون میں چند روز گزار کر واپس چلتے ہیں، آگے جا کر کیا کرنا ہے۔"

"آپ بھی تو کہتے تھے سر جی.. میں نے تو جھک ماری تھی آپ بھی اقرار کیجیے۔" وہ اتنا پر مسرت ہو رہا تھا کہ اس نے فوراً کھڑے ہو کر اپنی ہتھیلیاں پیچھے کرتے ہوئے اپنا بدن چیک کیا۔ "سر جی بھنگڑا ڈال کر دکھاؤں؟"

حسن تو ٹھیک ہو چکا تھا لیکن برمائی کی حالت کچھ غیر ہو رہی تھی... کبھی وہ کان میں کھجلی کرتا تھا.. کبھی بدن کو کھجانے لگتا.. اور کبھی ٹوپی کھینچ کر بالوں کو سنوارنے لگتا.. اٹھتا اور ٹہلتا پھر بیٹھ جاتا.. کبھی خیمے کے آگے چوکڑی مار کر لیٹے پیک کو تکنے لگتا اور کبھی سامنے بہتی ندیوں کو پھلانگتا ان کے درمیان کسی پتھر پر جا بیٹھتا اور بکری اور سرے کے جنگلے "بے تحاشا" کا پوچھ کر.. سوچ بچار میں گم ہو جاتا..

میاں صاحب بھی اس منظر میں پہنچ کر اتنے راضی ہوئے کہ انہوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہد کے کندھے پر ایک دھپ لگا کر کہا "خاں صاحب آج آپ بے شک میرے خیمے میں ہو جاؤ.. اور بے شک خراٹے پر خراٹے مارو تمہیں ڈر کس کا ہے.. آج تو اجازت ہے۔"

"ہاں بھئی سلمان.. تم یہاں گڈی نہیں اڑاؤ گے.. یہ تو گنڈوگورو کا بیس کیمپ ہے۔"

سلمان ورلڈ چیمپئن گڈی باز ہے جس نے "سنولیک" پر جا کر بھی گڈی اڑانے کی کوشش کی تھی.. کہتے ہیں چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا.. اسی طور ایک لاہوریا بے شک امریکہ اور آسٹریلیا ہو آئے تو کوشش ہوتا تھا لیکن گڈی اڑانے سے باز نہیں آتا.. اس بار وہ دیسی گڈی کی بجائے ایک ریڈی میڈ امریکی کائٹ لے کر آیا تھا جو اس نے شاگی چوٹی میں اڑائی تھی.. یہ کائٹ سے سکس اور کے پیدوں کی بیڑوں کے آس پاس تو دیر اڑتی رہی لیکن اس میں لاہوری گڈی والا تھرل نہ تھا.. نہ یہ کنی کھاتی تھی نہ یہ مدہوشی سے کنڈھے مارتی تھی اور نہ ٹھرا کے چڑتی تھی.. بس ایک شریف بی بی کی مانند ہمارے بغیر اڑتی چلی جاتی تھی.. شاہد صاحب نے بھی اس کی سادہ ڈوری ہاتھ میں لے کر اسے مزید بلند کرنے کی کوشش کی.. اور اس دوران جب ایک قدرے کوہ نورد خاتون قریب سے گزری تو اس نے بے حد حیرت سے اس کائٹ کی اڑان کو دیکھا تو شاہد صاحب نے فوراً پیشکش کر دی۔ "لولی کائٹ.. ویلکم لیڈی۔" لیکن لیڈی نے یہ پیشکش قبول نہ کی بلکہ جواب دینا بھی گوارا نہ کیا اور ایک چڑھی ہوئی تیوری کے ساتھ اپنے خیمے کی جانب چلی گئی..

"تم نے خواہ مخواہ بے عزت ہو کر ہوتا ہے خاں صاحب" میاں صاحب اس روز جلال میں تھے۔ "دیکھا یہ گوری کو یا کستانی ایسے ہوتے ہیں۔"

"اور کیسے ہوتے ہیں میاں صاحب" شاہد صاحب ترنگ میں تھے اور ابھی نہیں جانتے تھے کہ آج شام انہیں خیمے سے باہر نکال دیا جائے گا۔ "دیکھیں نا یہ تمہیں ہمارے مہمان ہیں اور مہمان نوازی کے کچھ آداب ہوتے ہیں.. میں نے انہیں کائٹ اڑانے کی پیشکش کی تو انہی آداب کے تحت کی.. وہ نہیں مانی تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ہاں بے عزتی بے شک ہو جائے کیا فرق پڑتا ہے" میاں صاحب بڑبڑائے..

اس دوران ایک اور خاتون ادھر سے گزریں تو شاہد صاحب نے پھر صلح دے دی۔ "گڈ کائٹ میڈم.. فلائی کائٹ.. پاکستانی سمر"

یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ اس خاتون نے بھی..

تو جب یہاں گنڈوگورو کے بیس کیمپ میں بھی ضروری تھا کہ فلائی کائٹ کی جائے اور کم از کم اس لیئے "وہ" "بو" کر کے خوشی لوٹ لی جائے.. تو میرے اس استفسار پر کہ سلمان یہاں گنڈوگورو کے بیس کیمپ میں گڈی نہیں اڑاؤ گے.. اس نے نہایت متانت سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں سر جی۔"

"کیوں؟"

"یہ بدتمیزی ہوگی سر۔ یہ ایسا منظر نہیں جسے نظرانداز کیا جائے... اس میں خلل ڈالا جائے۔" یہ ایک شاندار جمالیاتی دلیل تھی...

ہم اپنے خیموں کے آگے میٹرس والے کبھی بیٹھے کبھی لیٹے آس پاس کے سفید حسن کو آنکھوں میں اتارتے... بدن پر برف محسوس کرتے نہایت بڑی سپرٹس میں تھے... اور چونکہ ہم یہاں چودہ ہزار فٹ بلند تھے اس لیے سپرٹس بہت ہی بلند تھیں...

ہم اتنے سیانے تو تھے کہ ہم خوب جانتے تھے کہ یہاں سے مزید آگے جانا، کسی بالائی کیمپ تک پہنچنا اور پھر سنو لیک گوندوگورو کی چوٹی سر کرنا ہمارے بس سے باہر تھا۔ اس کے باوجود نہایت سنجیدگی سے چوٹی کو فتح کرنے کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوا اور منصوبہ بندی کی گئی...

اور ہاں ہسپاں کے راستے میں مَیں نے دونوں حسینوں میں سے بڑا جو اور مددگار حسین تھا اور کم عمر کا تھا، اس کے ساتھ میں نے ایک سازش کی تھی۔ "حسین تم بھی جان چکے ہوگے کہ آج میں تھوڑا ہو چکا ہوں، اس لیے امکان یہی ہے کہ میں اپنے ساتھیوں سے بہت پہلے بیس کیمپ پہنچ جاؤں گا تو آپ بتاؤ کہ وہاں سے وہ بالائی کیمپ کتنا دور ہے جہاں سے گوندوگورو کی چوٹی سر کرنے کے لیے نکلتے ہیں اور اس بالائی کیمپ سے بھی پہاڑوں کی سلطنت کی چند خوبصورت ملکائیں دکھائی دیتی ہیں..."

"صاحب ہسپاں سے صرف تین گھنٹے کا سفر ہے اور واپسی صرف ایک گھنٹے میں ہو جاتی ہے..."

"تو پھر حسین میں اور تم کچھ دیر آرام کر کے آگے چلیں گے... کیا خیال ہے؟"

"چلیں گے سر۔"

"کیا خیال ہے میں پہنچ جاؤں گا؟"

"آپ کہتا ہے کہ آپ تھوڑا ہو گیا ہے تو تھوڑے کے لیے تو کوئی مشکل نہیں۔"

چنانچہ یہ سازش ہو چکی تھی لیکن ہسپاں پہنچ کر اس سازش کے غبارے میں سے ہوا نکل گئی...

کیونکہ یہاں ہم ایسے منظر میں داخل ہو گئے تھے کہ اسے فوراً چھوڑ کر اوپر چلے جانا... کسی بالائی کیمپ کی جانب... جو جانے کتنا بڑی تھا اور تھوڑا ہو جانے کے باوجود... جانے کتنا بالائی تھا...

ایک کفرانِ نعمت تھا...

اور آپس کی بات ہے اور کچی بات ہے کہ میرا گھوڑا اچھا... میں جو اسپ تیز رفتار ہوا تھا... فلائنگ ہارس ہو گیا تھا تو یکدم ہسپاں میں پہنچ کر میری تمام تر ہارس پاور زیرو ہو گئی۔ یعنی میری بیٹریاں ڈاؤن ہو گئیں بلکہ ڈاؤن اینڈ آؤٹ ہو گئیں۔ پنڈلیوں میں ٹیسیں اٹھنے لگیں... پاؤں سن سے ہو گئے اور مجھ میں قطعی طور پر اتنی سکت نہ رہی کہ خیمے سے رک سیک اٹھا کر اس بالائی کیمپ کی جانب چڑھنے لگوں...

"صاحب بڑی کیمپ نہیں چلے گا؟" حسین نے گویا ہنک پاشی کی...

"نہیں چلے گا..."

"ہم پتا تھا کہ نہیں چلے گا۔"

بہرحال گوندوگورو کی چوٹی فتح کرنے کے بارے میں نہایت سنجیدگی سے غور و خوض ہوا... یہ منصوبہ بندی بالکل ایسے تھی جیسے ایک سپاہی اپنے ہتھیار ڈال کر... وردی اتار کر ایک نیکر میں ملبوس لیٹا ہو اور فوری طور پر میدانِ جنگ میں اترنے کی منصوبہ بندی کرنے میں مشغول ہو...

"پہلے تو ہمیں کسی بالائی کیمپ تک پہنچنا ہوگا... پھر پرسوں سویرے بارہ ایک بجے رات کے لگ بھگ گوندوگورو گلیشیئر کی برفوں پر چڑھتے ہوئے چوٹی کے دامن میں پہنچنا ہوگا... اور وہاں شنید ہے کہ سامنے ایک برف کی دیوار ہے جیسا کہ سکردو میں ہمیں بتایا گیا تھا۔ اس دیوار کے نیچے ہوشے کے چند بالائی پورٹر جنہیں RESCUE کہا جاتا ہے، ہم جیسے نااہل الدنیا اور غیر سیدہ کوہ نوردوں کے منتظر ہوں گے... وہ ہم سے تین سو روپے فی کس کے حساب سے چارج کریں گے کیونکہ انہوں نے اوپر چڑھنے کے لیے چوٹی تک رسے لگا رکھے ہیں... اگرچہ وہ ضروری مدد کریں گے لیکن ان رسوں کو تھامنا اور ان پر چڑھنا ہمارا ذاتی فعل ہوگا... اور یاد رہے ایسی برف دیواروں پر چڑھنے کے لیے بوٹوں تلے کرامپون باندھنے ضروری ہیں اور وہ ہمارے پاس نہیں تھے... بلکہ میاں صاحب کے پاس تو بوٹ ہی نہیں ہیں بقول شاہد... جاگنگ شوز کے کسی دیسی کے چمڑے کی کترنیں ہیں... بلندی بھی اندازہ ہزار فٹ سے زائد ہوگی اور ہم نے آج تک زیادہ سے زیادہ سترہ ہزار فٹ بلندی کی تھی اور مرتے مرتے بچے تھے... تو پھر ان رسوں کی مدد سے ہم بالآخر چوٹی پر پہنچ جائیں گے... اگر پھسل کر نیچے گہرائی میں گرنے سے بچ جاتے ہیں تو وہاں چوٹی سے نیچے کا زبردست نظارہ ہوگا... ہم تصویریں اتاریں گے اور پھر رسوں کی مدد سے شکوؤں کی مانند

پہنچ تو نہیں گئے.. اگر پہنچے تو نہیں گئے تو...؟"

"وہ فتح کریں گی گندو گورو کی چوٹی کو.. میں نے تو پہلے دن کہہ دیا تھا کہ اس کا نام بھی بڑا خشک لگ رہا ہے.. وہاں جا کر کیا کرنا ہے.. مرنا ہے؟.. یہیں ٹھہرتے ہیں اور پکوڑے کھاتے ہیں۔"

"پکوڑے؟"

"ہاں جی.." میاں صاحب نے مونچھوں کو ہلکا سا تاؤ دیا۔ "میں نے ابھی ابھی حسین سے بات کی ہے کہ ہمارے پاس بیسن ہے، نمک مرچ ہے.. بلکہ ہری مرچ ہے.. پیاز اور آلو ہیں تو کیا تم پکوڑے بناؤ گے.. تو وہ کہتا ہے کہ بنا سکتا ہوں.. میں لاہور کے کشمیری چوک میں پکوڑے ہی تو بیچتا تھا.. تو جناب عالی اس نے کڑاہی چڑھا دی ہے اور تیل چھناٹے مار رہا ہے تو ابھی تھوڑی دیر میں ادھر بیچوں میں آپ کو گرما گرم پکوڑے ملیں گے.. کاش کہ ہمارے پاس صرف ایک بینگن ہوتا.. بینگن کے پکوڑے تو بادشاہوں کی پکوڑے ہوتے ہیں۔"

"میاں صاحب.." میں نے موسم اور منظر کا مزا لیتے ہوئے انہیں چھیڑا۔ "ہم اس سے ایک ایسے بلند مقام پر براجمان ہیں، جس کے پس منظر کنکورڈیا کے برف زار ہیں.. وہی شاہ گوری ہے.. چوگو لیزا اور مترے پیک ہے.. براڈ پیک ہے.. اور یہ سامنے ہماری لیلیٰ اوڑھی لیٹی ہے.. پندرہ ہزار فٹ بلندی پر ایک تنہائی ہے جو صرف ہماری ہے اور آپ.. پکوڑوں کی بات کرتے ہیں.. حد ہے۔"

"کیوں حد ہے.." میاں صاحب چمک کر بولے۔ "جناب عالی مجھے پتہ ہے کہ آپ اپنا رانجھا راضی کر رہے ہیں.. جانتے ہیں کہ گندو گورو چوٹی پر چڑھنا آپ کے بس کی بات نہیں اور پھر بھی دل خوش کر رہے ہیں.. منصوبہ بندی کیے جا رہے ہیں۔"

"میاں جی.. میری تو ساری عمر ہی رانجھے راضی کرتے گزر رہی ہے.. کوئی ایک رانجھا راضی ہو جاتا ہے تو میرا ہاتھ تھام کر سنولیک تک لے جاتا ہے.. یاک سر اسے دکھا دیتا ہے اور اگر کوئی بھی رانجھا راضی نہیں ہوتا تو میں اپنے گھر میں قید ہو جاتا ہوں.. تو آپ مجھے اپنا رانجھا راضی کر لینے دیں.. آپ کا کیا جاتا ہے؟"

"جاتا کچھ نہیں جاتا۔"

"ویسے وہ اوپر والا رانجھا راضی ہو جائے تو سب کچھ ہو جاتا ہے.. ہم گندو گورو کی چوٹی پر بھی پہنچ سکتے ہیں.. وہ اپنی ونجلی پر ایک میٹھی تان سنا دے تو ہم اس کی دھن پر جھومتے

ہوئے.. گندو گورو تو کیا کے ٹو پر بھی چڑھ جائیں.. کیا خیال ہے؟"

"سر جی.." سلمان نے دلچسپ ورنہ معترض کیا۔ "کچھ تجریدی سی.. روحانی سی گفتگو شروع ہو گئی ہے.. آپ رانجھے کو چھوڑیں کسی ہیر کو راضی کریں۔"

"رانجھا تو بے پروا ہے.. وہ بے پروا جس کے ساتھ دل لگ جاتا ہے.. ہیر کو راضی کرنا بہت مشکل ہے۔"

میاں صاحب بور ہو گئے۔ "آپ نے جس کو بھی راضی کرنا ہے کریں.. میں پکوڑوں کا نمک مرچ چیک کر کے آتا ہوں۔"

اور تھوڑی دیر کے بعد جب سردی پندرہ ہزار فٹ بلندیوں پر اتر آئی تھی.. ہمارے سانسوں کو سفید کر رہی تھی تو ایک طشت میں سے گرما گرم، بھاپ دیتے.. وہ گندو گورو کے دامن میں.. اس کی وادی میں.. بیلے پیک کے آمنے سامنے.. پکوڑے آئے.. تو کیچپ کے ساتھ تو ہم سب کچھ منظر و نظر بھول گئے کہ ان پکوڑوں کا ذائقہ جنت کے میووں ایسا تھا.. اور ان میں خوبی یہ تھی کہ چٹنی نہ تھی، نمکین اور چٹ پٹے تھے۔

حسن صاحب حسب معمول اپنی صحت کے بارے میں احتیاط پسند تشویش میں مبتلا ہو رہے تھے.. فوراً اپنی منرل واٹر کی بوتل خیمے سے نکال لائے۔ "سر جی یہ پورٹر جو پانی ہمیں پلا رہے ہیں وہ کہتے تو یہی ہیں کہ چشمے کا ہے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ یہ سامنے والے گدلے تالاب میں سے بھر بھر کر لا رہے ہیں.. اس میں مٹی کے علاوہ پتہ نہیں کیا کیا ہے تو احتیاط کیجیے۔"

"حسن صاحب میں نے کبھی کسی معاملے میں احتیاط نہیں کی.. برالدو اور شیوک کا پانی پیا ہے.. بچپن میں گکھڑ منڈی کے جوہڑوں میں نہاتے ہوئے ان کا پانی بھی حلق سے اترا ہے.. مجھے کچھ نہیں ہوا۔"

"تب کچھ نہیں ہوتا تھا.. اب اپنی عمر کا خیال کریں.. احتیاط کریں۔"

"کیسے احتیاط کریں؟"

"صرف یہ منرل واٹر پئیں جو میں لاہور سے اتنی احتیاط سے اور سنبھال کے لایا ہوں.. مان جائیں۔"

چنانچہ میں مان گیا اور احتیاط کی..

پورٹروں کے فراہم کردہ گدلے پانی سے اجتناب کیا اور صرف منرل واٹر کے سفید

گھونٹ بھرے اور چھوڑے جائے.. بلکہ بقول میاں صاحب بکورے کھائے..

یہ ایک عجیب سرمست مدھری کیفیت تھی..

ہسپاں کی آلودہ جیتر بھری خیمہ بستی سے دور اکی واسطہ نہ تھا، ہم گندو گورو کی وادی کے باقاعدہ مہمان تھے.. ندیوں کے کناروں پر.. برفیلی اُجلی وادی چوٹیوں کے سامنے ہم بیٹھے تھے اور... بکورے کھا رہے تھے۔

ہر ٹریک کے دوران کم از کم ایک ایسی شام آجاتی ہے جو ساری مشقتیں اور کلفتیں بھلا دیتی ہے اور کہتی ہے کہ.. کیا میں تمہاری پوری زندگی کے لیے کافی نہیں ہوں.. تمہیں اور کیا چاہیے... بس.. یہ شام پیرس کے قدیمی نائٹ کلب مالن روژ میں.. روم کے ویا وینیٹو میں.. سٹاک ہوم کے گیٹاگاٹن، لندن کے پکاڈلی سرکس.. وینس کے گنڈولوں اور لاہور کی مال روڈ پر کہیں اتری.. صرف اس لئے چندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر وادی گندو گورو کے دامن میں.. لیلے پیک کے سامنے صرف تم پر اتری ہوں تو تمہیں اور کیا چاہیے..

اور کم از کم مجھے تو کچھ اور نہیں چاہیے تھا..

یکدم شام گہری ہوگئی..

نالے کے پار ہسپاں کی پرہجوم بستی کے خیمے دریکی میں چلے گئے اور وہاں کچھ لالٹینیں روشن ہوگئیں..

شام گہری ہوئی تو بے حد سرد بھی ہوگئی..

اس کی سردی ہمیں بے آرام کرنے لگی..

ہم ٹھٹھرنے لگے..

ہم بدستور بکورے کھاتے جاتے تھے اور ٹھٹھرتے جاتے تھے..

نالے کے پار ہسپاں کی خیمہ گاہ میں کچھ اور لالٹینیں روشن ہونے لگیں..

ان کے عکس ان پانیوں پر تھے جن میں لیلے پیک کی برفیں اتری ہوئی تھیں.. اور جب ہمارے بدنوں نے دہائی دے کر ہمیں خبردار کیا کہ اگر تم مزید اس شام میں.. اور اتنی بلند شام میں یونہی بکورے کھاتے رہو گے تو پچھتاؤ گے.. یونہی منجمد ہو جاؤ گے.. ایسی حالت میں اگلی صبح دریافت ہو گے کہ تمہارے ایک ہاتھ میں بکورا ہوگا اور دوسرے ہاتھ میں کچھ بھی نہ ہوگا.. تو ہم اٹھے اور بمشکل اٹھے.. سردی سے کڑکڑاتے بدنوں کو سنبھالے اٹھے اور اپنے خیموں میں چلے گئے.. اور

جب ایک بار خیموں میں چلے گئے تو پھر دوبارہ باہر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چاہے باہر ہیر اپنے رانجھے پلنگ پر لیٹی آ جاوے وصال کی بیل منڈھے...

اتنی سردی میں وصال کی خواہش بھی سکڑ جاتی ہے..

ہم نے اپنے خیموں میں ہی رات کا کھانا کھایا.. سویٹر اور جیکٹیں پہن کر اپنے سلیپنگ بیگز میں سمٹ کر.. کپکپاتے ٹھٹھرتے نیند میں جانے کی کوشش کرنے لگے..

"ہسپاں کی رات..اور لیلے پر ستارے گرتے تھے"

اس شب میں بے حد خوفزدہ ہوا۔۔

میں اگرچہ دو روز پیشتر کی تاپ پہ رات گزار چکا تھا جو ہسپاں سے دو ہزار فٹ زیادہ بلند تھی لیکن وہ گئے زمانوں کے قصے تھے۔۔

میں خوفزدہ صرف اس خیال سے ہوا کہ کہیں اس بلندی پر دل کے راستے میں کوئی اٹک نہ آ جائے۔۔کسی شریان میں کوئی رکاوٹ نہ آ جائے کہ سانس بھی رکاوٹ سے اٹک اٹک کر آتا تھا۔۔رکتا تھا اور اسے کھینچ کر لاتا تھا۔۔اور میں پوری شب اپنے آپ کو تسلی دیتا رہا کہ نہیں۔۔جو کچھ ہوتا ہے اس بلندی پر۔۔ایک نامعلوم ہرزے کی وادی میں تو نہیں ہوتا۔۔اگر دل نے رکنا ہے۔۔کچھ نہ کچھ ہونا ہے تو براہ کرم تھوڑا انتظار کرے۔۔مجھے مہلت دے اور واپس پہنچنے پر جو دل کے دل میں آئے بے شک کر لے۔۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ دل بھی اسی کیفیت میں ہوتا ہے اور پوری شب خیمے سے باہر ٹہلتا رہا ہے۔۔ورنہ کچھ تسلی ہو جاتی کہ جو میرا حال ہے وہ سب کا حال ہے۔۔

ویسے بلندی پر اگر بے چینی اور بے اطمینانی کی کیفیت ہو تو لیٹے رہنا مناسب نہیں ہوتا۔۔اٹھ کر بیٹھ جائیں یا اس سے بہتر ہے کہ خیمے سے باہر نکل کر ٹہلنے لگیں تو قدرے افاقہ ہو جاتا ہے۔۔طبیعت "سنبھل" جاتی ہے۔۔

میں نے وہ شب شدید اداس۔۔موت کی قربت کے خوف میں گزاری۔۔

ایک اور خدشہ تھا۔۔

نہایت عامیانہ اور انسانی خدشہ۔۔کہیں اس تجمدات میں مجھے مجبوراً خیمے سے باہر نہ نکلنا

پڑے۔۔کہیں شدت سے پیشاب کی حاجت نہ ہو جائے کہ تب مشکل ہو۔۔اپنے آپ پہ کنٹرول کرنا ممکن نہ ہو اور خیمے سے باہر ہونے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہو۔۔

اور یہی ہوا۔۔

اگرچہ میں نے پیش بندی تو بہت کی تھی۔۔چائے تک نہ پی تھی۔۔خیمے میں جانے سے پیشتر اپنے آپ کو فارغ کیا تھا لیکن اس سردمہری کی شب میں ایک لمحہ آن گیا جب تمام تر ضبط کے باوجود اس بے اختیاری نے مجھے بے اختیار کر دیا اور میں اپنے سلیپنگ بیگ میں سے سرکتا ہوا حسن اور سلمان کے درمیان میں سے کھسکتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا۔۔

باہر آ کر میں نے ذرا دور جانے کا ارادہ نہ کیا۔۔

کہ باہر ایک شدید سردمہری تھی۔۔ایک لپ لپ منجمد کرنے والا سکوت تھا۔۔

وہ تشتری ابھی تک گھاس پہ پڑی تھی اور اس میں بچے ہوئے چند پکوڑے سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔۔

میں نے دور جانے کو ترک کیا اور ٹھٹھرتے ہوئے اس بوجھ سے نجات حاصل کی جس نے مجھے باہر آنے پر مجبور کر دیا تھا۔۔

خیمے کے اندر واپس جانے سے پیشتر جونہی میں نے آس پاس نگاہ کی۔۔تو میں سردی سے نہیں حیرت سے منجمد ہو گیا۔۔مجھے احساس ہوا کہ دراصل مجھ پر واضح ہو گیا تھا اور اس نے پیشتر کا یہ بہانہ میرے لیے تخلیق کیا تھا تاکہ میں خیمے سے باہر آؤں اور اس سرد رات میں اس کی عظیم قدرت کا مشاہدہ کروں۔۔جو کچھ اس نے تخلیق کیا وہ دکھانے کے لیے اس نے مجھے اپنے خیمے سے باہر نکالا تھا۔۔

اس لیے کہ اس نے۔۔میرے راستے نے وہ سب کچھ۔۔وہ بلندیاں، برفیں، سکوت۔۔

لیلے۔۔ندیاں اور یہ رات صرف میرے لیے بنائی تھیں۔۔

میرے لیے بنائی تھیں تو وہ کیسے مجھے نہ دکھاتا۔۔

ہسپاں کی خیمہ گاہ کی سب لالٹینیں گھپ اندھیرے میں بجھ چکی تھیں۔

لیلے پیک پہ ایک نابینا تاریکی کا راج تھا اور اس اندھیرے راج میں ستارے اترتے تھے اور لوٹتے تھے۔۔

اور سامنے برفیلی بلندیوں پہ جو آسمان تھا اس میں ابھی ابھی چند ستاروں نے جنم لیا تھا

روشنی حاصل کی تھی اور ابھی ابھی ڈوبتے گم ہوتے تھے..

برفیں بلند سیاہ رات میں مجھے گھیرے ہوئے اور ان پر ابھی ابھی جنم لینے والے ستاروں کی روشنی..

سرد... بلند... ستاروں سے اٹی رات.. جو سردی کے باوجود بجھتے نہ تھے، بکھرے تھے اور ان میں سے کوئی ایک ٹوٹتا تھا اور راکھ ہوتا تھا..

یہ درست کہ میں بالٹی کیمپ تک نہیں جا سکا تھا.. گنڈوگورو کی چوٹی پر نہیں پہنچ سکا تھا لیکن یہ بھی تو درست کہ آسمانوں میں اتنے ستارے دیکھنا اور ان میں سے کچھ کو لیلیٰ پیک پر گرتے دیکھنا.. اس کی برفوں میں گم ہوتے دیکھنا.. ایک خوش بختی ہے..

لیلیٰ پیک کے عین اوپر ایک ستارہ بکھرا ایک روشن لکیر تاریک آسمان میں چھیدتا راکھ ہو گیا..

میں نے اس رات میں خیمے کے باہر کھڑے ہیبتوں کی رات میں اپنے آپ کو اس ستارے میں محسوس کیا.. کہ میں اگرچہ آسمانوں میں چھید نہیں کر پایا تھا لیکن روز گنڈوگورو کی اس رات کے حسن کی تاب نہ لا کر.. بہر طور راکھ ہو گیا تھا.. اور اس راکھ کو میں نے ایک عمر کریدنا تھا.. کہ کہیں اس میں ایک چنگاری لیلیٰ کی مل جائے..

میں نے ایک عمر اس راکھ کو کریدنا تھا..

لیلیٰ پیک کے اوپر ستارے یوں گرتے تھے جیسے پروانے بھسم ہو کر گرتے ہیں..

میں ابھی ایک ستارہ تھا اور ابھی دیوانہ تھا جو لیلیٰ پر گرتا راکھ ہوتا تھا..

"لاہور کی سویر.. اور باقی رہ گیا ایک.. میں!"

وطن فیروز پور روڈ کے شور میں تھی..

لاہور کی نہر میں گرمی کے مارے ہوئے ننگ دھڑنگ بچے چھلانگیں لگا رہے تھے..

بہاؤ گم تھا.

اس کے ذہن میں جانے کونسی فلم چل رہی تھی.. وہ اپنی سیاہ آنکھیں اور بکھرا ذہن بھی اگرچہ لاہور کی بے ہنگم ٹریفک پر رکھتا تھا لیکن وہ اسے دیکھ نہیں رہا تھا.. اپنے ذہن کے پردے پر جو فلم چل رہی تھی اسے دیکھ رہا تھا..

ہم بھی جو ویگن میں رہ گئے تھے، ویگن میں نہیں تھے کہیں اور تھے.. ہمارے ذہن کی سکرین پر بھی روز گنڈوگورو کے سفر کی ایک ڈاکومنٹری چل رہی تھی..

کلمہ چوک میں ایک پتھریلا ابھرا ہوا تھا.. اسے کسی مغنیہ کے ہاتھ سے تشبیہ دی جاتی تھی.. ہمیں اس میں سے لیلیٰ پیک ابھرتی دکھائی دیتی تھی..

بہاؤ لاہور کی نہر میں بہتا تھا اور بہتا جاتا لیلیٰ کے گلے جا لگتا تھا.. ہم سب کی آنکھیں کھلی تھیں اور جو کچھ سامنے تھا اسے نہیں دیکھ رہی تھیں، دل کے بھیتر میں جو فلم چل رہی تھی اسے دیکھ رہی تھیں.. بلند چٹان پر براجمان سرخ جوڑے میں ملبوس ایک جل پری..

شاید وہ خود بھی پتھر کی تھی لیکن اس کا سرخ پیراہن ہواؤں میں پھڑ پھڑاتا جا رہا تھا..

شانی چوک کی رات... رات میں رقص..

دل سنگ پا کے ستارے.. مشابرم سے باتیں..

ملتان جانے والی بس کی روانگی میں ابھی کچھ دیر تھی..

"تارڑ صاحب.. برمانی کو میرے پاس ڈراپ کر دیں.. یہ کچھ تھکے ہوئے ہوں گے.. ذرا
نارمل ہو جائے تو پھر میں اسے یہاں چھوڑ دوں گا۔"

عامر کے گھر کے آگے بلند قامت پام کے درختوں کے عقب میں سے بکھر کر ... ان
پھر بدلے.. بچے اور عامر اور برمانی کا سامان ویگن میں سے اتارنے لگے...

شاہد بھی اپنے گھر کے گیٹ کے سامنے خاموشی سے اتر گیا۔

باقی رہ گیا ایک...

وہی ایک جو اس سارے سفر کی جڑ تھا... میں!

''گندو گورو کے میراثی.. ہائے اوئے!''

وہ بھی ایک عجیب سویر تھی..

ہسپار میں درّہ گندوگورو کی وادی میں جو سویر تھی.. عجیب تھی..

میں اس سویر کو دیکھ نہیں رہا تھا اپنے خیمے میں سلیپنگ بیگ میں لیٹا اس سویر کو سن رہا
تھا.. ایک سویر کیسے بول سکتی ہے؟

اگر سویر نہیں تو اسے دیکھنے والے تو بول سکتے ہیں..

اور وہ بول رہے تھے..

سب سے بلند بول سامان کی تھی.. ہائے اوئے...

اور یہ وہ ہے کہ جیسے مسٹر جیمس والا یوسف کسی منظر یا چہرے کو دیکھ کر بے قرار ہو کر "یہ تو
غدر ہے" کا نعرہ لگاتا تھا اسی طور سامان ایسے موقعوں پر دل پر ہاتھ رکھ کر ایک شدید لاہوری
"ہائے اوئے" کرتا تھا..

چنانچہ یہ اس سویر میں سامان کی پہلی "ہائے اوئے" تھی..

"اوئے بھاء.. کون شور پا رہے ہو؟" میں سلیپنگ بیگ کی بغل میں سے بولا..

"تارڑ صاحب ہائے اوئے.. لیلیٰ پیک پر ابھی سورج کی کرنیں اتری ہیں اور
اس پر برف کے سنہرے پن کا اثر ہو رہا ہے.. سر کی سستی اور سردی کو ترک کر کے باہر آ کر تو دیکھیں
کہ لیلیٰ کیسے ہولے ہولے سنہری ہو رہی ہے.. ہائے اوئے۔"

"بچے تم اپنی رننگ کمنٹری جاری رکھو۔" میں نے اپنے سلیپنگ بیگ میں مزید
سکڑتے ہوئے پکارا کہ سردی ابھی پورے جوبن پر تھی.. بیگ میں سے ہاتھ نکالا تھا تو برف ہو جاتا
تھا.. "میں سن رہا ہوں.."

"سر جی.. میں کیمرے کے لینز کو لیلے پیک پر زوم ان کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ یہ لینز لیلے کا بوسہ لیے گا ہے.. ہائے اوئے.."

"بیان جاری رہے.."

"سر جی آپ نے نور جہاں کا وہ گیت تو سنا ہوگا کہ.. ہوتے دی تو تڑی.... جے میں ہوندی ڈھولا ہوندی دا ہوتوں تا سوتے دی تو تڑی.. تو سر جی میرا دل بھی یہی چاہ رہا ہے کہ میں اگر یہ زوم لینز ہوتا تو لیلے پیک کی سنہری ہوتی برفوں کے بوسے لے رہا ہوتا بقلم خود.."

"بے چاری لیلے پیک"

"ہائے اوئے.."

میاں صاحب کے چہکنے کی آوازیں بھی مجھ تک آ رہی تھیں.. یقیناً وہ اپنی اُبھار شدہ وڈیو کیمرے کو گندوگورو کی سویر کے منظر پر بے دریغ گھما رہے تھے اور اس کے ساتھ آہیں بھی بھرتے جاتے تھے۔ "ہائے ہائے تارڑ صاحب باہر بڑا مدہم منظر ہے.. نظارہ کرنا ہے تو آ جاؤ.."

شاہد کی آواز بہت دیر بعد آئی کیونکہ وہ اپنے کیمرے کا اپرچر اور سپیڈ سیٹ کرنے میں جتنی دیر لگاتا تھا اتنی دیر میں وہ منظر اکتاہٹ سے پہلو بدلنے لگتا تھا کہ میاں اب تصویر اتار بھی چکو مجھے دنیا میں کچھ اور کام بھی ہیں.. تو اس کی آواز دیا "یہ نادر ست آیڈ" مائی لیڈر.. رب سوہنے کی شان دیکھنی ہے تو باہر قدم رنجہ فرمائیں.."

البتہ برہانی کی آواز نہیں آ رہی تھی.. شاید وہ بھی میری طرح پچھلی شب کی بے خوابی کی کسر نکال رہا تھا..

لیکن وہ وہاں تھا..

یہ اطلاع پھر سلمان کی جانب سے آئی۔ "ڈاکٹر جی آپ.. آپ بھی تو کچھ بولو.."

تو بالآخر وہ بولا۔ "ہم کیا بولیں سر جی.. ہم تو مرشد کے آگے گونگے ہو کر بیٹھتے ہیں.. محبوب کے سامنے کلام کرنے کی جرأت نہیں رکھتے.. لیلے سامنے ہے تو گفتار کیسے کریں.."

"ہائے اوئے.." سلمان نے پھر نعرہ لگایا..

"اب کیا ہائے اوئے؟" یہ سب لوگ مجھے ہی باہر نکالنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں..

"سر جی کم از کم اپنے خیمے کی چلمن اٹھا کر ایک نظر لیلے پر ہی ڈال لو.. وہ گندوگورو کی اس برف پٹی کو ہی دیکھ لو جس پر سے کچھ دود دھنوں سے نکلتے نیچے آ رہے ہوں گے.. یاد ہے

سکردو میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ صبح سویرے اگر آپ کے پاس دوربین ہو تو یہاں سے ان خوش نصیبوں کو دیکھا جا سکتا ہے جو گندوگورو چوٹی سر کر کے نیچے آ رہے ہوتے ہیں.. برفوں سے نکلتے.. ایک جھاتی باہر بھی مار لو سر جی.. ہائے اوئے!"

میں نے اپنے برابر میں نیم خوابیدہ حسن صاحب کے کھلے منہ کو دیکھا اور چونکہ ان کی آنکھیں ابھی نہیں کھلی تھیں اس لیے ان کے منہ سے مخاطب ہو کر کہا "حسن صاحب.. شاہ جی.."

"ہاں جی..." وہ نیند میں ہی مسکراتے ہوئے معصومیت سے بولے..

"سید بادشاہ سویر مشہ بروم پر ہے.. یہاں بھی سویر ہو رہی ہے اور برف بلندیاں آہستہ آہستہ سنہری ہو رہی ہیں.. اور جتنے بھی بین الاقوامی شہرت کے حامل فوٹوگرافر حضرات ہیں وہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دھڑادھڑ تصویریں اتار رہے ہیں آپ بھی تو ایک نئے نکور کیمرے کے مالک ہیں.. باہر نکلیے اور تصویریں اتاریے.."

"میں لاہور پہنچ کر شاہد کی کھینچی ہوئی تصویریں دیکھ لوں گا۔" انہوں نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔ "سونے دیں سر.."

"شاہد کی کھینچی ہوئی تصویروں کا کچھ پتہ نہیں چلتا.. جب تک کہ وہ خود نشاندہی نہ کریں کہ جناب یہ پہاڑ ہے اور یہ برف ہے کچھ پتہ نہیں چلتا.. آپ یہ رسک نہ لیں باہر جائیں۔"

"تو پھر میں سلمان کی تصویریں دیکھ لوں گا اس سویر کی.. وہ تو آسٹریلیا سے کیمرہ لے کر آیا ہے.." ایک طویل جمائی ان کے کھلے منہ سے برآمد ہوتی گئی..

"شاہ جی آسٹریلیا میں صرف کنگرو اور کوالا ریچھ ہوتے ہیں یا پھر فضول سے آسٹریلین ہوتے ہیں جن کے آباؤاجداد مجرم تھے تو وہ کیمرہ کرافٹ کیا جانیں.. آپ خود باہر نکلیں۔"

حسن اونگھ رہے تھے "..میں جی.. میں.. میاں صاحب کی اتاری ہوئی مووی دیکھ لوں گا.. سونے دیں۔"

"وہ تو پچھلی بار ایک مووی کیمرہ آپریٹ کر رہے ہیں.. کیا پتہ کیا نتائج برآمد ہوں.."

"آپ چپ کیوں نہیں کرتے چودھری صاحب.." حسن صاحب اس ترتیب میں پہلی بار ذرا تاؤ میں آ کر بولے اور ایک آنکھ کھول کر بولے۔ "آپ مجھے باخبری دیے چلے جاتے ہیں کہ باہر جاؤ باہر جاؤ.. خود کیوں نہیں جاتے.."

"دراصل.." میں نے کھسیانے ہو کر کہا۔ "مجھے تو سلمان اور دیگر تصویر کش حضرات

پر اعتبار ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ کا قرار اور فن موسیقی میں تاک مغنیہ گاتی چلی جاتی تھی اور ایک میرا جیسا کور ذوق سامنے بیٹھا اونگھتا جاتا تھا تو مغنیہ نے اسے جھنجوڑ کر نہایت غصے سے کہا۔" چوہدری صاحب میں غزل گا رہی ہوں اور آپ سو رہے ہیں۔" تو چوہدری صاحب نے ایک طویل جمائی لے کر کہا۔

"بی بی تم گاتی رہو... مجھے تم پر اعتبار ہے۔"

"یقیناً یہ چوہدری صاحب آپ ہی تھے۔" حسن نے بیزار ہو کر کہا۔ "اب چپ کر کے لیٹے رہیں یا باہر نکل جائیں۔ مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔"

"ہائے اوئے۔" سلمان کا ایک اور نعرہ ہائے اوئے بلند ہوا۔

اس کے بعد میں اور حسن صاحب مشترکہ طور پر میراثی ہو گئے اور اونگھتے اونگھتے سو گئے اور جب بیدار ہوئے۔ اور تب بیدار ہوئے جب خیمے میں کیپ دروغو گندہ گورو پر تیز دھوپ اتر چکی تھی۔۔

بچپن میں۔۔ گاؤں میں گزارے ہوئے بچپن میں۔۔ جب ہم دیر تک۔۔ دن چڑھے تک چھت پر سوتے رہتے تھے تو میری اماں ہمیشہ ڈانٹتی تھیں کہ مستقبر کیا میراثیوں کی طرح دھوپ چڑھے تک سوتے رہتے ہو۔۔ کیونکہ ان زمانوں میں گاؤں کے کوٹھوں پر یا کچے کمروں کی چھتوں پر سونے والے کسان منہ اندھیرے اٹھ کر ہل جوتنے کے لیے کھیتوں کو چلے جاتے تھے اور پورے گاؤں میں صرف میراثیوں کے دو چار گھر ایسے ہوتے تھے جن پر کچی چارپائیوں پر یہ فنکار حضرات اور ان کے خاندان دھوپ چڑھنے کے باوجود کھیس اوڑھے مزے سے سو رہے ہوتے تھے۔۔ اس لیے کہ انہوں نے کہیں نہیں جانا ہوتا تھا۔ ان کا رزق محض باتوں سے کمایا ہوتا تھا۔۔

یہ الگ بات کہ ایک ایسا زمانہ آیا جب میرے جیسے عجیب الخلقت کسان اور چوہدری حضرات ٹیلی ویژن پر اداکاری اور میزبانی کرتے کرتے کس حد تک میراثی ہو گئے اور اپنا رزق باتوں سے کمانے لگے۔۔

تو جناب میں اور حسن صاحب بھی اس روز میراثی ہو گئے۔۔ دیر تک سوتے رہے اور پھر دھوپ میں آ بیٹھے۔۔

ویسے گندوگورو کے مناظر میں اگر انسان سید اور چوہدری سے میراثی ہو جائے تو کچھ یہ گھاٹے کا سودا نہ تھا۔۔

"پندرہ ہزار فٹ بلند برفانی کارواں سرائے سے کوچ"

ہم خیموں سے باہر آئے تو ہمارے اوپر ڈھلوان پر جو پگڈنڈی تھی اس پر سے پورٹر اتر رہے تھے۔۔

یہ پورٹر ان کوہ نوردوں کی ایڈوانس پارٹی تھے جو چوٹی سر کرنے کے بعد نیچے ہسپان میں آ رہے تھے۔۔

ان پورٹروں کو دیکھ کر ایک مرتبہ پھر ہم میں یہ خواہش بیدار ہوئی کہ ہم بھی ہسپان میں ٹھہر جائیں۔۔ آج واپس جانے کی بجائے بالائی کیمپ تک پہنچیں اور کل اپنی جان کی بازی لگا کر چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کریں۔۔

لیکن ہم سب کی مجموعی صحت اس لائق نہ تھی۔ ہم جان کی بازی لگانے سے بھی جھجکتے تھے اور خپلو میں جس ویگن کو چھوڑ آئے تھے اس کے میٹر پر ڈھائی ہزار روپے روزانہ کا کرایہ چڑھتا جاتا تھا۔ چنانچہ اقتصادی پابندیاں بھی عائد تھیں۔۔ ویسے بھی یہ ایک برفانی خودکشی ہوتی۔۔

"سر جی اب باہر آئے ہو تو کیا فائدہ۔" سلمان کچھ خفا سا تھا۔ "یہ سامنے والی ندی میں جو ٹھہری رہنے تھے وہ تو دھوپ اترنے سے بہہ گئے۔ صبح سویرے یہ سامنے والی ساری کی ساری برف پوش چوٹیاں تھرتھلی ٹھہری ہوئی تھیں اور اب خون اور یہ بند ہو گئی ہیں۔ کیا فائدہ؟ آپ دونوں حضرات اب خیموں کی فکر کریں۔ ہم ان ندیوں کے پار جو پتھروں کا علاقہ ہے وہاں کوئی پانی تلاش کرتے ہیں کیونکہ یہ پتھر پر حد ہے۔"

ناشتے کے دوران۔۔ وہ چیلے اور چربیلے پراٹھوں کے ساتھ فرائی انڈوں کو ہضم کرتے ہوئے۔۔ آج کہاں پہنچنا ہے۔۔ واپسی پر رات کہاں کریں گے۔۔ کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔۔

رسمی طور پر تو دل سنگ پا.. اور کہاں..

لیکن سلمان نے ایک آئیڈیا پیش کیا۔ "تمام گائیڈ بکس یہ کہتی ہیں کہ ہسپر سے واپسی پر چونکہ اترائی ہے، اس لیے آسانی سے دو منزلیں طے کی جا سکتی ہیں یعنی دل سنگ پاس سے اُرکرا کے شانی پڑاؤ میں پہنچا جا سکتا ہے۔"

"اس دوہری مسافت کا فائدہ؟"

"ایک تو یہ کہ پورٹروں کا ایک دن کا کرایہ یعنی ڈھائی ہزار روپے بچ جائے گا اور دوسرے یہ کہ ہم ایک روز پہلے اپنے اپنے گھروں میں پہنچ جائیں گے۔"

"ہم میں جو شادی شدہ ہیں، انہیں اپنے اپنے گھروں میں ایک روز پہلے پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں۔" یہ سب کے دل کی آواز تھی..

"اگر ہم ایک روز پہلے پہنچ جاتے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ میں اپنے چھوٹے بھائی کو خدا حافظ کہہ سکوں جو امریکہ جا رہا ہے.. کوشش کر دیکھتے ہیں ورنہ دل سنگ پا سے آگے بھی تو ایک کیمپ سائٹ ہے، وہاں رات گزاریں گے اور کل دوپہر تک پہنچ جائیں گے۔"

"پابندی کوئی نہیں ہے۔" یہ میاں صاحب نے کہا۔ "یہاں سے سیدھا شانی چلا جانا تو قتل و غارت ہے... دیکھتے ہیں کہ کہاں تک پہنچتے ہیں۔"

چونکہ میں کل ایک گھوڑا تھا، اس لیے آج بھی مجھے توقع تھی کہ میں گھوڑا ہی رہوں گا.. چنانچہ مجھے کوئی اعتراض نہ تھا..

تب سلمان نے خطرے کا ایک بگل بجایا۔ "مرزا جی.. دل سنگ پا سے آگے جو پہلے چڑھائی تھی اور اب اترائی ہوگی تو وہاں سے بھی تو اترنا ہوگا۔"

"اتر جائیں گے۔" حسن صاحب نے سر ہلایا۔

"اور آج ذرا آسمان پر نظر کیجیے کہ ہلکے ہلکے بادل ہیں تو وہاں اس اترائی کے دوران اگر بارش ہوگی تو ہم کیسے نیچے اتریں گے.. لڑھکتے ہوئے پتھروں کے شکار ہو جائیں گے.. ہم پر حدود آرڈیننس لگ جائے گا اور سنگسار ہو جائیں گے.. وہاں سے نکلیں گے تو کنیانگ گلیشیئر کے کناروں پر جو راستہ ہے جس کے اوپر مٹی میں پھنسی کنکروں چٹانیں ہیں وہ بھی تو بارش کی وجہ سے ڈی لوکیٹ ہو سکتی ہیں.. ہم پر گر سکتی ہیں.. اگر بارش ہوگی تو کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ اترائی اور وہ راستہ آج ہی سمیٹ دیا جائے۔"

سلمان کسی بے راہ رو، کوکوفا کی خبریں سنانے والا پیغمبر لگتا تھا..

چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ٹھیک ہے سفر کا آغاز کرتے ہیں.. اور جب دل سنگ پا پہنچیں گے تب یہ فیصلہ کریں گے کہ ہم مزید آگے جانے کی ہمت رکھتے ہیں یا نہیں..

ایک ایک کر کے جب ہمارے خیمے ایک پیراشوٹ کی مانند زمین پر گرے تو ہمیں بے حد قلق ہوا..

ایک قلق تو یہی ہوا کہ یہ ہماری کوہ نوردی کی آخری منزل تھی اور اب ہمیں الٹے پاؤں انہی راستوں پر چل کر واپس ہونا تھا جن سے ہم آئے تھے.. وہی منظر، وہی بلندیاں، وہی پتھر.. دوبارہ نظروں کے سامنے آئیں گے.. ان میں کوئی اجنبیت، کوئی حیرت کوئی سسپنس نہیں ہوگا..

اگرچہ واپسی پر نئے منظر ملتے ہیں، جن کی جانب آپ کی پشت ہوتی ہے، آتے ہوئے تو وہ سامنے ہوتے ہیں جاتے ہوئے.. لیکن سب کچھ جانا پہچانا ہوتا ہے.. اس میں کوئی تحیر نہیں ہوتا..

لیکن زیادہ قلق اس بات پر ہوا کہ.. ہائے اوئے ہم یہ چاہتے.. ٹھنڈ گوروں کی بیداری اور لیٹے پیک کا آمنا سامنا آن خالی کر دیں گے تو آج شام پاکستان کی اور دوگانہ یہاں خیمہ زن ہو جائے گا.. جیسے ایک شاعر اور ادیب کے بارے میں اس کے حاسدوں نے.. اور بی بانی نے یہ روایت گھڑ رکھی تھی کہ ایک قومی اعزاز ملنے پر اس نے کہا تھا کہ مجھے یہ اعزاز ملنے پر بے حد مسرت ہوئی ہے لیکن مجھے یہ دکھ ہے کہ اگلے برس یہی اعزاز کسی اور کو مل جائے گا..

وہ بیچارے حاسد اور بے تجربہ ہیں جو ہر برس کوئی نہ کوئی اعزاز حاصل کرنے کے لیے سرکار کی ہانڈی لگائے رکھتے ہیں اور حکام بالا کے تلوے چاٹ چاٹ کر انہیں رام کر لیتے ہیں.. ایسے کہ جو دوسروں کا رزق چاٹ جاتے ہیں..

ڈھلوان پر پتھر کی آماجگاہوں کے آس پاس جو لیٹے ڈھیر جتے تھے، اب وہ وہاں نہیں تھے..

ہسپار کی خیمہ بستی میں جو خیموں کی رونق تھی، وہ اجڑ چکی تھی اور زمین کی وسعت پر ان کی کچھ نشانیاں تھیں.. خالی ڈبے.. بکٹ.. آدھا کٹا ٹماٹر.. جانتک کے لفافے.. جن کو کوئی ایک منٹ کی تیلی.. بستی ویران ہو چکی تھی..

یقیناً مرغ باراں والی لڑکی بھی کوچ کر گئی ہوگی..

ہے۔ جیسے گلیشیئر کی بلندی پر اس سرسبز قطعے تک نہیں جاتے جہاں آپ کو خبر تک ہے کہ ایسے ہرن ہیں جنہوں نے آج تک انسانی شکل نہیں دیکھی اور وہ آپ کو بھی اپنے جیسا سمجھ کر تھوتھنیاں اٹھائے آپ کے قریب آ جاتے ہیں۔ یا فو کی چراگاہوں میں گمشدہ شگوری گھوڑے میں رات بسر نہیں کرتے.. تو ایسی خواہشیں کبھی پوری نہیں ہوتیں.. سیلیے پیک کے دامن میں پہنچنے والی خواہش بھی ایسی ہے۔ اسے تم آخری بار دیکھ چکے... دوبارہ یہاں نہیں آؤ گے.. کس نے آنا ہے۔"

"نہیں بھی آ سکیں تو ایک شخص کا دل رکھنے کی خاطر کہہ دیں کہ ہاں ہم آئیں گے.. اس جدائی کے پہلے سمے میں کچھ تو ڈھارس بندھائیں... دو بول امید کے بول دیں۔" وہ واقعی اس برفانی سیلیے کا اسیر ہو چکا تھا۔

"میں تو اپنے بیے ہوئے پانچ کہ میں تو نہیں کہ میرے پاس عمر کی جو گھڑی ہے اس میں کچھ کم رہ گئی ہے... مسلسل ٹک ٹک کر رہی ہے اور سانسیں کم کر رہی ہے... سانس تو دو گھڑی کا بوجھ ہے دن رہیں... اور کسی روز گھڑیال منادی کر دے گا... اور پھر لوگ پوچھیں گے FOR WHOM THE BELL TOLLS لیکن تم دوبارہ آؤ گے، مجھے یقین ہے۔ تم میں جو چاہت ہے وہ تمہیں یہاں لے آئے گی اور تم اس کے دامن میں پہنچ کر اس کے وصال سے سرشار ہوتے ہوئے تب مجھے یاد کرو گے... کہ پہلی بار تارڑ مجھے سیلیے تک لایا تھا۔"

تقریباً دو بج رہے تھے جب ہم دل سنگ پا کی ویرانی میں اترے۔

دل سنگ پا خالی اور بے رونق تھا.. تیز دھوپ اس کے رنگ نچوڑ چکی تھی.. جھیل کے پتھروں تلے اس کی کچھ بھری تہہ دکھائی دے رہی تھی... اس میں مشہ بروم کا کوئی عکس نہ تھا۔

ہم نے دھوپ میں بیٹھے ہوئے کچھ بدمزہ قسم کی چیزیں خوراک کے طور پر نگلیں اور فیصلہ کیا کہ ابھی کچھ وقت ہے، کچھ ہمت ہے اس لیے سفر جاری رکھا جائے.. اگر ممکن ہو تو شانی تک ورنہ درمیان میں رات بسر کریں گے.. اگر ہمت نہ بھی ہوتی تو بھی ہم دل سنگ پا کی بے مہر اور ویران دھوپ میں نہ ٹھہرتے... اور سلمان کی دلی آرزو بھی یہی تھی کہ ہم آج ہی اس ہولناک اترائی کا کشٹ کاٹ لیں۔ اس ایک بڑے عذاب سے گزر کے اس سے فارغ ہو جائیں۔

"مرشد جی پتہ نہیں کب بارش آ جائے۔" حالانکہ آسمان بالکل خالی پڑا تھا۔ بادل کا نشان بھی نہ تھا۔ "بارش آ گئی تو یہ پھسلن ہو جائے گی.. پتھر لڑھکیں گے آج ہی اس سے نپٹ لیں۔"

دل سنگ پا سے ہم شتابی سے نکلے.. گندو گورو کے بلند کناروں پر چلتے.. پچھلوں کے سوکھے ہوئے کھیتوں میں سے چلتے.. خشک ہو چکی ندیوں کے نشانوں پر سے گزرتے جب ہم وہاں پہنچے جہاں جھانکنے سے وہ اترائی نظر آتی تھی تو جھٹکا لگا ہے تو ٹھٹک گئے.. اگرچہ ہم ذہنی طور پر اس اترائی کے لیے کل سے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود اس کی پاتال گہرائی اور ناممکن گہرائی کو دیکھ کر ٹھٹک گئے کہ ہم اس کے لیے قطعی طور پر تیار نہ تھے..

اور اس پر طرہ یہ کہ جب سے کہاں سے ایک ٹکڑا بادل کا نمودار ہوا۔ خالی آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ٹپ ٹپ بارش اترنے لگی.. یہ صرف سلمان کا ڈر تھا جس نے بارش برسا دی۔ ورنہ تو کوئی امکان نہ تھا..

سب لوگ سراسیمہ ہو گئے اور سلمان کا رنگ تو باقاعدہ فق ہو گیا۔ ہم چونکہ اپنے رنگ نہ دیکھتے تھے.. اگر دیکھتے تو بھی وہ فق تھے کہ اب کیا ہوگا..

بارش باقاعدہ نہیں ہوئی تھی.. بس کبھی کبھار ایک آدھ بوند گرتی لیکن وہ ایک آدھ بوند بھی ہمارا خون آدھا کر دیتی..

پورٹروں نے ہمیں اس بلندی سے ایسے نیچے دھکیلا جیسے اناڑی پیرا ٹروپر کو پہلی بار زبردستی جہاز سے دھکیلا جاتا ہے..

اور ایک ایک کر کے دھکیلا..

ان چند بوندوں نے بھی اپنا کام دکھایا اور خشک مٹی کو پھسلن میں بدل دیا..

مجھے دو پورٹر نیچے لے جا رہے تھے.. مجھے کسی بھی تعین پر اختیار نہیں.. اس اترائی کے دوران یقین کر ہم اترے اور اترتے ہی چلے گئے.. بلکہ متعدد مقامات پر میرا سانس پیچھے رہ جاتا اور میں آگے نکل جاتا اور آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں گے کہ سانس کے بغیر جینے میں کچھ دشواری ہوتی ہے۔ چنانچہ میں ایک حالت مردنی میں کہیں کوئی بھاری پتھر تھام کر پیچھے رہ جانے والے سانس کا انتظار کرتا اور جب وہ مجھ تک پہنچ جاتا تو پھر پورٹروں کی بانہوں میں جھولتا نیچے جانے لگتا۔

ہم ہولے ہولے نیچے آ رہے تھے..

سلمان بھی کھسکتا ہوا نیچے آیا اور ایک ڈری ڈری سی "ہائے او ئے" کر کے کہنے لگا۔

"تو مرشد یہاں سے بچ گئے ہیں نا تو اب انشاءاللہ دور تک کہیں مات کی خبریں ہیں۔"

یہ پنجابی کے محاورے "ستے خیراں" کا ترجمہ..

آگے وہی کٹھن اترائی والا راستہ تھا اور راستے کے بعد نالہ تھا اور نالے کے بعد گندوگورو کے برابر میں وہ پگڈنڈی تھی جس کے نیچے اور پر مٹی میں پھنسی پتھروں والی چٹانیں ہم پر جھانکتی تھیں کہ اس پر گریں یا اس پر گریں لیکن ہم کچھ زیادہ فکرمند نہ ہوئے کہ اگر مرنا ہوتا تو وہ اترائی اس کام کے لیے بے حد آئیڈیل تھی.. یہاں سے بچ نکلیں گے..

اس پگڈنڈی کے اختتام پر اوپر کنارے کی بالائی سطح پر پہنچنے کے لیے ایک وہی آسمانی چڑھائی جاتے ہوئے پاتال اترائی تھی.. اور جب آپ گھسٹتے لڑھکتے سے بال بال بچتے.. سانس سنبھالتے.. اپنے پورے بدن میں پسینے کے فوارے چھوٹتے محسوس کرتے... بے سکت ٹانگوں کو گھسیٹتے بالآخر اوپر پہنچتے ہیں.. آپ کا سر بلند ہوتا ہے تو اس پر ٹکی ہوئی دو آنکھیں یکدم اپنے سامنے ایک وسیع گھاس بھرا میدان دیکھتی ہیں اور جب آپ دونوں ہاتھوں سے پتھروں کو تھامتے اوپر آ کر اس میدان کے کنارے پر دھڑام سے جا گرتے ہیں تو آپ کے کچھ سابق ساتھی وہاں پہنچے ہیں اور گھاس پر لیٹے پتھروں سے ٹیک لگائے استراحت فرما رہے ہیں اور استراحت فرماتے ہوئے آپ کے دھڑام سے اوندھے گرتے ہی دانت نکال کر کہتے ہیں "ہاں جی.. لیڈر صاحب.. پہنچ گئے ہو.."

اور آپ میں جواب دینے کے لیے ایک سانس بھی نہیں ہوتا.. منہ کھلا ہوا ہے.. ٹانگیں لرزش میں ہیں جہاں گرے ہیں وہاں بھی گرے ہیں اور اس حالت میں وہ مسخرے سوال کرتے ہیں.. پہنچ گئے ہو.. اگر بولنے کی سکت ہوتی تو میں انہیں ایسی ماں اور مردانہ گالیوں سے نوازتا کہ سکھ حضرات بھی شرم سے سرخ ہو جاتے اور اگر ذرا سی بھی ہمت باقی ہوتی تو گھسٹتا ہوا ان تک جاتا اور ان کے ٹیٹوے دبا دیتا..

لیکن یہاں کا تصور نہ تھا..

ہمت نہیں تھی..

میں بھی جب ایک پتھر سے ٹیک لگا کر سانس بحال کر چکا.. اتنی طاقت آ گئی کہ گھاس پر ہاتھ پھیر کر اس کی ہریاول سے لطف اندوز ہونے لگا تو پیچھے سے ہمارے ایک اور ساتھی کا سر نمودار ہوا تو سب سے پہلے میں نے ہی دانت نکال کر پوچھا "ہاں جی پہنچ گئے ہو.."

اور اگر وہ سر [illegible] کا تھا تو اس نے صرف اتنا کہا "ہائے اوئے" اور ڈھیر ہو گیا..

یہاں سے چلے ہیں تو کچھ دیر میں اس وسیع میدان کے کناروں پر جو نہایت اونچی اور تصویر چٹانیں آسمانوں میں تھیں.. ان کے سائے میں ایک خیمہ گاہ نظر آنے لگی.. اور وہاں وحشی دوپہر میں چٹانوں کے بڑھتے سائے میں بہت رونق تھی.. بہت سے خیمے لگے تھے اور ان کے قریب چٹانوں میں سے اترتے ایک چشمے میں ان خیموں کے غیر ملکی مکین اشنان کرتے تھے، چھینٹے اڑاتے تھے.. ہم نے انہیں اس لیے بھی حسرت سے دیکھا کہ ان میں کچھ ایسی خواتین بھی تھیں جو کچھ زیادہ حیادار نہیں تھیں۔ طالبان کے فلسفے سے بالکل مخالف کنارے پر تھیں اور بے دریغ تھیں.. انہیں دیکھ کر کچھ ساتھیوں کے ایمان ڈولے کہ مرتے ہیں نیت لگا لیتے ہیں لیکن فیصلہ یہی ہوا کہ شاکی کچھ زیادہ دور نہیں.. تھوڑی سی ہمت کریں تو وہاں تک پہنچ سکتے ہیں..

اور کم از کم میں نہیں جانتا تھا کہ شاکی چوک بھی بہت ہی دور ہے....

ہمیں اصولی طور پر وہیں اسی خیمہ گاہ میں رک جانا چاہیے تھا... لیکن ہم اپنی انا کے اسیر ہو چکے تھے جو یہ کہتی تھی کہ اگر فلاں گروپ ایک ہی دن میں یہاں سے شاکی چوک تک وہ منزلیں طے کر جا سکتی ہیں تو ہم بھی کریں گے... ورنہ یہی خیمہ گاہ ہمارے لیے ایک اور منظر ہوتی.. ایک نیا تجربہ ہوتی.. ان چٹانوں کے جو رات ہوتی وہ پتہ نہیں کیسی نادر کیفیت کی ہوتی..

ہماری انا نے ہمیں ایک احمقانہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا اور ہم آگے بڑھ گئے..

یہاں تک تو ہم سب تقریباً اکٹھے رہے... اور پھر شدید تھکاوٹ اور درماندگی نے ہمیں بدحواس کر دیا... ہم سب ایک عجیب دیوانگی اور بیگانگی میں الگ الگ ہو گئے، بھٹکنے لگے... کسی کو کوئی خیال نہ رہا کہ کون کہاں ہے... کس حال میں ہے... زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے... ہر ایک کا سفر الگ تھا... تنہا اور دوسروں سے کٹا ہوا تھا... پھر میں اس نالے کے کناروں سے اترا... جس کے دوسرے کنارے پر میں تادیر بیٹھا تھا جسے عبور کرنے سے جھجکتا اور جان کے ڈر سے ٹھٹکتا تھا... اسے بھی میں نے ایک عجیب لاتعلقی اور بیزاری سے بے پرواہ ہو کر عبور کیا کہ مجھ میں تھکاوٹ ایسی تھی جو کہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا... میں اس میں ڈوب جاؤں گا... بہتا ہوا ہوشے پہنچ جاؤں گا تو کیا ہو گا...

گندوگورو کا میدان شروع ہوا تو وہ ختم ہونے کو نہ آتا تھا..

کبھی پتھروں کی دنیا میں لاچارگی اور بے بسی کی تھکن بدن کو مسمار کرنے لگتی اور کبھی ریتلے علاقوں کی وسعت ایک صحرائے گوبی ہو جاتی جس کا کوئی انت دکھائی نہ دیتا..

چھاؤں تھا..

میرے برابر میں.. مجھے سہارا دینے کی کوشش میں ایک پورٹر نے ہاتھ آگے کیا..

"صاحب میں آپ کا ہاتھ پکڑتا ہوں۔"

"نہیں۔" میں نے اسے جھڑک دیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر اس نے مجھے ہاتھ لگایا.. یا کسی درخت کی ٹہنی نے بھی میرے بدن کو چھو لیا تو میں ڈھیر ہو جاؤں گا۔ ایک مرتبہ گر گیا تو اُٹھ نہ پاؤں گا۔

ایک اور دن شاید..

ہم نیچے شانی پڑ میں پہنچ گئے..

ٹارچ کی روشنی میں راستے میں بڑی ندیوں کے پانی چمکتے تھے اور میں کبھی انہیں پھلانگ کر پار ہو جاتا تھا اور کبھی نقاہت کے عالم میں اپنے بوٹ بھگوتا ان میں چلتا ہوا دوسری جانب پہنچتا تھا۔ ایک بے جان پتلے کی مانند چلتا جاتا تھا..

ہمارے خیمے اندھیرے میں کہیں تھے..... وہیں تھے جہاں ہم نے آج سے کچھ روز پیشتر لگائے تھے.. یا چند دن پہلے لگائے تھے.. پتہ نہیں کب لگائے تھے لیکن وہی مقام تھا.. ہم تینوں کی آمد پر کسی نے تالیاں نہیں بجائیں.. ہمارا استقبال کرتے ہوئے شاباش نہیں دی کیونکہ جو ہم سے پہلے پہنچ گئے تھے ان میں بھی زندگی کی رمق کم کم تھی.. یہ دانی خیمے کے برابر اپنی چھتری پر تقریباً مردہ پڑا تھا اور ماکھ مجھو نے بھی بیمار ہو رہا تھا..

ان نے آگے ہی مجھے بتایا کہ تارڑ صاحب مجھے بھی راستے میں شام ہو گئی اور میں اکیلا تھا۔ تھکاوٹ اور بدن کی لاچاری اتنی تھی کہ میں تھوڑی دیر گرتا تھا اور سنبھل جاتا تھا۔ تب میں نے ایک بار اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے ایک درخت کے تنے کا سہارا لیا۔ اسے دونوں بازوؤں میں تھام کر اس پر سر رکھا تو مجھے درخت کے تنے میں سے ایک صدا آئی.. بھاگ جاؤ.. یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ مر جاؤ گے.. مر جاؤ گے.. تو صاحب میں وہاں سے جو اندھا دھند بھاگا ہوں.. کچھ پتا نہیں کہ کس سمت میں کس راستے پر بھاگا ہوں.. میں آسانی سے گمشیر میں بھی اُتر سکتا تھا لیکن کسی غیبی ہاتھ نے میری مدد کی.. مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں ندیاں پھلانگ رہا ہوں اور آخر میں کوئی مقام ہے جہاں ایک لالٹین روشن ہے..

مجھے اس سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی کہ کیا واقعی درخت کے تنے میں سے آواز آئی

تھی کیونکہ مجھے پورا یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا.. تھکن اور بے بسی کی وہ کیفیت ایسی تھی جس میں درخت ہی آپ کو راستہ دکھاتے ہیں اور خبردار کرتے ہیں کہ بھاگ جاؤ ورنہ مر جاؤ گے..

میں نے بہتی آنکھیں اوپر کے بیسو کی برفوں کی جانب ایک نگاہ کی لیکن کہ میری نگاہ میں تو صرف میرا خیمہ تھا جس کی جانب میں لڑکھڑاتا ہوا بڑھ رہا تھا..

میں اپنے سلیپنگ بیگ پر جہاں گرا اگلی دوپہر تک وہیں پڑا رہا..

"وادی ہوشے پر بچھا گندم کی بالیوں کا تخت"

ہم ہوشے کے قریب ہوئے تو سامنے ایک عجیب نظارہ تھا ہوشے کے باغ میں..

شائی چو سے ہم صبح سویرے نکلے بھری دوپہر میں پہنچے... کہ ہمارے مردہ بدن ابھی تک اس قابل نہ ہوئے کہ انہیں ہلایا جا سکے... جب ذرا دھوپ ڈھلی تو ان میں بھی زندگی کی کچھ حرارت پیدا ہوئی..

اور جب ہم دو بجے کے قریب ہوشے کے سامنے پہنچے تو وہاں ایک عجیب نظارہ تھا... جو ہم نے پہلے نہیں دیکھا تھا..

ہم سے دور کھیتوں کے پرے ایک بلند سطح پر ہوشے کے گھر دکھائی دیتے تھے اور یہ جو کھیت درمیان میں تھے یہ سراسر سنہری ہو رہے تھے اور پھر تہہ در تہہ بلند ہوتے جاتے تھے یہاں تک کہ چٹانوں کی قربت میں پہنچ کر رک جاتے تھے.. البتہ وہاں تک پہنچ کر وہ سنہری سے ہرے ہو جاتے تھے کیونکہ وہاں ابھی تک گندم کچی تھی..

بلندیوں پر جیسے شالیمار کا ایک تخت بچھا ہوا تھا تختہ بہ تختہ یہ کھیت بلند ہوتے جاتے تھے اور گندم کی بالیوں کے سنہری پن میں رنگے جاتے تھے..

کسی بھی منزل سے واپسی پر راستے تو یقیناً وہی ہوتے ہیں لیکن منظر سراسر بدل جاتے ہیں..

پہلے آپ ان سے نکل رہے ہوتے ہیں اور وہ آپ کی پشت پر ہوتے ہیں اور واپسی پر وہ آپ کے سامنے ہوتے ہیں اور آپ ان میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں..

ہم بھی اپنے راستے سے اتر کر کھیتوں میں چلے جاتے تھے اور گندم کی بالیوں سے بچے

مٹر کے پودے تلاش کرتے تھے اور ان کی پھلیاں توڑ کر انہیں ناخنوں سے نوچ کر انہیں کھول کر ان میں سے ہرے بھرے دانے نکال کر اپنے منہ میں رکھتے تھے اور اس تازہ سبز ذائقے کے لذت کے مزے لیتے تھے..

بچوں میں ٹافیاں تقسیم کرتے جب ہم اوپر ہوشے کے پہلے گھر تک گئے اور پھر گاؤں میں داخل ہوئے تو یہاں بھی ہمیں دیکھ کر کسی نے تالیاں نہ بجائیں.. ہمیں خوش آمدید نہ کہا.. کہ اہل ہوشے کے لیے یہ ایک روزانہ کا معمول تھا کہ اوپر دور دراز سے ایسے پریشان حال کوہ نورد اترتے ہی رہتے ہیں..

سامان نے ستانے کی بجائے فوری طور پر کنڈے جانے والی کسی جیپ کا بندوبست کیا اور یہ ایک حوالدار کی جیپ تھی.. پھر وہ سامان جو ٹریک سے نکلنے سے پیشتر یہاں سے کرائے پر حاصل کیا گیا تھا.. یعنی ترپال، بچھونے وغیرہ.. اسے واپس کیا گیا اور پھر اشرف کی خیمہ گاہ میں پورٹروں کا حساب کتاب کیا گیا.. حسین، اسحاق اور علی رضی جو ہمارے خیر خواہ نکلے تھے، انہیں ان کی مہربانی کے عوض میں ان کی اجرت میں کچھ اضافہ کیا گیا.. کچھ خوراک تقسیم کی گئی..

اور پھر روانگی سے پیشتر ایک چائے پانے کے لیے.. جو نہایت دھواں دار تھی، ہم اشرف کی خیمہ گاہ کے ڈائننگ روم میں چلے گئے..

اور یہاں پر یوسف سے ملاقات ہوئی۔

جی ہاں "سنو لیک" کے قدموں... جرأت.. گائیڈ.. یوسف اونے یوسف سے... جو نو گائیڈ تھا اور وہ مشکل تھا.. یہی یوسف اونے یوسف تھا..

انسانی خصلت میں شامل ہے کہ بے شک ایک اور انسان اسے تقریباً مار ڈالنے کا باعث بنا ہو لیکن وہ اس کو دوبارہ ملنا چاہتا ہے.. چنانچہ ہم نے بھی ایک بار سکردو میں اس کا کھوج لگانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ دو برطانوی کوہ پیماؤں کو سنو لیک پر لے گیا تھا جہاں ایک کوہ پیما ایک دراڑ میں گر کر ہلاک ہو گیا تھا اور اس کی لاش کو سنو لیک پر چھوڑ کر یوسف سکردو واپس آ گیا تھا.. اور ان دنوں وہی کوہ پیما یوسف کے خوابوں میں آتا تھا اور کہتا تھا... تم نے مروا دیا.. چنانچہ دو دن سے یوسف خوف کے مارے بخار زدہ تھا اور وہ بستر میں پڑا تھا..

ہوشے میں معلوم ہوا کہ یوسف دراصل سکردو کے ہسپتال میں چوکیدار ہے اور وہاں کے ایک ڈاکٹر صاحب نے لاہور سے آنے والے تین نوجوانوں کو اس کے ہمراہ کر دیا تھا کہ وہ

انہیں مشابرم بیس کیمپ تک لے جائے۔۔

یوسف اور وہ تین مبتدی کوہ نورد مشابرم کے بیس کیمپ سے واپس آ کر اب اشرف کے سوکی ڈائننگ روم میں آنکھیں جھپکتے تھے اور سب کے سب باریش تھے اور یہیں پر ان سے ملاقات ہوئی۔۔

سب سے پہلے تو میں نے اور سلمان نے ان تین نوجوانوں کو مبارکباد دی کہ وہ یوسف کی رہنمائی کے باوجود زندہ سلامت لوٹ آئے ہیں اور پھر یوسف سے چہلیں شروع ہو گئیں۔۔

"یوسف۔" سلمان نے سنولیک سٹائل میں ڈراما کر کے کہا۔ "اوئے یوسف۔"

"جی صاحب۔" وہ ہمیں دیکھ کر اگرچہ خوش بھی ہوا تھا لیکن کچھ شرمندہ سا بھی نظر آتا تھا۔۔

"یوسف تم تو چاول بھی نہیں اُبال سکتے تھے اور پھر بھی کک تھے اور شملا سے آگے بھی نہیں گئے تھے اور پھر بھی گائیڈ تھے۔۔ تو کیا اب بیافو ہسپر کراس کیا ہے ہمارے بعد؟"

"بیافو ہسپر تو میں نے چھ سات بار کراس کیا ہے صاحب۔" یوسف اپنی اناڑی ٹیم کے سامنے اپنی عزت نفس کا دفاع کرنا چاہتا تھا۔ "بہت مرتبہ کیا ہے۔"

سلمان، یوسف کے پول کھولنے پر تلا ہوا تھا۔ "اور جب کیا ہے تو کتنے کوہ نوردوں کو دراڑوں میں دھکیلا ہے یوسف۔۔ یاد ہے تم تارڑ صاحب کو ایک بلندی پر سہارا دے کر لے جا رہے تھے اور پھسل گئے تھے اور تم نے جواباً تارڑ صاحب کو جھٹکا مار لیا تھا اور ان کو بھی لے ڈوبے تھے۔"

"نہیں صاحب۔" وہ بغلیں جھانکنے لگا۔۔

"جھوٹ مت بولو یوسف۔۔" سلمان ہنسنے لگا۔۔

"نہیں نہیں۔۔ وہ تو گرنے لگا تھا تو صاحب کو پکڑ لیا تھا۔"

"اور یوسف تم نے دوسرا شادی بنایا؟"

یوسف نے رب کا شکر کیا کہ موضوع بدلا ہے۔ "ہاں صاحب۔۔ بنایا ہے۔"

سنولیک کے دوران یوسف دوسری شادی کے لیے پر تول رہا تھا لیکن عباس کی موجودگی میں یہ تول دل ہی دل میں رکھتا تھا کیونکہ وہ اس کا سسر تھا۔۔

اس کی داڑھی کے بہت سے بال سفید ہو چکے تھے لیکن وہ اب بھی سگریٹ کو ایک کش

میں آدھا کر دیتا تھا۔۔

ان نوخیز کوہ نوردوں نے بتایا کہ مشابرم کا بیس کیمپ دیکھنا اتنا دل پذیر تھا اور راستے میں جو دو چار سخت مقام آئے وہاں پر یوسف انہیں دلاسا دیتا تھا کہ ہم تو تارڑ صاحب کو بھی دنیا کے حسین ترین برفانی راستے کے پار لے گیا تھا۔ یہ تو بچوں کا کھیل ہے۔۔ بہرحال یوسف جیسا بھی تھا، ایک ہمدرد بھی تھا اور مجھے اور سلمان کو جو سنولیک کے دوران تھے، اسے دوبارہ دیکھ کر پرانی رفاقت کا ایک خوشگوار احساس ہوا تھا۔۔

اسی سوکی ڈائننگ روم میں ایک سخت اور مشفق چہرے والا باریش بوڑھا عجیب نظروں سے مجھے دیکھے چلا جا رہا تھا۔۔ پھر وہ اپنی نشست سے اٹھا اور کہنے لگا۔ "صاحب آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔"

"نہیں۔۔"

جیسے ایک مزدور کی شکل ایک ہی سانچے میں ڈھلی عام سی ہوتی ہے، اسی طور بیشتر پورٹر بھی کوئی خاص انفرادیت نہیں رکھتے۔۔ وقت سے پہلے بوڑھے ہوتے ہوئے مشقت کی جھریوں سے بھرے چہرے۔۔ دو چار دانت گرے ہوئے۔۔ کندھے جھکے ہوئے اور آنکھوں میں غربت کی دھندلاہٹ۔۔

"جب آپ اُدھر ہوشے میں پہنچے تو اوپر جانے کے لیے۔۔ تو میں نے تب بھی آپ کو پہچان کر سلام کیا تھا۔ میرا نام یحییٰ ہے سر۔"

"یحییٰ؟"

"جی صاحب۔ آپ۔۔ دس برس پہلے کی بات ہے آپ اس سیزن میں کنکورڈیا گئے تھے۔۔ جب بہت کم پاکستانی اُدھر کو جاتا تھا۔ آپ کا کک غلام محمد تھا۔۔ جسے ذرا ادھر بخار ہو گیا تھا۔۔ اور آپ کو آدمی کا تھیلا چھوڑا اٹھائے آیا تھا اور آپ کو بھی چھوڑ کر اسی میں چلا گیا تھا۔"

"بالکل صحیح۔۔"

"تو میں آپ کا پورٹر تھا سر۔۔ آپ کے ساتھ گیا تھا۔۔"

اس کا چہرہ شناسا سا لگنے لگا۔ لیکن اس چہرے پر دس برس کی مشقت اور مزدوری کا بوجھ تھا۔ تنگدستی کی جھریاں اور روزی کے حصول کی دربدری کی دھول تھی۔۔ وہ شخص اس لیے شناسا لگنے لگا کہ اس نے خود بتایا تھا کہ وہ کنکورڈیا تک میرے ساتھ گیا تھا ورنہ میں اب بھی اسے پہچان

نہیں پا رہا تھا۔۔

اسی مونسٹولیک کے سفر کے دوران اشکولے سے چلتے ہوئے وحید پور بھی میرے سامنے آ گیا تھا۔ اسے میں نے پہچان لیا تھا کہ وہ کے ٹو کہانی کے دوران مسلسل میرے ساتھ رہا تھا اور مددگار رہا تھا۔۔

شمال بہت بڑا ہے اور بہت مختصر بھی۔ اتنا مختصر کہ گئے برسوں کے چہرے کہیں نہ کہیں سامنے آ جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "صاحب آپ نے مجھے پہچانا؟"

اشرف کی کیمپنگ سائٹ کے پچ تک کے باہر ہوشے کی گلی میں حوالدار کی جیپ پر ہمارے رک سیک اور دیگر سامان لوڈ ہو رہا تھا۔۔

ہمیں اصولی طور پر تو آج کی شب ہنستے ہوشے میں قیام کرنا چاہیے تھا۔ لیکن ٹیم کے ہر فرد کو اب کوئی نہ کوئی ایمرجنسی والا کام یاد آ رہا تھا جو اس نے فوری طور پر لاہور پہنچ کر ہی سرانجام دینا تھا۔ ایسے انتہائی اہم کام ہمیشہ کوہ نوردی سے واپسی کے آخری دن ہی یاد آتے ہیں۔ سلمان نے ہسپتال میں کہا تھا کہ اس کا بھائی امریکہ جا رہا ہے اور اسے لاہور ایئرپورٹ پر خدا حافظ کہنا بے حد ضروری تھا ورنہ بھائیوں میں دراڑ پڑ سکتی تھی۔ میاں صاحب اپنی بیگم کی صحت کے بارے میں فکرمند تھے۔ حسن صاحب اپنی بیگم کے لیے فکرمند نہیں بلکہ اداس ہو گئے تھے اور وہ خوبانی چہرے والی بلتی خاتون کو یکسر بھول گئے تھے۔ بدر بٹی کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ڈاکٹر بھی ہے اور جوٹیال ذریں کے کلینک میں داخل چند مریض جانے کس حال میں ہیں۔ عمر کو بھی کوئی بزنس میٹنگ یاد آ گئی تھی۔ شاہد صاحب کو بھی یقیناً کچھ یاد آ رہا تھا لیکن وہ اقرار نہ کرتے تھے۔۔

اور مجھے... مجھے گھر یاد آ رہا تھا... پورے کا پورا... یہاں تک کہ فوارے کے کائی زدہ پانیوں میں بڑے گھروں والا وہ بوڑھا مینڈک بھی یاد آ رہا تھا جو ساری رات ٹرا ٹرا کر کے میری نیند برباد کرتا تھا۔ اپنے بچوں کے دمکتے روشن چہرے یاد آ رہے تھے جو پہاڑوں کی جانب سے واپسی پر مجھے دیکھ کر مزید دمکتے تھے، مزید روشن اور سونے ہوتے تھے... وہ اگرچہ اب اتنے بچے بھی نہ تھے اور مجھ سے قد میں نکلتے تھے لیکن اس کے باوجود مجھے دیکھ کر وہ بچے ہو جاتے تھے... میرے گرد اچھلتے کودتے نعرے لگاتے تھے کہ ابو آ گئے... ابو آ گئے... اور تو اور میری واپسی پر میمونہ کے چہرے پر بھی زندگی میں ایک دشوار ہونے والی مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی۔۔۔

چنانچہ ہم ہوشے میں ٹھہرنا نہیں چاہتے تھے... یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے اور کسی نہ

کسی طور آج شب چلاس پہنچ جانا چاہتے تھے۔۔۔

بڑے ذہین ذوق کے مالک حوالدار کی پرانی جیپ انتہائی دوپہر میں ہوشے کی گلیوں میں سے نکل کر یکدم اترائی پر آئی ہیں بے قابو ہوتے ہوئے محسوس ہوئی لیکن حوالدار کنٹرول میں تھا کیونکہ وہ صرف آج بار دو پھیرے کے حساب سے کاندے سے ہوشے اور ہوشے سے واپس کاندے کے گیارہ چکر لگا چکا تھا... یہ اس کا بارھواں پھیرا تھا۔ اس راستے کو وہ اپنی ہتھیلی کی لکیروں کی طرح جانتا تھا اور آنکھیں بند کر کے بھی اس پر جیپ چلا سکتا تھا... اور دراصل وہ آنکھیں بند کر کے ہی اس راستے پر جیپ چلاتا تھا... کیونکہ وہ [illegible] کرتا تھا... مجھ سے ایک خاص لاتعلقی سے باتیں کرتا جاتا تھا۔ آئی پی کی چند کیسٹ کو دیکھتے ہوئے خود سے باتیں کرتا جاتا تھا اور سٹیرنگ گھماتا جاتا تھا۔ اتنے وسیع تجربے کے بعد اس کی آنکھیں دراصل سٹیرنگ میں منتقل ہو چکی تھیں۔۔۔

اترائی کے خاتمے پر وہ پل آیا جہاں سے ہوشے کا علاقہ ختم ہوتا تھا اور کاندے والوں کی دشمنی شروع ہو جاتی تھی۔۔۔

کاندے تک تو پہنچنے کا بندوبست ہو گیا تھا تو اب وہاں سے آگے چلاس تک کسی جیپ کے مل جانے کی تشویش شروع ہو گئی۔۔۔

"صاحب آپ چکر لگا آیا؟" حوالدار نے اسی لاتعلقی سے پوچھا۔۔

"ہاں..."

"کدھر تک گیا؟"

"گونڈوگورو کے بیس کیمپ تک۔۔"

"اچھا... اس کا مطلب گونڈوگورو لا... پیدل گیا ہے؟"

"تو اور کیا حوالدار صاحب۔ ادھر جیپ تو نہیں جاتا۔"

"بہت ہمت کیا ہے صاحب اس عمر میں۔"

"آپ تو ادھر گیا ہوگا؟"

"نہیں سر... ہم ہوشے والے ادھر نہیں گئے سوچیو۔۔"

"کیوں؟" میں اس کی ٹھیٹھ پنجابی پر ٹھٹھک گیا۔ پھر یاد آیا کہ ابھرتے ہوئے اس نے بتایا تھا کہ اس کی ملازمت کا ایک بڑا حصہ پنجاب میں گزرا ہے۔ "کیوں نہیں گئے حوالدار جی؟"

"سر! یہ کوئی دماغ خراب ہے..." وہ ہنسنے لگا۔۔

"ان کے سارے خاندان کا دماغ خراب ہے حوالدار جی؟"

"ہاں جی!" اس نے سر ہلایا اور پھر ذرا ہنسنے لگا۔ "پنجاب چھوڑ کر ادھر آ گئے ہیں تو دماغ خراب ہے ناں وہ جی!"

روڈ ختم ہو رہی تھی۔

بائیں جانب سامنے دور۔۔۔ دور نالے کے پار جو چٹانیں تھیں۔۔۔ وہ عجیب رنگ والی تھیں۔ ان کے اندر عجیب سرخی سی دھاریاں نظر آتی تھیں جن پر سفید پانیوں کی خاموش آبشاریں اتر رہی تھیں۔۔

چترال اب قریب ہوا..

ہم نے بدن کو اپنی ہمت سے بہت پرے تک جھکایا تھا۔ کل صبح سے رات تک ایک دن میں دو منزلیں طے کی تھیں اور آج بھی مارا مار کرتے پہنچے جا رہے تھے۔۔ مجھے جیپ کے آس پاس جو منظر گزرتے جاتے تھے ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور میں نے جو کچھ دیکھنا تھا دیکھ لیا تھا۔۔ یہ میرا خیال تھا کہ میں نے جو کچھ دیکھنا تھا دیکھ لیا ہے۔۔ ابھی چند لمحوں میں اس منظر نے نمودار ہونا تھا جو اب تک دیکھے گئے تمام منظروں پر بھاری ہونے والا تھا۔۔ چند لمحوں میں۔۔

کہیں بائیں جانب کے نالے کے سیلاب زدہ کھیتوں کی ویران پتھریلی بستی نظر آنے لگی جو انہوں نے اس بے آب و گیاہ ویرانے میں آباد کی تھی۔۔ اور پھر جیپ کی کھڑکی میں سے بستی کے عقب میں ایک بلند... بے رنگ سی چٹان بلند ہونے لگی۔۔

"چٹان پر ایک لڑکی... اب وہاں نہیں تھی"

چٹان پر ایک لڑکی..

چٹان بلند ہوتی جا رہی ہے اور اب چوٹی پر پہنچی ہے تو وہاں ایک لڑکی..

چٹان کی چوٹی پر ایک لڑکی... ہاں!

اور چٹان... جیسے جیسے جیپ حرکت کرتی تھی ویسے وہ بھی حرکت کرتی جاتی تھی اور اس پر براجمان لڑکی بھی حرکت کرتی جاتی تھی۔ جیسے میں ایک تیز رفتار گاڑی میں بیٹھا اس کے قریب سے گزر رہا ہوں..

چٹان پر اطمینان سے بیٹھی لڑکی سرخ لباس میں تھی۔

وہ ایک حسن پری کی مانند پالتی مارے آنکھیں میچے بیٹھی تھی..

کالاش کی "لال مریم" اپنی چٹان پر شہزادی بن کر بیٹھی تھی کہ اس کی بستی میں پانی نہ تھا اور وہ دور بیٹھے دریائے چترال کے پانیوں کو حسرت سے تک رہی تھی اور صرف انہیں دیکھنے کے لیے اتنی بلندی پر... اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر آ بیٹھی تھی..

یا شاید... وہ کسی کی منتظر تھی!

اس کا چہرہ اگر میری جانب ہوتا تو میں اس پر لکھی عبارت پڑھ لیتا اور جان جاتا کہ وہ کس کی منتظر ہے اور کتنے برسوں سے منتظر ہے کہ ہر چہرے پر اپنے عشق خاص کے انتظار کی تحریریں ہوتی ہیں... وہ پڑھی جا سکتی ہیں اور اگر انتظار طویل ہو جائے تو یہ تحریریں جھریوں میں بدل جاتی ہیں..

چٹان پر بیٹھی لڑکی ایک بجلی کا پیغام ہے فلم بند کیے جانے والے منظر کی مانند تیزی سے

”میں کیا جانوں میں کون ہوں.. دروازہ کھولو“

اور تب ایک عجیب سی وحشت مجھے گرفت میں لے لیتی ہے..

میں نے آج تک.. پچھلے تیس برسوں میں شمال کے جتنے بھی سفر کیے تھے.. اپنی سالانہ کوہ نوردی سے جب بھی گھر لوٹا تھا تو گھر میں... بیشتر میرے تینوں بچے میرے منتظر ہوتے تھے.. میں پتھروں اور برفوں کا مارا ہوا مرجھایا ہوا ان کے چہرے دیکھ کر کھل جاتا تھا.. میرے تن بدن میں موسم کے اور بغیر موسم کے جتنے بھی پھول شگفتہ ہو سکتے ہیں وہ سب کے سب انہیں دیکھ کر کھل جاتے تھے.. کبھی بادِ شمال انہیں مہک دیتا تھا.. کہیں نرگس اور فریزیا.. کہیں پڑ پڑیا اور کہیں گیندے کے زرد پھول.. سب کے سب یکبارگی کھل جاتے تھے..

لیکن جی ٹی روڈ پر اُترتے ہی ٹریفک کی بھیڑ میں جب ہماری ویگن داخل ہوئی تو مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا.. یہ احساس ایک دھماکے کی طرح پھٹا کہ اس برس تو وہ وہاں نہیں ہیں۔

سلجوق نہیں ہے.. فارن سروس میں ہے.. پاکستان کونسلیٹ جدہ میں وائس قونصل کے عہدے پر اپنے سفارتی فرائض سرانجام دے رہا ہے.. عینی.. قرۃ العین.. نہیں ہے.. کنگ ایڈورڈ کالج سے متعدد گولڈ میڈل حاصل کر کے.. اب باقاعدہ ڈاکٹر ہو چکی ہے.. شادی شدہ ہو چکی ہے اور پاکستان میں نہیں ہے.. فلوریڈا کے شہر آرلینڈو میں اپنے خاوند کے ساتھ خوش و خرم ہے..

یہ پرندے تو اُڑ چکے ہیں..

گھونسلا تقریباً ویران ہو چکا ہے..

وہ دن گئے جب وہ اپنی چونچیں کھولے میرا انتظار کرتے تھے..

صرف سمیر ہے اور وہ بھی اُڑنے کی تیاری کر رہا ہے.. سول سروس اکیڈمی میں ایک

زیرِ تربیت ڈسٹرکٹ ہے.. اس کی پوسٹنگ جانے کہاں ہوتی ہے.. میں ابھی تک اس خیال سے غافل رہا تھا..

اور اب.. موٹروے سے اُتر کر کالا شاہ کاکو میں داخل ہوتے ہوئے ٹریفک کی بے پناہ بھیڑ میں داخل ہوتے ہوئے مجھے بجلی کی طرح یہ خیال آیا کہ پرندے تو گھونسلا چھوڑ چکے ہیں... ایک شدید ڈیپریشن نے مجھے شکار کر لیا.. جس اب ویگن میں آ پہنچا تھا..

حکیم بے چین تھا کہ کب یہ صاحب بھی اُتریں اور میں اپنے گھر جاؤں..

فردوس مارکیٹ.. گلبرگ نمبر تین.. یہ گھر ہے..

ویگن میرے گھر کے سامنے رُک گئی.. میں نے اپنا سامان.. رک سیک.. اتارا.. موتیا رنگ کا آہنی گیٹ بند تھا جسے میں نے دھکیلا تو اندر خاموشی تھی..

کوئی بھی نہیں تھا..

ہاں پورچ کے اوپر وہ بیل تھی جو ان دنوں میں پورچ کے اوپر بندھی رسیوں پر پھیلتی انہیں اپنی گرفت میں لیتی دن رات بے تحاشا بڑھتی جاتی تھی.. اور وہ شدت سے ایسا ہوتا چلا آیا تھا کہ جب میں کوہ نوردی کے لیے گھر سے نکلتا تھا تو اس بیل کے گچھے اور سرسبز ہونے کے دن ہوتے تھے.. پھر بارش کے بعد یہ راتوں رات بڑی گھنی ہو جاتی تھی اور پورچ کے فرش پر دھوپ کم سے کم ہوتی سائے میں بدل جاتی تھی.. اور پھر ہمیشہ یہ بھی ایسا ہوتا تھا کہ میں گھر لوٹتا تھا تو جس بیل کو میں سبز پتوں کی رسیوں میں لپٹا چھوڑ کر گیا تھا اب اس میں سے تیز گلابی رنگ کے پھولوں کی لڑیاں لٹکتی تھیں.. پھولوں کی لڑیاں جن کا پتوں میں سے نکلنے کا انداز چینی لالٹینوں کی طرح تھا.. اتنی کے پھولوں کی مانند تھا.. صرف یہ کہ وہ زرد لالٹینیں تھیں اور یہ آتشی گلابی.. بیشا!

ان لڑیوں میں سے گرتے چھوٹے چھوٹے گلابی شگوفے پورچ کے سرخ فرش پر پڑے ہوئے تھے.. کار کی چھت پر گرے ہوئے تھے..

سمیر بھی موجود نہ تھا.. اسے علم نہ تھا کہ میں شیڈول سے ایک روز پہلے پہنچ جاؤں گا اور وہ سول سروس اکیڈمی کے چند دوستوں کے ہمراہ کسی پکنک پر جا چکا تھا تو اندر خاموشی تھی.. پھولوں سے لدی بیل تھی.. گلابی لڑیاں لٹکی تھیں اور شگوفے گرتے تھے تسبیح کے دانوں کی طرح.. اور ان کی آواز نہیں تھی گرنے کی اس لیے اندر خاموشی تھی..

پنک شگوفے.. چھوٹے چھوٹے بجھے ہوئے.. پورچ کے فرش پر گرتے تھے..

ان میں سے کوئی ایک شگوفہ ہوشے کی کلیوں کا تھا..
کسی پریشانی چوکی شب رقص کرتی تھی..
کہیں دل سنگ پا کی برفیں اتنی سفید ہوتی تھیں کہ شگوفے کی گلابی رنگت بھی ہلکی ہوتی تھی.. کسی پر بسیاں کی پندرہ ہزار فٹ بلندی سانس لیتی تھی..
ہر شگوفے پر کوئی ایک مقام نقش تھا..
لیکن ایک ایسا مقام تھا جسے کوئی ایک شگوفہ سنبھال نہ سکتا تھا.. جابجا ایسے شگوفے بکھرے تھے جو اپنی رنگت کھو چکے تھے اور ان پر لیلے پیک کی سفیدی راج کرتی تھی..
للّٰی میر میڈ کا سرخ لباس ایک شگوفے پر بکھرا اس کے رنگ سے میچ کرتا تھا..
ان سب میں گارڈن لائٹ کے قدموں میں پڑا البتہ ایک شگوفہ ایسا تھا جس پر کوئی مقام تصویر نہ ہوتا تھا. صرف ایک سوالیہ نشان تھا جو سرگوشی کرتا تھا.. اگلے برس تم کہاں جاؤ گے؟.. کہاں جاؤ گے؟..
اگلے برس؟... کل کس نے دیکھا ہے.. ہاں اگر زندگی رہی، ہمت رہی تو کہیں نہ کہیں تو جاؤں گا.. شاید ہراموش کی وادی میں.. شاید ہتورہ گلیشیئر کے پار.. شاید ایک مرتبہ پھر رتّی گلی کی جھیلوں کو تلاش کرنے کے لیے.. اگر زندگی رہی اور ہمت رہی... اور اگر میرا رانجھا مجھ سے راضی رہا تو.. جاؤں گا!
میں نے اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کو انگلیوں کی پوروں سے محسوس کیا.. بوٹوں کو ایک نظر دیکھا کہ ابھی انہوں نے ایک برس کے لیے رک سیک کے کنج تنہائی میں چلے جانا تھا اور سفید دروازے سے لٹکے ہوئے شیر ببر کے مہاندرے والے ناکر کو اٹھا کر دستک دی..
"کون ہے؟" اندر سے میمونہ کی آواز آئی..
"میں ہوں.."
"میں کون؟"
"میں کیا جانوں، میں کون ہوں.. دروازہ کھولو۔"